''چہارسُو''

..... پانی سے لے کر مانجھی تک .....

غضنفر۔۔۔اردو ادبی دنیا کی ایک ہمہ جہت شخصیت جنہوں نے مختلف میدانِ صنف میں قدم رکھا اور سرخ رو ہو کر نکلے۔اب وہ ناول نویسی ہو یا افسانہ نگاری، شاعری ہو یا خاکہ نگاری یا پھر تنقید ادب ہو یا لسانیات، ہر جگہ وہ منفرد اور معتبر دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ عصر حاضر میں ان سے زیادہ فعال اور باوقار ادبی شخصیت موجود ہے۔ناول نویسی میں بھی وہ بلند مرتبہ پر فائز ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس صنف میں انہوں نے نئی روح پھونکی ہے اور اپنے ہم عصروں کو اس غائب ہوتی جارہی صنف کی جانب از سرِ نو متوجہ کیا ہے۔آج ناول نویسی مقبول ترین صنف ادب بن کر ابھری ہے تو اس میں ان کا بھی اہم اور بنیادی رول رہا ہے۔انہوں نے صفحات کے لحاظ سے ضخیم ناول نہیں لکھے لیکن معنوی طور پر ان کی انفرادیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ جس طرح انہیں زبان و بیان پر عبور حاصل ہے، تحریر میں سلاست، فصاحت اور بلاغت موجود ہیں اور جیسی وہ الفاظ کی جادوگری سے آشنا ہیں، کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ ان خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ناولوں کے حجم میں خاصا اضافہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ انہوں نے ناولوں کو بھی اپنے افسانوں کی طرح غیر ضروری تفصیلات سے بچانے کی فن کارانہ سعی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کا قاری صفحہ کی بجائے صفحات نہیں پلٹتا ہے اور ہر سطر سے لطف و حظ کشید کرتا ہے۔ڈاکٹر ریشما قمر مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نابغہء روزگار شخصیت کے تمام نو ناولوں "پانی سے لے کر مانجھی" تک کو ایک ہی کتاب میں یکجا کر دیا ہے اور ایک مفصل اور گراں قدر مقدمے سے بھی اس کے حسن کو سنوارا ہے۔شائقین ادب کے لیے یہ کسی گراں بہا تحفے سے کم نہیں۔اس تحفے سے نوازنے کے لیے میں ڈاکٹر ریشما قمر اور محترم غضنفر کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

..... راشد صدیقی

..... آدھی دنیا کا مکمل جہان .....

محبت کو انسانی پیکر عطا کیا جائے تو وہ یقیناً نسوانی پیکر ہوگا کہ بنات حوّا جن سے محبت کرتی ہیں اُن کی قوت بھی بنتی ہیں اور تربیت کر کے ان کو اس قابل بھی بناتی ہیں کہ وہ حوادث زمانہ کو شکست دے سکیں۔شمع اختر کاظمی صاحبہ نے اپنے شوہر سے محبت کی تو ان میں ارباب اختیار و اقتدار کی کلائی مروڑنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور اپنے بچوں سے محبت کی تو اُن کی نگہداشت اس طرح کی کہ اُن کی دنیا آباد ہوگئی۔وہ علمی قوت کی مالک اور انسانی معاشرہ کا حصہ ہیں۔ اس لیے ان کی محبت شوہر، بچوں اور افراد خاندان تک محدود نہیں۔قدرت کو بھی منظور نہیں کہ ان کی زندگی سینے پرونے اور آنٹا گودھنے میں گزر جائے اس لیے اس نے ان کو لفظ و معنی کے رشتوں کو استوار کرنے اور احساسات کو لفظوں سمانے کا ہنر عطا کیا ہے۔ان کی دو کتابیں ''آدھی دنیا'' ۲۰۱۰ء اور ''سورج سوا نیزے پر'' ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی کتاب ''آدھی دنیا کا مکمل جہان'' کم و بیش ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔تاریخی نوعیت کی اس کتاب میں خواتین تخلیق کاروں کا تعارف تو ہے ہی ان کے پسندیدہ موضوعات اور ان علاقوں کا بھی تعارف ہے جہاں وہ بود و باش کیے ہوئے ہیں۔

ہر تخلیق کار سے الگ الگ سوال پوچھنا اور ہر پسندیدہ موضوعات کے ان علاقے کا تعارف کرانے میں بخل کا ارتکاب کرتی ہیں۔اس حیثیت سے دیکھئے تو شمع صاحبہ نے تاریخ مرتب کی ہے۔یوں بھی ان کی یہ کتاب تاریخ کا ماخذ بنے گی کہ آئندہ کسی قلم کار خاتون کے علمی ادبی کام سے کسی کو دلچسپی ہوگی تو وہ شمع صاحبہ کی ہی کتاب کا نقاب الٹے گا۔

یوں تو اردو میں کوئی بھی صنف ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاتون تخلیق کار کا نام نمایاں نہ ہو مگر شاعری، افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری میں وہ زیادہ نمایاں ہیں۔یہ اور ات ہے کہ مرد اساس ادبی حلقے میں ان کے ادبی کاموں کا اعتراف بہت کم ہوا ہے۔مردوں کی بھی مجبوری ہے وہ خاتون تخلیق کاروں کے گن گنوائیں تو بدنظر کہلائیں، نہ گنوائیں تو تنگ نظر سمجھے جائیں۔شمع اختر کاظمی صاحبہ مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے شکوہ شکایت کرنے یا جلی کٹی سنانے کے بجائے خاتون تخلیق کاروں کے حالات لکھ کر فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔اب ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ریگزار ادب کو گلزار بنانے والے نے شور سلاسل کے ساتھ شورِ پازیب کو بھی اہمیت دی ہے۔

..... شمیم طارق

اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت: -/۵۰۰ روپے، دستیابی: کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۱،شمارہ:ستمبر،اکتوبر ۲۰۲۲ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِسالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ:537/D-1، گلی نمبر18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:8730433-8730633-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

۔ متاعِ چہارسو ۔

سرِ ورق، پسِ ورق ------ شعیب حیدر زیدی
تزئین ---------------- عظمیٰ رشید
کمپوزنگ -------------- محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

گمان کی زد میں ---------- محمد انعام الحق ۶
اردو کا خوش پوش ناقد (خاکہ) ------ ابن کنول ۷
براہِ راست -------------- گلزار جاوید ۱۰
بصارتوں کی کمند ------------ فاری شا ۲۲
میرے عتیق اللہ ------------ خالد جاوید ۲۶
شعری سفر کی ثقافتی جہتیں ----- انتخاب حمید خان ۳۱
قلم سے پھوٹتی کرنیں ---------- پروین شیر ۳۷
عتیق اللہ شناسی ------------ عمر فرحت ۴۰
نئی غزل کا ایک نام ----------- معید رشیدی ۴۹
خواب برقرار ہے ------------ عطیہ سکندر علی ۵۲
بین العلومی تنقید کے بنیاد ساز -------- عتیق اللہ ۵۶

حسنِ یقیں

ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی شاہد، خالد اقبال یاسر۔ ۶۲

افسانے

تاریخ کا پروفیسر ------------ عارف نقوی ۶۳
آسیب زدہ کوٹھی ------------ شہلا نقوی ۶۵
تھیلے میں کشمیر -------------- آغا گل ۶۶
مقدس شجر زار ------------ جمیل احمد عدیل ۶۸
خانہ پُری -------------- تابش خانزادہ ۷۳

نالۂ آہ فغاں

سید صادق حسین کاظمی، میکش امروہوی، ماہر اجمیری، اشرف جاوید، عبدالقادر تاباں، پاپولر میرٹھی، تبسم ملیح آبادی، غضنفر ہاشمی، نبیل احمد نبیل، اوصاف شیخ۔ ۷۴

افسانے

انتظار -------------- آصف عمران ۷۹
سسکتا رشتہ ------------ رئیس صدیقی ۸۲
ادھورہ جسم -------------- رعنا کوثر ۸۳
دہاڑ: ممتا کی ------------ حنیف سید ۸۵
یاترا ------------ ڈاکٹر صوفیہ شیریں ۸۸

گوشہ نشینی

نوید سروش، ڈاکٹر ریاض احمد، خالد رامے، تصور اقبال، نسیم شیخ، نادیہ گیلانی، حمیرا راحت، وشال کھُلر، اصغر شمیم، کنول ملک، محبوب اصغر، ذکی طارق بارہ بنکوی، فرح کامران، سبھاش گپتا شفیق، سیدہ نسرین نقاش۔ ۹۰

ناول

خاکِ شفا ------------ پیرزادہ آلِ انوار ۹۵

دنیا میرے آگے

کرن ڈیسائی سے مکالمہ ------ ڈاکٹر احمد سہیل ۱۰۲

عظمتوں کا حوالہ

سید ابرار کاشف، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، نائلہ حبیب، فیصل عظیم، قمر عباس علوی، کامران غنی صبا، ساگر تر پاٹھی، بشارت حسین وقار، نیلما ناہید درانی، سمیرا سلیم کاجل۔ ۱۰۴

نشانِ راہ

رومی کے تاعمر شاگرد ---------- حسن منظر ۱۰۹
ہر تماشے سے دور رہتا ہوں ------ فیصل عظیم ۱۱۱

آئینۂ فن

یہ قصہ کیا ہے معنی کا --------- جمیل احمد عدیل ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

شمشاد بیگم ------------ دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین --------- وجیہہ الوقار ۱۱۸

قرطاسِ اعزاز
پروفیسر عتیق اللہ
کے نام

''گمان کی زد میں''

محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

نام: سید عتیق اللہ تابش
پیدائش: ۲۔جولائی ۱۹۴۲ء
تعلیم: ایم۔اے انگلش، وکرم یونیورسٹی اُجین ۱۹۶۹ء
ایم۔اے اردو، وکرم یونیورسٹی اُجین ۱۹۷۱ء
پی۔ایچ۔ڈی (جدیدیت اور اردو نظم) اورنگ آباد ۱۹۷۶ء

فیلوشپ:
پوسٹ ڈائریکٹریل سینئر فیلوشپ از یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ۱۹۷۶ء
وسیع تحقیقی منصوبہ از یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ۲۰۰۹ء
ایمریٹس فیلوشپ از یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ۲۰۰۵ء

معلّمی:
لیکچرار اردو، مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۶ء
لیکچرار اردو، دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۴ء
ریڈر اردو ڈیپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۸ء
پروفیسر آف اردو، اردو ڈیپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی ۱۹۹۴ء تا ۲۰۰۵ء
وزیٹنگ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی ۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۷ء

تخلیقات:
۱۔ ایک سو غزلیات کا انتخاب۔۔۔ پیکار پبلی کیشن حیدر آباد ۱۹۷۱ء
۲۔ قدر شناسی، تنقیدی مضامین کا انتخاب، مجلس اردو ۱۹۷۸ء
۳۔ تیشا ٹوپ (حیات اور جہات برائے آزادی) ترجمہ این۔بی۔ٹی، نیو دہلی ۱۹۸۰ء
۴۔ تنقید کا نیا محاورا اردو تنقیدی مضامین کا انتخاب، مجلسِ اردو ۱۹۸۲ء
۵۔ دہلی میں اردو نظم آزادی کے بعد، پیش لفظ اور یکجائی، دہلی اکادمی ۱۹۹۱ء
۶۔ بین کرتا ہوا شہر، نظموں اور غزلوں کا انتخاب، مجلس اردو ۱۹۹۱ء
۷۔ آبادی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، انگریزی سے اردو میں ترجمہ، الف تا ب تین جلدوں میں زیر اشاعت
۸۔ پیچھے کوئی ہے، (مکمل لمبائی کا حامل دو بابی ڈرامہ) مجلس اردو ۲۰۰۱ء
۹۔ ترجیحات، چھبیس تنقیدی مضامین پر مشتمل مضامین اور محاکمہ، ایم۔آر پبلی کیشن، دہلی۔ ۲۰۰۴ء
۱۰۔ خواتین اردو ادب (فیمنزم اور تنقید) ۲۰۰۲ء
۱۱۔ تعصّبات، بیس مضامین کا انتخاب۔ایم۔آر پبلی کیشن، دہلی ۲۰۰۴ء
۱۲۔ محمد حسین آزاد (آزاد کا تنقیدی جائزہ) اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۸ء
۱۳۔ بنیات، ایک تنقیدی مضامین کا تنقیدی محاکمہ، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۱ء
۱۴۔ پروین شیر (عہدِ نا تمامی کی شاعرہ) کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۱ء
۱۵۔ عبارات (غزلوں کا انتخاب) کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۲ء
۱۶۔ تنقید کی جمالیات (دس جلدیں) ۲۰۱۳ء
۱۷۔ شاد عظیم آبادی ۲۰۲۱ء
۱۸۔ نگاہ شناسِ سخن اور پروین شیر ۲۰۲۲ء

تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔چوتھا زیر اشاعت ہے
علاوہ ازیں ایک ڈرامے کا مجموعہ بہ عنوان ''پیچھے کوئی ہے'' بھی زیر اشاعت ہے۔

اعزازات:
۱۔ پروفیسر آف ایمرٹس، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔دہلی
۲۔ وزیٹنگ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ ۲۰۰۶ء
۳۔ قدر شناسی، اُتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۷۸ء
۴۔ تنقید کا نیا محاورا، قدر شناسی، بنگال اردو اکادمی ۱۹۸۲ء
۵۔ قدر شناسی برائے بین کرتا ہوا شہر، اُتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۹۲ء
۶۔ قدر شناسی ادبی اصطلاحات کی وضاحت، دہلی اردو اکادمی ۱۹۹۵ء
۷۔ پُر وقار ادبی اعزاز، مدھیہ پردیش حکومت ۲۰۰۲ء
۸۔ اعزاز برائے قابل فخر نقاد اور دانشور از دہلی اردو اکادمی ۲۰۰۳ء
۹۔ اعزاز برائے ''پیچھے کوئی ہے'' از راجستھان اردو اکادمی ۲۰۰۲ء
۱۰۔ اعزاز برائے ''سخن شناسی'' از غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۲۰۱۲ء
۱۱۔ اقبال سمّان، از مدھیہ پردیش حکومت ۲۰۱۹ء
۱۲۔ دتاتریہ کیفی اعزاز، دہلی اردو اکادمی ۲۰۱۹ء

۔ کانچ کا پُل ۔

۲۹۔مئی ۲۰۲۲ء کو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے ہنوئی، ویتنام کے کانچ سے بنے ۶۳۲ میٹر لمبے اور ۱۵۰ میٹر چوڑے پُل کو عجائب کی دنیا میں متعارف کرایا ہے۔پُل کا فرش فرانس کے بنے کانچ سے تیار کیا گیا ہے جس پر بہ یک وقت ۴۵۰ افراد سفر کر سکتے ہیں۔اس سے قبل گوانگ ڈونگ چین میں ۵۲۶ میٹر لمبے پُل کا گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں سب سے بڑے کانچ کے پُل کے طور پر نام درج تھا۔

- خاکہ -

اردو کا خوش پوش ناقد

پروفیسر ابن کنول
(دہلی)

انیسویں صدی عیسوی میں جب اردو کو سرکاری حیثیت حاصل ہوئی تو اردو والے سڑک پر بھی سر اُٹھا کر چلنے لگے ورنہ اپنے گھر میں بھی سر جھکا کر رہتے تھے اس لیے کہ پڑھا لکھا اسی کو سمجھا جاتا تھا جو فارسی پڑھتا تھا اور فارسی اگلتا تھا۔ ہر بوالہوس فارسی بولنے کی کوشش سرکاری مراعات حاصل کرنے کے لیے کرتا تھا جس طرح آجکل اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ایسے لوگوں کے سامنے بعض لوگ انگریزی بولتے ہیں جو انگریزی نہیں سمجھ سکتے۔ سرکاری زبان بننے کا فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی حکومت میں اردو کے شاعر اور ادیب بھی اعلیٰ عہدوں تک پہنچ کر ''عشرت منزل'' میں رہنے لگے ورنہ عموماً اردو کے شاعر دہلی کے گلی کوچوں میں کرایے کے مکانوں میں انتقال کر گئے۔ لیکن چرخ ستمگار کو اردو اور اردو والوں کی خوشحالی اور خوش پوشی پسند نہیں آئی۔ اردو جو اپنی بدحالی کی وجہ سے اٹھارہویں صدی میں ریختہ یعنی گری پڑی زبان کہلاتی تھی اور اردو والے اپنے حلیے سے گرے پڑے لگتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں پھر وہی حال ہو گیا، سڑک پر یا محفلوں میں بدحال اور بے ہنگم شخص کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ اردو کا ادیب یا شاعر ہے۔ لیکن بعض لعل گودڑوں میں بھی دمکتے رہتے ہیں۔ ان میں ایک پروفیسر عتیق اللہ ہیں۔ جو اردو کے ادیب اور شاعر ہو کر اردو والے نہیں لگتے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ کو ہم اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ دہلی میں بے روزگار تھے اور دہلی کے چائے خانوں اور کافی ہاؤس میں اپنی علمیت اور ادبیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ہماری ان سے پہلی ملاقات دہلی کے ایک چائے خانہ ہی میں ہوئی۔ غالباً 1976 کی بات ہے، علی گڑھ میں ہمارے ایک دوست تھے، جب تک وہ علی گڑھ میں رہے اپنی ذہانت کا استعمال تعمیری کاموں میں کیا، لیکن تلاشِ روزگار میں جب دہلی آ گئے تو اور بھی بہت سے ہنر سیکھ لیے جو وقت ضرورت کام آتے ہیں۔ ان کا نام تھا شارق ادیب۔ جب تک علی گڑھ میں رہے واقعی اسم با مسمّٰی یعنی شارق ادیب ہی رہے۔ لیکن دہلی میں غمِ روزگار کی دلفریبی کے سبب ادب کی شارقیت ماند پڑ گئی۔

ہماری پہلی ملاقات ڈاکٹر عتیق اللہ سے شارق ادیب کے ساتھ ہی ہوئی، ہم علی گڑھ سے ریڈیو کے ایک پروگرام کے لیے دہلی آئے تھے۔ پروگرام زبیر رضوی کا تھا جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں کام کرتے تھے۔ شام کو جب ہماری ملاقات شارق ادیب سے ہوئی تو وہ ہمیں ضیافت کے لیے بلی ماران کی اس گلی قاسم جان میں لے گئے جہاں مرزا غالب کرایے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ شاید پریشان حالوں کو پناہ دینے کی روایت اس گلی کی کافی پرانی تھی۔ اسی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکیم عبدالحمید مرحوم نے ہمدرد طبیہ کالج قائم کیا تا کہ اس گلی میں مسلسل ہمدردی کا سلسلہ جاری رہے۔ ہمدرد کی عمارت میں ایک چائے خانہ تھا۔ عموماً غیر تعلیم یافتہ طبقہ غم روزگار سے تنگ آ کر شراب خانوں میں جاتا ہے اور تعلیم یافتہ حضرات چائے خانوں یا کافی ہاؤسوں میں غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ غم نہ شراب سے دور ہوتا ہے اور نہ چائے یا کافی سے۔

جب ہم شارق ادیب کے ساتھ چائے خانے میں پہنچے تو ایک دراز قد، سیاہ گھنے بالوں والا خوش لباس شخص ہاتھ میں سگریٹ لیے کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ قد کی درازی ہمارے لیے کمتری کے احساس کی وجہ بنی تھی، لیکن بالوں کی سیاہی اور خوش لباسی میں ہم بھی کمتر نہیں تھے۔ ہمارے موجودہ فارغ البال سر پر اس زمانے میں کچھ زیادہ ہی بال تھے۔ شارق ادیب نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ڈاکٹر عتیق اللہ تابش ہیں۔ نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ سن کر مرعوب ہونا فطری بات تھی، سو ہم بھی ہوئے۔ ویسے بھی وہ زمانہ ہمارا طالب علمی کا تھا۔ ڈاکٹر عتیق اللہ کی نقل و حرکت سے دانشوری ٹپک رہی تھی جو اس عمر کے ادیبوں اور شاعروں میں پیدا ہو جاتی ہے جس سے ڈاکٹر عتیق اللہ گزر رہے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں عتیق اللہ صاحب کی خوش لباسی اور خوش گفتاری نے متاثر کیا۔ پرانی دہلی جیسی تنگ گلیوں میں وہ بے داغ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے جن گلیوں سے گزر کر لوگوں کی زبان کیا ایمان بھی داغدار ہو جاتا ہے، اب ان گلیوں میں میر، غالب، ذوق یا داغ کی زبان یا لہجہ نہیں بلکہ کرخنداروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر عتیق اللہ کی اصطلاحاتی گفتگو مرزا غالب کی گلی کی آبرو کی حفاظت کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ہم مسلسل مرعوب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ کی خوش لباسی دیکھ کر یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ شخص تلاشِ معاش میں سرگرداں و پریشان ہے۔ شارق ادیب سے ڈاکٹر عتیق اللہ کی قربت کی ایک وجہ دونوں کی بے روزگاری بھی تھی۔ ایک اجین سے قسمت آزمانے آئے تھے اور دوسرے علی گڑھ سے۔ دہلی کی صدیوں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ دور دراز سے لوگ یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہاں لوگ کشتیاں جلا کر آتے ہیں یا آ کر جلا دیتے ہیں۔ اس وقت میں اردو کا طالب علم تھا۔ ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی، بس کچھ افسانے اور کچھ مضامین کچھ رسائل میں شائع ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ جانتے تھے۔ جب شارق ادیب نے ڈاکٹر عتیق اللہ کا مکمل تعارف کرایا، ان کی علمی و ادبی فتوحات کے بارے میں بتایا اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ابھی قسمت آزمائی کے دور سے گزر رہے ہیں تو مجھے اپنے مستقبل کی فکر ہوئی کہ جب ایسا دانشور اور ادیب مستقل روزگار کے لیے سرگرداں ہے تو ہمارے مستقبل کا تو اللہ ہی مالک ہے۔ ہماری تعلیم مکمل ہونے تک تو اردو اور اردو والوں کا اور برا حال ہو جائے گا۔ اس وقت تک ہمیں عتیق اللہ صاحب سے زیادہ واقفیت نہیں تھے، البتہ باتوں ہی باتوں میں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ یہ بھی براہ راست ترقی پسند نہ ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندوں سے قریب ہیں اور شاعر ہونے کے باوجود ان کی قربت افسانہ نگاروں سے زیادہ

ہے۔شاعر بہت اچھے ہیں،لیکن مشاعروں کے نہیں۔آج کل شاعر اسی کو سمجھا جاتا ہے جو مشاعروں میں جاتے ہیں اور مشاعروں میں بھی وہ شہرت پاتے ہیں جو ترنم سے اپنا یا کسی کا کلام پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ڈاکٹر عتیق اللہ اس صلاحیت سے محروم ہیں،جبکہ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

دہلی میں اس وقت ترقی پسندوں میں اہم نام پروفیسر قمر رئیس کا تھا۔ قمر صاحب بڑے مردم شناس یا ادیب شناس تھے۔ویسے تو خاتون شناسی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔نوجوان ادیبوں کو عموماً پہچان لیتے تھے کہ وہ ادب اور اس کے فروغ میں کب تک اور کہاں تک چلے گا بس ایک دو بار ہی ان کا اندازہ غلط نکلا اور وہ دھوکہ کھا گئے۔ڈاکٹر عتیق اللہ کی قمر صاحب سے قربت نے ہمیں حوصلہ بخشا اس لیے کہ ہم علی گڑھ میں رہنے کے باوجود بھی قمر رئیس صاحب سے قریب تھے۔ ہمیں قمر صاحب سے جوڑنے کے لیے پروفیسر قاضی عبدالستار اور والد مرحوم کنول ڈبائیوی پل کی حیثیت رکھتے تھے۔قاضی عبدالستار اور قمر رئیس میں برس پندرہ یا کہ سولہ کے سن کے زمانے سے دوستی تھی۔قمر صاحب فکشن کے ترقی پسند نقاد تھے۔ شاعری انھوں نے بھی کی تھی لیکن شاعر وہ بھی عہد جوانی کے یا ذاتی محفلوں کے تھے، لیکن نقاد مستند تھے۔خدا جانے بیشتر اردو کے ناقدین کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہو کر تنقید پر کیوں ختم ہوتی ہے۔احتشام حسین ہوں یا آل احمد سرور،کلیم الدین احمد ہوں یا شمس الرحمٰن فاروقی، بلکہ حالی ہوں یا شبلی۔سب ہی شاعری کرتے کرتے نامور نقاد بن گئے۔میرا خیال ہے عتیق اللہ صاحب نے بھی اسی روایت کو قائم رکھتے ہوئے شاعری کو دوسرا مقام دے کر تنقید کا دامن تھام لیا۔تنقید بھی افسانوی ادب کی کی۔میں سمجھتا ہوں یہ ان کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی اچھا ہی ہوا،ان کے لیے اس لیے کہ وہ شاعر تو اچھے ہیں،لیکن مشاعرے باز نہیں ہیں اس لیے انھیں بحیثیت شاعر کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور ہمارے لیے اس وجہ سے بہتر ہوا کہ تنقید میں انھوں نے افسانوی ادب پر خصوصی توجہ دی اور ہم اس امید پر ان سے تعلقات نبھاتے رہے کہ ایک نہ ایک دن تو ہمارا کوئی افسانہ انھیں لکھنے کے لیے مجبور کرے گا۔ہمدرد کالج کی ملاقات کو ہم نے کبھی فراموش بھی نہیں کیا۔تخلیق کاروں کے لیے لازمی ہے کہ ہر حال میں ناقدین سے تعلقات نبھاتے رہیں۔اگرچہ ہم قاضی عبدالستار کے شاگرد رہے جو بھری محفل میں ناقدین کی آبروریزی سے گریز نہیں کرتے تھے۔یہ اور بات ہے کہ ہر ناول پر ناقدین کی رائے کا انتظار بھی رہتا تھا۔عتیق اللہ صاحب کی قدر و قیمت ہماری نظر میں اس لیے بھی تھی کہ وہ آٹھویں دہائی میں آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں کے نقاد بن کر ابھرے۔

علی گڑھ جانے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عتیق اللہ کی وابستگی دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ہوگئی۔ہمارا بھی دہلی ہجرت کرنے کا ارادہ تھا۔ جب 1978 میں دہلی آئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عتیق اللہ جو دھواں اڑاتے ہوئے گلی قاسم جان کے ایک چائے خانہ میں ملے تھے اب تلاش معاش کی جدوجہد سے آزاد ہو گئے۔آخر قمر رئیس صاحب کی دوراندیشی اور دور بینی کو یہ خوف ہوا کہ یہ اجین کا باشندہ جس میں کالی داس کی سی ذہانت ہے کہیں حالات سے مجبور ہو کر گھر واپسی نہ کر لے،اس لیے دہلی میں ہی اس خوش شکل،خوش پوش اور خوش گفتار نوجوان کو کسی نہ کسی طرح رہنے کا پابند کیا جائے۔دراصل جس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ذمہ داریوں کا بوجھ پوری طرح سے قمر صاحب کے کاندھوں پر آ گیا تھا اس وقت انھیں تلاش رہی ایسے جانباز اور جاثار نوجوان ادیبوں کی جو تحریک کو دوبارہ تحریک دے سکیں۔ویسے تو قمر صاحب خود بھی جوان ہی تھے۔وہ پچہتر کے ہو کر بھی جوان رہے،ڈاکٹر عتیق اللہ نے تو عمر کی چار دہائیاں بھی پوری نہیں کی تھیں۔ویسے دیکھنے میں نوجوان تو وہ آج بھی نظر آتے ہیں۔میرے خیال میں اجین سے لے کر اورنگ آباد تک اور اورنگ آباد سے دہلی تک کسی نے آج تک ان کے سفید بال نہیں دیکھے،بالوں کی سیاہی ان کی جوانی یا نوجوانی کی گواہی دیتی ہے۔بالوں کی سیاہی کے علاوہ عمر کی آٹھ دہائی مکمل ہونے کے بعد بھی ان کا طرز زندگی مابعد جدید ہے۔ڈاکٹر عتیق اللہ کو اپنے بال اور ان کی سیاہ رنگت بے حد پسند ہے۔جب فریضۂ حج ادا کرنے گئے تو حج کے ایک رکن کی ادائیگی کے لیے نائی کو سر مونڈھنے کی نہ اجازت دی اور نہ زحمت۔خود ہی بادل نخواستہ عزیز از جان بالوں میں سے چند بال کاٹ کر فرض ادا کیا،اس طرح حج بھی ہو گیا اور بال بھی سلامت رہے۔خوبصورتی جو بالوں کی وجہ سے بھی ہوتی ہے باقی رہی۔ڈاکٹر عتیق اللہ کا جب دہلی یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو انھیں اردو سرٹی فکیٹ کورس کی کلاس بھی پڑھانے کو دی گئی،جس میں شامل نصاب کی کتاب میں ایک سبق مولانا ابوالکلام آزاد کا ''کامرانیوں کا راز'' تھا۔اس سبق میں مولانا نے لکھا تھا:

''میں دل کو مرنے نہیں دیتا،کوئی حالت ہو،کوئی جگہ ہو،اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی،میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگانی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں،یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی۔''

یہ سبق پڑھاتے پڑھاتے ڈاکٹر عتیق اللہ نے جینے کا ہنر سیکھ لیا۔وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شعبۂ اردو،دہلی یونیورسٹی میں رہ کر میں نے سکھانے سے زیادہ سیکھا ہے۔1978 میں جب میں بھی دہلی آ گیا تو اس دراز قد ادیب کی قد و قامت اور ادبی فتوحات کا راز کھلا۔دراصل ڈاکٹر عتیق اللہ کا تعلق اس سرزمین سے ہے جس میں امیر تیمور اور بابر جیسے فاتحین کے علاوہ امام بخاری،ابو عیسیٰ محمد ترمذی اور مرزا الغ بیگ جیسے محدث اور عالم پیدا ہوئے۔گزشتہ صدیوں میں سرحدوں پر اتنی قید و بند نہیں تھی،جواب ہے۔ڈاکٹر عتیق اللہ کے اجداد نے بھی خدا جانے کیوں وطن کو خیرباد کہا اور افغانستان کے جلال آباد میں آ کر بس گئے۔لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں پہلے سوات آئے اور پھر ہندوستان کا رخ کیا۔اچھا ہی ہوا ورنہ افغانستان یا سوات میں ڈاکٹر عتیق اللہ کی شاعری اور تنقید سمجھنے والا ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔کہتے ہیں کہ سوات کا علاقہ علم بشریات اور آثار قدیمہ کے لیے مشہور ہے۔گوتم بدھ کے زمانہ میں اس خطہ کو بہت اہمیت حاصل تھی۔آج بھی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے پاکستان کا سوئزرلینڈ کہا جاتا ہے۔سوات میں حسین

مرغزار اور شفاف پانی کے چشمے اور دریا بہتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر عتیق اللہ کو تو اجین کے کنارے بہتی ہوئی شپرا ندی میں صادق مولا کے ساتھ نہانا تھا۔بھرتری ہری اور کالی داس کی نگری میں ادب سیکھنا تھا۔کالی داس کی روایت کو آگے بڑھانا تھا۔کالی داس نے سنسکرت میں شاعری کی، ڈاکٹر عتیق اللہ نے اردو کو اختیار کیا۔کالی داس نے شکنتلا ڈرامہ لکھا، ڈاکٹر عتیق اللہ نے ''پیچھے کوئی ہے'' لکھ دیا۔اس لیے ان کے والد مرحوم نے سوات کے دلفریب نظاروں کو چھوڑ کر لاہور اور دہلی کو نظر انداز کر کے اجین کو آباد کیا، شاید مالوہ میں ان کا کوئی منتظر تھا۔نقل مکانی کی روایت ڈاکٹر عتیق اللہ کو وراثت میں ملی، جب ان کے بزرگ ایک مقام پر نہیں بیٹھے یا ٹھہرے تو وہ کیوں بیٹھتے۔لیکن اس نقل مکانی کا فائدہ بھی ہوا، دادا پردادا کو جلال آباد اور سوات میں شریک حیات ملیں۔والد نے مالوہ میں تلاش کر لیا اور ڈاکٹر عتیق اللہ نے شاہزادہ جان عالم کی طرح ملکہ انجمن آرا کی تلاش میں خلد آباد یعنی اورنگ آباد کا سفر اختیار کیا جبکہ ملکہ ماہ طلعت پہلے سے گھر میں رونق افراز تھیں، لیکن ان کی وہی خواہش تھی جو روم کے بادشاہ آزاد بخت کی تھی۔اور پھر بعد حاصل کرنے انجمن آرا کے انھوں نے دارالخلافہ دہلی کی جانب کوچ کیا، جو ہمارے لیے سودمند ثابت ہوا، نہ وہ دہلی آتے اور نہ ہم سے ملاقات ہوتی۔

ایک ہی شعبہ میں ہونے کی وجہ سے اب ڈاکٹر عتیق اللہ سے ملاقات کے لیے کسی شارق ادیب کی ضرورت نہیں تھی۔ڈاکٹر عتیق اللہ کا شمار اس وقت نوجوان اساتذہ میں تھا ویسے تو آج بھی انھوں نے خود کو ایسا سنبھال کر رکھا ہے کہ لوگ انھیں سینئر سٹیزن کہتے ہوئے جھجکتے ہیں۔شعبۂ اردو کے اس وقت کے اساتذہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے علاوہ پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر فضل الحق، پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر شمیم نکہت، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر شریف احمد، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر فرحت فاطمہ، ڈاکٹر عابدہ بیگم اور ڈاکٹر عبدالحئ شامل تھے۔بعد میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر صادق بھی آ گئے۔مذکورہ تمام اساتذہ اس لیے ڈاکٹر عتیق اللہ کی نہ صرف قدر کرتے تھے بلکہ گفتگو کرتے وقت زبان و بیان کا خیال بھی رکھتے کہ ان کی تحریر کے علاوہ گفتگو بھی نوطرز مرصع اور فسانۂ عجائب کے انداز کی ہوتی تھی۔دراصل ان کی پرورش ایسے گھر میں ہوئی جہاں فارسی، عربی اور اردو کے علاوہ پشتو بھی بول چال میں شریک ہوتی تھی۔ان کے والد خود تو مدرسے کے مولوی کے مظالم سے تنگ آ کر نوجوانی میں گھر بار چھوڑ کر نکل پڑے تھے، لیکن جب اپنے بیٹے کی تربیت کی نوبت آئی تو معصوم عتیق اللہ سید کو چھ برس کی عمر میں ہی فجر کی نماز میں مسجد میں تفسیر سنانے کے لیے لے جانے لگے۔عتیق اللہ صاحب والد کا احترام کرتے ہوئے مسجد سے تو فرار نہیں ہوتے لیکن زبان و بیان پر قدرت حاصل کرنے کے بعد مسجد میں کبھی تقریر کرنے نہیں گئے۔دراصل ڈاکٹر عتیق اللہ کی والدہ بھی درس و تدریس سے وابستہ تھیں، اس لیے وہ گھر کے علماء کے بیچ رہ کر کندن بن گئے اور اب صورت حال یہ ہے کہ ان کی تقریر و تحریر کی زبان غالب اور اقبال کے کلام کی طرح تشریح طلب ہو گئی ہے۔ممکن ہے اکیسویں صدی کے نصف آخر میں ''شرح تنقید عتیق اللہ'' شائع ہو جائے کیونکہ اس وقت تک ان کے مضامین کی زبان سمجھنے والے باقی نہیں رہیں گے، ویسے تو اب بھی کمیاب ہیں۔شعبۂ اردو میں بیشتر اساتذہ ڈاکٹر عتیق اللہ کی بعض دوسری وجوہات کی بنا پر بھی بہت قدر کرتے تھے۔دراصل اردو کے اساتذہ دیگر زبانوں اور علوم سے کم ہی واقفیت رکھتے ہیں بلکہ بعض تو اردو سے بھی کم ہی واقف ہوتے ہیں۔ڈاکٹر عتیق اللہ کو انگریزی اور علم ریاضی میں بھی مہارت حاصل ہے۔اس لیے انگریزی میں خط و کتابت کے علاوہ تنخواہ اور دیگر حساب کتاب کے معاملات میں بزرگ اساتذہ بھی ان کا تعاون حاصل کرتے تھے۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جوانی یا نوجوانی میں عموماً سب کے فن کو شاعری بھاتی ہے سو ڈاکٹر عتیق اللہ کو بھی نوجوانی سے پہلے ہی شاعری بھا گئی۔ابھی سولہ کا سن بھی پار نہ کیا تھا کہ شعر کہنے لگے۔دراصل ان کے گھر اور باہر، مرد اور خواتین سب ہی شعر گوئی کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ شعر گو بھی تھے۔اس لیے ان کی شعر گوئی کی طرف رغبت قابل گرفت نہیں تھی اور نہ قابل سزا۔جب ایسا ماحول خاندان ہی میں مل جائے تو پرواز بلند ہو ہی جاتی ہے، جس گھر کی خواتین شعر کہتی ہوں اس گھر کے مردوں کو کون روک یا ٹوک سکتا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی ''ایک سو غزلیں'' منظر عام پر آ گئیں، کبھی ''بین کرتے ہوئے شہر'' میں داخل ہو گئے۔ڈاکٹر عتیق اللہ نے شاعری میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کی ''عبارت'' اور ان کا ''تکلم'' معاصرین سے مختلف ہو گیا۔شاعری کے بعد جب تنقید کی ''قدر شناسی'' کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو ''تنقید کی جمالیات'' سے متاثر ہو کر ''تنقید کا نیا محاورہ'' لکھ ڈالا۔اپنے تنقیدی ''بیانات'' کو ''تعصّبات'' سے علاحدہ رکھ کر ''ترجیحات'' کو ترجیح دی۔والد کے ساتھ رہ کر نئی اصطلاحات اور تراکیب گڑھنے کا فن کیا سیکھا کہ ''ادبی اصطلاحات کی فرہنگ'' تیار کر دی۔

پروفیسر عتیق اللہ کے اجداد کا تعلق سمرقند و بخارا سے تھا سو انھوں نے احادیث اور فقہ کی تعلیم و تدریس پر توجہ دی۔ڈاکٹر عتیق اللہ اجین میں پیدا ہوئے، اس لیے انھوں نے کالی داس اور بھرتری ہری کی روایت کو آگے بڑھایا اور خوب بڑھایا۔ہماری ڈاکٹر عتیق اللہ سے براہ راست ملاقات اور تعلقات کو 45 سال گزر گئے وہ شعبہ سے سبکدوش ہو گئے اور ہم رخصت ہونے کے لیے تیار ہیں، لیکن رشتوں میں کبھی اسپیڈ بریکر بھی نہیں آیا۔رشتے کی جو ہماری ابتدا میں تھی آج بھی ہے۔دراصل وہ تعلقات میں عمر کے فرق کو حائل نہیں ہونے دیتے۔وہ پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ ان کے ہم عمر ہو جاتے ہیں اور نوجوانوں کے ساتھ اپنی عمر بھول جاتے ہیں۔شعبۂ اردو میں قمر صاحب کے بعد ڈاکٹر عتیق اللہ نوجوانی میں بلاتفریق مرد و زن مقبول تھے۔کلاس ختم ہونے کے بعد کبھی کینٹین میں اور کبھی گھاس کے میدان میں چائے بھی پیتے تھے اور خوش گپیاں بھی کرتے تھے۔یہ جوان عادتیں آج بھی ان میں موجود ہیں، اسی لیے وہ آج بھی خوش اسلوبی، خوش

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

افتخار عارف صاحب نے شاید اسی خاص موقع کے لیے کہا ہوگا:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

پروفیسر عتیق اللہ صاحب کی نسبت وثوق سے کہنا تو مشکل ہے مگر پروفیسر صاحب نے قرض یا فرض جان کر علوم وفنون کے جو گلہائے رنگا رنگ اردو ادب میں اُگائے وہ نہ صرف اپنی طرز میں جداگانہ حیثیت کے حامل بلکہ اپنی خوشبو، رنگت، نکھار اور دلکشی میں جدا ہونے کے ساتھ دیرپا تاثیر اور تاثر کے حامل بھی ہیں۔ سچ پوچھیئے تو پروفیسر صاحب کی صحبت میں گزرے چند ماہ ہمارے لیے ایک طرح سے درس گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں ہمیں بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا موقع میسر رہا جس کی بنیاد پر ہمارے دل میں یقیں جاگزیں ہو چکا ہے کہ آپ کے لیے بھی زیرِ نظر دستاویز نہ صرف علم وادب کا خزینہ بلکہ دلچسپی اور دل بستگی کے ساتھ معلومات کا ناختم ہونے والا ایسا ذخیرۂ ادب ہے جس سے مدتوں استقادہ کیا جانا چاہیے۔

.....گلزار جاوید

میرے والد ضلع مردان (ناواگئی تحصیل کے ایک گاؤں کروکندہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ سوات کا یہ علاقہ بے حد زرخیز واقع ہوا ہے۔ 1954 اور 1971 میں والد نے وہاں جا کر کھیتوں اور زمین جائیداد کو حق داروں میں تقسیم کر کے بٹوارے کو آخری شکل دے دی تھی جس کی تفصیل تحصیل ناواگوئی میں اب بھی موجود ہے۔ کئی ایکڑ کھیتوں کی زمینیں جو کروڑوں روپے کی ہیں جوں کی توں دوسروں کی تحویل میں ہیں۔ والد مرحوم کا انتقال 1982 میں ہو گیا تھا۔ 1971 کے بعد راستے بند ہو چکے تھے۔ اب یہ سارا اثاثہ میرے برادرِ خرد اور ہم شیر (جو دو برس قبل دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں) کے نام سے رجسٹرڈ ہیں۔ لیکن اب دنیا ہی بدل گئی۔ یہیں پیوندِ خاک ہو جانا ہے۔

دراصل والد مرحوم حافظ القرآن تھے اور فقہ کی تعلیم بذریعۂ فارسی وہیں حاصل کی تھی۔ ابا مرحوم نرم اور بہت نرم بھی تھے اور گرم اور بہت گرم بھی تھے۔ ہم بچوں کو انھوں نے نہ تو پشتو سکھائی، نہ دین کی تعلیم دی، جو کچھ تعلیم پائی اس میں ایک دوسرے مولانا ہکلے کا ہاتھ تھا۔ جن کی زبان میں لکنت تھی اور وہ ہمارے کرایہ دار تھے۔ دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بے حد سخت تھے جیسا کہ مولویوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ ابا بھی مولوی تھے لیکن پیشہ ور مولوی نہیں تھے دوسرے کاروبار میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اکثر مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے سفر کیا کرتے تھے۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بڑا تھا۔ خوش طبع تھے۔ ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں رکھتے تھے جو دل میں بغض وحسد رکھتے ہیں، انھوں نے جو کام بھی کیے اپنے شرطوں پر کیے۔ خوش پوشاک، خوبرو، خوش قامت، خوش ہونے والوں کے ساتھ ہی ان کی نشستیں ہوتی تھیں۔ عموماً تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے یا سعدی کی نثر ونظم کو آہستگی کے ساتھ ترنم میں پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ داستان امیر حمزہ کی 350 صفحات پر مشتمل گہرے زرد رنگ کی ایک ڈمائی سائز سے بھی بڑا مصور کتابی نسخہ تھا، جس کے کاغذ بھی دبیز تھے۔ ابا مرحوم اسے بڑے خشوع وخضوع سے اکثر پڑھا کرتے تھے۔ غالباً انھیں یہ وہم تھا کہ یہ امیر حمزہ وہی ہیں جو حضورؐ کے چچا تھے اور جن کی بہادری اور اولوالعزمی کے قصے بہت مشہور ہیں۔ ایک اسی نوعیت کی رنگین کاغذ میں 'کریم اللغات' بھی تھی جو میرے ابتدائی ایام میں بڑی کام آئی۔

والدۂ مرحومہ کو ہم بی اماں کہتے تھے۔ یہ خاندان پہلے عشرے میں خالہ بی اور خالو جان کے ساتھ بھوپال سے اجین (مدھیہ پردیش) منتقل ہو گیا تھا۔ اس خاندان کا مقصود اجین میں مسلمان لڑکیوں کی باقاعدہ دین ودنیا کی تعلیم کی سہولت فراہم کرنا تھا۔ 1915 میں جب انھوں نے اسکول قائم کیے تو سرکار نے ایک معاہدے کے تحت انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ اجین میں یہ پہلا مسلم لڑکیوں کا تعلیمی ادارہ تھا۔ یہ مدار گیٹ اردو گرلز مڈل اسکول کے نام سے قائم ہوا تھا اور 1954 تک گھر ہی میں ساری کلاسیز ہوتی تھیں۔ مکان کے کسٹوڈین میں چلے جانے کے بعد ایک دوسری عمارت میں اسے منتقل کر دیا گیا۔ اب بھی یہ مدار گیٹ اردو گرلز ہائی اسکول سے موجود ہے۔ دوسرا اسکول مرزا واڑی محلے میں کھولا

☆ چھ سال کی عمر گرچہ ناپختہ ہونے کے سبب بہت سی یادیں حافظے سے محو ہو جاتی ہیں مگر ہم گفتگو کا آغاز مسجد میں تفسیر سننے کے علاوہ شپرا ندی میں نہانے اور بچپن ونوجوانی کے دنوں کی سنہری یادوں میں شریک ہونا چاہیں گے؟

☆☆ محترم یہ وہ زمانہ تھا جب تقسیم کے اثرات زائل نہیں ہوئے تھے۔ کسٹوڈین کے خوف سے گھروں گھر کہرام مچا ہوا تھا۔ خاندان کے کسی بھی فرد یا افراد کا سرکاری ملازمین یا کسی سی، آئی، ڈی کو پتہ چلتا تو گھر کے دروازے پر نوٹس چسپاں ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ علاوہ اس کے سی، آئی، ڈی حضرات ہر دوسرے دن ہمہ اقسام کی معلومات حاصل کرنے کے لیے آ دھمکتے تھے۔ خصوصاً بزرگوں سے زیادہ تفتیش کرتے، کرید کرید کر پوچھتے۔ بے حد عزت واحترام سے پیش آتے۔ ان کے پاس ہر گھر سے پاکستان منتقل ہونے والوں کی پوری فہرست ہوتی، پھر بھی کسی وقت بھی وارد ہو جاتے۔

گیا۔ خالو جان نے مدار گیٹ اردو بوائز پرائمری اسکول کی بنیاد رکھی اور وہی اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔

گھر میں اردو ہی پڑھی، بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اسکول میں ہماری والدہ اس زمانے کے بچوں کے مشہور رسالے کھلونا، پھلواری، غنچہ وغیرہ پابندی سے منگواتی تھیں۔ ابا ماہانہ 'مولوی' پابندی سے منگواتے تھے۔ میں جب نویں میں تھا تو بی اماں مجھ سے ترنم میں میرا کلام سنتی تھیں اور تعریف کیا کرتی تھیں۔ شاعری کے شوق کو پر پرواز اس وقت ملے جب 1956 میں میرے بھانجے اقبال حیدری کراچی سے آئے اور Crime & Punishment کے ترجمے کی نقل کرنے کے لیے مجھے تاکید کی۔ میرا خط اتنا اچھا نہیں تھا سو میں نے ان کے خوبصورت خط کی اس طور پر نقل کی کہ وہ بھی دنگ رہ گئے۔ تب سے میرا خط بہت اچھا ہو گیا۔ وہ کراچی سے مسرت۔ م خیری کے ساتھ ماہانہ 'جام نو' اور پاکستان کا پہلا اقتصادیات پر مبنی ماہانہ 'Economic Review' بھی پابندی سے نکالتے تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ 'شہر بے نو' کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ ترقی پسندی اور میرا جی کے حلقۂ ارباب ذوق سے متاثر تھے۔ ان کا شعری اسلوب بہت منجھا ہوا تھا۔ میں خود ان کے اسلوب کی نقل کیا کرتا تھا۔ جام نو کے ایک خاص نمبر میں انھوں نے میری تصویر کے ساتھ ایک غزل بھی شائع کی تھی۔ ترقی پسند نقاد ممتاز حسین سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کے بنگلے ہی میں ممتاز صاحب سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ یہ غالباً 1983 کی بات ہے۔ انھوں نے میرے مضمون 'واز کیز اور مارکسی جمالیات' کو پڑھا تھا اور پسند بھی کیا تھا۔ ان کے خیالات بے حد متوازن اور شدت پسند ترقی پسندوں اور تشہیر بازوں سے نہ صرف مختلف تھے بلکہ علمی نوعیت کے تھے۔ اردو اور فارسی کے کلاسیکی اور جدید ادبیات کے مطالعے میں ان کا کوئی ہم سر نہیں تھا۔ ان کی جو قدر و منزلت ہونا چاہیے تھی وہ بہتوں کی طرح اس سے محروم رہے لیکن اس کا انھیں کوئی افسوس نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے واز کیز کی تصنیف 'Art & Life' کی خواہش ظاہر کی تو میں نے جب وہ دہلی آئے۔ پہلی فرصت میں انھیں پیش کر دی، بہت خوش ہوئے۔

بچپن کی ایسی بہت سی یادیں ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ہم نے آزادی کے بعد تین گھر تبدیل کیے اور ہر گھر میں نیم اور انجیر کا پیڑ تھا۔ ہمارے قدیم گھر کے آنگن ہی میں نیم کا گھنا درخت تھا اور دوسرے دو گھروں میں دوسرے مکانوں کے گھنے نیم کے درختوں کا ایک بڑا حصہ ہمارے آنگن کو بھی ڈھک دیتا تھا۔ کبھی طوطوں کے غول کے غول شام کے اوقات وہ دھمال مچاتے کہ ہم آپس میں بات چیت بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کا شور زندگی سے معمور ہوتا تھا۔ چیل سب سے اوپر کی شاخ پر گھونسلہ بناتی تھی۔ بے حد بھدّا اور بے ترتیب، بالکل اسی طرح کووؤں کے گھونسلے بھی چیلوں کی مانند بدنظمی کے نمونے ہوا کرتے تھے۔ 'کووں' میں بڑی عیب داری ہوتی ہے۔ آنگن میں جہاں کوئی بیٹھا ہو وہ نشانہ تان کر اپنی کثیر رنگی، نہایت بدبودار کبھی معتدل اور کبھی پتلے دست کی مانند بیٹ اس پر برساتے پھر شان سے نیچے کی طرف دیکھتے کہ بندے پر اس کا کوئی اثر ہوا کہ نہیں۔ کوئی حرکت دیکھ کر یک لخت کائیں کائیں کر کے پھُر۔ کبھی کبھی کوئی بلّی کسی چڑیا کو شکار کرنے کی غرض سے درخت پر چڑھتی تو ایک ساتھ بہت سے کوے اکٹھے ہو کر وہ چیخ پکار کرتے کہ بلی کو دم دبا کر بھاگنا پڑتا تھا۔ بلی اور کوے دونوں بہت چالاک ہوتے ہیں۔ بلی کبھی کوے کا شکار نہیں کرتی کیونکہ وہ بدصورت بھی ہوتا ہے اور اپنا دفاع کرنا خوب جانتا ہے۔ میں نے انجیر کے پیڑ پر ہمیشہ دو انتہائی خوبصورت رنگا رنگ، نازک اندام چڑیوں کو گھونسلہ بناتے ہوئے دیکھا۔ وہ انجیر کی سب سے پتلی ڈالوں پر تنکے چنتی تھیں اور بڑے سلیقے سے چڑا چڑی دونوں سکڑ کر اس طرح گزر بسر کرتے کہ ایک کو دوسرے سے جگہ کی قلت کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کبھی کبھی غالباً چڑا گھونسلے کے باہر کسی ڈالی پر چڑیا کے کسی اشارے کا منتظر ہوتا اور پھر کچھ دیر بعد وہ گھونسلے میں داخل ہوتا۔ شاید چڑیا اس مہلت میں انڈے وغیرہ دیتی ہے۔

میں جب آٹھویں درجے میں تھا، تب سے مجھے لائبریری بنانے کا ایسا شوق ہوا کہ تمام رسائل کو ہر روز جماتا۔ نئی پرانی کتابوں کو اکٹھا کرتا، ایک روپے والے کتابوں کے سستے ایڈیشن خریدتا، کورس کی کتابوں کو سنبھال کر رکھتا۔ اس کام میں بی اماں اور ہماری بہن کی مدد بھی شامل ہوا کرتی تھی۔ نویں درجے میں پہنچا تو ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کا چسکا پڑ گیا۔ اس وقت وہ 9 آنے میں ڈاک سے آیا کرتے تھے۔ پہلے کے ڈاکیے بھی بہت محنتی اور ذمہ دار ہوا کرتے تھے۔ ہم پہلی دوسری تاریخ سے ڈاک گھر جا کر ہمارے علاقے کے ڈاکیے صاحب جن کا نام خلیل تھا ان کو پریشان کرتے۔ وہ کھڑکی میں جھانکتے ہوئے ہمیں دیکھتے تو فوراً کام چھوڑ کر باہر آجاتے اور بہت عجز و انکسار کے ساتھ سمجھاتے کہ بیٹے کیوں فکر کرتے ہو۔ جیسے ہی آپ کی ڈاک آئے گی سب سے پہلے آپ کے گھر ہی آؤں گا۔ اور واقعی وہ اپنی سائیکل پر دو موٹے موٹے خطوط و رسائل سے بھرے ہوئے تھیلے لادے ہوئے سب سے پہلے ہماری دہلیز پر ہی پہنچتے جہاں ہم بیٹھے ہوئے ان کے منتظر ہوا کرتے تھے۔ ابنِ صفی کے ناول پاگل کرنے والے تھے۔ میں ½10 بجے ہی ناول لے کر نزدیک کی مسجد میں پہنچ جاتا۔ ظہر کی نماز تک مسجد میں سناٹا ہوتا تھا۔ میں مسجد کے اندر بہت اندر ایک رحل پر کوئی پارہ رکھتا (اللہ معاف کرے) اور ناول کے نشے میں ڈوب جاتا جب کوئی داخل ہوتا تو فوراً پہلو میں اسے چھپا لیتا جب وہ فارغ ہو کر چلا جاتا تو پھر ناول نکالتا اور اسے جلد سے جلد ختم کر کے دم لیتا۔ ان ناولوں نے ہمیں زبان سکھائی، مطالعے کا شوق پیدا کیا، انسان کو سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ گیارہویں کلاس سے نیاز فتح پوری کا نگار پڑھنے اور اس کے مضامین کی نقل کرنے میں گھنٹوں لگا دیتا تھا۔ سمجھ میں کم آتا تھا لیکن دھیرے دھیرے اس کے متون آسان محسوس ہوتے گئے۔ نگار نے مجھے بنانے ہی میں نہیں بگاڑنے میں بھی بہت مدد کی۔ ابن صفی نے سہل اور رواں زبان سکھائی تھی اور نگار نے اسے بہت مشکل بنا

دیا۔اس مشکل سے میں آج تک باہر نہیں آسکا۔والد صاحب کی پشتو اور فارسی اور والدہ کی بھوپالی اردو نے بھی میری زبان کو کچھ میلی کر دیا۔ میں اپنی تحریروں میں لاشعوری طور پر ان آمیزشوں سے بچنے کی کتنی بھی کوشش کروں نہیں بچ پاتا۔بہرحال میری تنقید کی زبان پر میرے ابتدائی لڑکپن کے زمانے کے اثرات گہرے ہیں۔ جن کے باعث میری تنقید کی زبان اور طرزِ فکر کی دھج ہی میرے معاصرین میں سب سے مختلف ہے اسی لیے نامانوس بھی ہے۔

☆ بقول عمر فرحت صاحب آپ نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔وجوہات وعوامل سے باخبر کیجیے تو عنایت ہوگی؟

☆☆ جب میں چودہ پندرہ برس کا تھا تب ہمارے محلے میں قمر اجینی مرحوم نام کے اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہوا کرتے تھے۔ان کے برادر خرد عبدالوہاب میرے ہم مکتب تھے۔ایک دن وہاب نے ایک شعر سنایا کہ یہ انھوں نے کہا ہے۔ دوسرے دن ماہنامہ 'شمع' میں ایک غزل کی زمین پر میں نے پوری غزل کہہ کر اسے بتایا تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ میں نے کہی ہے۔دوسرے جمعے کے روز جب یہ بات قمر صاحب تک پہنچی تو انھوں نے گھر بلا کر مجھے ایک طرحی مصرعہ دیا اور میں نے دوسرے کمرے میں پوری غزل کہہ کر ان کے سپرد کر دی۔وہ بھی دنگ رہ گئے اور کہنے لگے وہاب تم تو پھسڈی ٹھہرے ایک شعر کے بعد دوسرا نہیں کہہ سکے۔ عتیق اللہ نے پوری غزل کہہ دی۔یہ تو پاس ہوگئے۔بس کیا تھا ظالم یہ لت تب ہی سے لگی ہوئی ہے اور میں نے اس کا دامن ابھی تک نہیں چھوڑا۔

☆ ابتدا میں آپ تابش تخلص فرماتے تھے آج کل شاید ترک کر دیا ہے۔ کچھ احوال اس کا بھی بتلا دیجیے؟

☆☆ دراصل تقریباً 65-1960 تک عتیق تابش ہی کے نام سے شہرت بھی پائی تھی میرے ایک دوست صادق، جو کبھی کاذب مالوی کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کرتے تھے اور بعد ازاں صادق مولیٰ کے نام سے لکھنے لگے۔ہم دونوں کو جانے کیا سوجھی بہ یک وقت ہم نے صرف اپنے نام سے لکھنا شروع کر دیا جو آج تک جاری ہے۔

☆ آپ کی ابتدائی شاعری کی زبان نامانوس اور کھردری بتلانے والے سچ بیان کر رہے ہیں یا کسی طرح کے مغالطے میں گرفتار ہیں؟

☆☆ میری غزلوں کی زبان یقیناً غزل کی عمومی اور روایتی زبان سے قدرے مختلف تھی اور ہے اس میں کسی شعور کو دخل نہیں ہے۔میں اپنی فکر کے لحاظ سے کسی سیدھی لکیر پر چلنے کا عادی نہیں ہوں۔میں اپنے کو آج بھی نیا محسوس کرتا ہوں اور نئی نسل کی شاعری اور فکشن میں تجربات کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

☆ آپ کے ہاں موجود غصہ، جھنجلاہٹ، عدم تحفظ کن عوامل کے سبب نمایاں بلکہ نمایاں تر نظر آتا ہے؟

☆☆ میری غزلوں میں جو غصہ وری اور جھنجھلاہٹ ہے وہ غیر محسوس طور پر در آئی ہے۔دنیا بھر میں جہاں جہاں مظلوم طبقات اور اقوام ہیں وہاں ان کے لیے زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ہمارے بعد کی نسلوں کو تو جانے کن کن دوزخوں سے گزرنا ہوگا۔اس سیارے پر قدرت کی طرف سے کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا بلکہ انسان کی اپنی خود غرضی، حرص و ہوس، تہذیبی قوم پرستی، نسل پرستی، صارفیت، سائنس و ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی، استحصال پسندی اور پاور کا نشہ ہی اس سیارے کو کسی دن بھک سے اڑا دے گا۔امکانات کے دور گئے اب صرف مایوسی ہی مایوسی، ناامیدی ہی ناامیدی ہے۔

☆ آپ کی نسبت جدید شاعر کا تاثر دینے والے معاشرے اور منقطع کی اصطلاح سے کیا تاثر دینا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ سوال میری سمجھ سے باہر ہے۔

☆ شاعری کے توسط سے آپ نے اردو زبان میں مختلف انداز کے ڈرامے کی بنیاد کس بنا پر ڈالی اور اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟

☆☆ میرا ڈراما 'پیچھے کوئی ہے' ایک تجرباتی ڈراما ہے۔اس کا موضوع انسان کی بے حسی ہے۔موت اور زندگی دونوں الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ سیاست پہلے اتنی سنگدل نہیں ہوئی تھی۔نوکر شاہی کو کبھی اتنا طاقتور نہیں دیکھا تھا۔ جو لوگ امن پسند ہیں وہ بے حد قلیل ہیں۔زندگی کی ہر سطح پر شدت پسندی اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ڈرامے میں یہ بتایا ہے کہ لوگوں کو روز و شب بحث کرنے اور لفاظی میں زمین و آسمان ایک کرنے کی بے معنی عادت سی ہوگئی ہے۔ ہر شخص بس اپنی بات کرنا چاہتا ہے۔دوسرے کی کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتا۔گویا ہر لفظ نے کلیشے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

☆ آپ کے ہاں گاہے گاہے علامتوں کی غار کا متھ خلق کیا جاتا ہے اس کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں؟

☆☆ میرے یہاں اکثر 'غار' 'سرنگ' جیسے الفاظ آئے ہیں۔اب انھیں آپ علامت سے جوڑیں یا استعارے کے طور پر ان کے کوئی معنی اخذ کریں یہ قاری پر مبنی ہے لیکن میرے شعر پر غور کرنا پڑے گا۔مثلاً

تو جب آیا ہے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
غار کے منھ سے جو یہ سنگ ہٹیں تو دیکھوں

چلو سرنگ سے پہلے گزر کے دیکھا جائے
پھر اس پہاڑ کو کاندھوں پہ دھر کے دیکھا جائے

آنکھ کا پتھر ایک الاؤ رکھتا ہے
کیسے اس تنور کے اوپر فصل اُگی

منھ پھاڑتی ہیں گھر کی دراڑیں اِدھر اُدھر
اک قہقہہ کہ جیسے فضا میں بکھر نہ جائے

کاٹھ کے ہاتھ کاٹھ کے پاؤں
چیخ سکتا ہوں ہل نہیں سکتا

میں کسی چیخ کا انکُر تھا کہ اس جنگل میں
جس جگہ پھوٹ کے نکلا ہوں وہیں شور ہوا

☆ آپ کی شاعری کو عرفانِ ذات کا نقطۂ آغاز بتلانے والے نقطۂ انجام کی نسبت روشنی کیوں نہیں ڈالتے؟

☆☆ نقطۂ انجام کا کسی کو کیا علم ہوسکتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں بہ یک وقت تصورِ ذات (Deceptive) فریب کاری کی حقیقت بھی ہے اور استفادہ بھی۔ بے بضاعتی کی مظہر بھی ہے اور تضحیک و تمسخر کا ہدف بھی۔ تحقیر و تذلیل پر زہر قند بھی۔ اس کے باوجود آپ سادیت سے مبرّا گردانے جاتے ہیں؟

☆☆ دراصل حقیقت کی کوئی ایک تعریف نہیں کی جاسکتی۔ ہر حقیقت پر غیابات کے کئی پردے پڑے ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی، وہ انسان ہو کہ کائنات، سچائی ہو کہ اس کا فریب۔ کوئی فلسفہ تسلی نہیں بخشتا۔ سب کھیل تماشہ معلوم ہوتا ہے۔ غیاب کے پردے سے نکل کر آئے تھے اور غیب ہی کے پردے کے پیچھے چلے جانا ہے۔ ایک معدومیت سے دوسری معدومیت تک کا سفر ہے۔ بہت زیادہ غور کرتے ہیں تو دماغ پاگل ہونے لگتا ہے۔ اس لیے 'جو ہے بس ہے' یہی عرفانِ ذات ہے۔ طنز و تضحیک سے بھی اکثر طمانیت حاصل ہوتی ہے:

میں بار بار گلاٹیں لگائے جاتا ہوں
بجا بجا کے کوئی ڈگڈگی نچاتا ہے

☆ آپ کے ویژن کو Tortured Vision سے تشبیہہ دینے والے کسی خاص خامی کی نشان دہی کر رہے ہیں کیا؟

☆☆ ممکن ہے Tortured Vision ہی میری شاعری کی شناخت ہو۔ یہ کسی کے لیے ناقابل برداشت ہوسکتا ہے کسی کے لیے مضحکہ خیز بھی۔

☆ انگریزی، فرانسیسی، یونانی اور لاطینی زبانوں اور اصطلاحات کا برتاؤ ارادی ہے یا اتفاقی نیز اس عمل کا حاصل کیا ہے؟

☆☆ ادبی اصطلاحات کی فرہنگ کا تصور نیا نہیں ہے۔ انگریزی میں ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ البتہ اردو میں کسی نے تفصیل کے ساتھ انھیں مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس میں ترمیم اور اضافے کرتا رہا۔ کئی رجسٹر بھر دیے۔ بہت کچھ تلف ہوگیا۔ حوالے بھی تلف ہوگئے اسی لیے میری کتاب تصنیف نہیں بلکہ تالیف ہے۔ جس میں کہیں کہیں صرف ترجمہ ہے کہیں کچھ اخذ کیا ہے۔ کہیں بنیادی معلومات کے حصول کے لیے انگریزی فرہنگوں سے استفادہ کیا ہے اور کہیں کہیں انسائیکلوپیڈیا کی بھی مدد لینی پڑی۔ بس یہ سمجھ لیں کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

☆ تنہائی کا خوف بھی آپ کے ہاں جا بجا نظر آتا ہے۔ کس طرح کی تنہائی ہے جسے قاری محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا؟

☆☆ تنہائی تو ہم سب کا نصیب ہے۔ ہماری اپنی محسوسات سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہم گزشتہ صدی سے اسی عذاب میں گرفتار ہیں۔ اب تو سیاست نے بھی فرد کو بہت تنہا اور بے چارہ کر دیا ہے۔

☆ تشکیک و تردد کی نشان دہی کرنے والے اُس کی سمت یا رُخ کی نشان دہی کیوں نہیں کرتے؟

☆☆ -----

☆ آپ کے ہاں موجود فنتاسیا کے خال و خد مخصوص محسوساتی فضا کے محرکات بھی وضاحت طلب ہیں؟

☆☆ -----

☆ گلوریا انزالدو، اگامبین اور فو کو جیسے دانشوران کی سوچ اور فکر سے آپ کی شاعری کے معنی اور مفہوم اخذ کرنا کس امر کی دلیل ہے؟

☆☆ شاعر کو بس شعر کہنا چاہیے۔ اس کے بارے میں دوسرے کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کی طرف زیادہ سنجیدگی سے غور و فکر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہر دو رمیں ہر نئی نسل کو جہاں روایت کے ایک وسیع نظام کا خاکہ وراثت میں ملتا ہے اور اسے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کون کون سے شاعر و ادیب کب کب روایت سے متصادم ہوئے روایتی بھرم توڑے گئے لسان و فکر و احساس کے نئے نئے سانچے بنائے گئے۔ اس لیے ہر نئی نسل کو اپنی جرأتوں کی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ اسے بغاوت بھی کرنا پڑتی ہے، اجتہاد بھی کرنا پڑتا ہے۔ نمائندگی کے نئے طور اختیار کرنے کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اب تہذیبی منظر نامہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ سائنس و ٹکنالوجی ترقیاتی رفتار میں بازی مار گئی۔ انسان بہت پیچھے ہوتا جا رہا ہے۔ سیاست اتنی طاقتور پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی موجودہ ادوار میں وہ پاور کے نشے میں اندھی ہوگئی ہے۔ نظریات کے سکے کہیں ڈھالے جاتے ہیں اور وہ پوری دنیا میں رائج ہوجاتے ہیں۔ مملکتوں کی سطح پر بھی قوم و تہذیب کے معانی اور افکار و نظریات کے نئے نئے سکے ترسیل و ابلاغ کے ذرائع سے ڈھالے جاتے ہیں اور شعوری اور غیر شعوری طور پر مسلمات سمجھ کر ان پر اکتفا کرلیا جاتا ہے۔ اگر میری شاعری میں غصہ وری اور برافروختگی، کڑواہٹیں، ذہنی و جذباتی اذیتوں کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ ہے تو اس کی وجوہ بھی اسی تناظر میں مضمر ہیں۔

☆ لمس کو روح فرسا حقائق کے مقابل معتبر Props کے طور پر برتنے کے باوجود آپ کا فرحت بخش عمل دانشورانہ مباحث کی بھینٹ کس بنا پر چڑھ گیا؟

☆☆ -----

☆ اشرف المخلوقات سے خطاب کے تخلیقی عمل میں کیا خامی اور کمی رہ گئی

تھی جس کے سبب اسے صفاتِ جملہ کے منافی گردانا گیا؟

☆☆ -----

☆ سموئیل، بیکیٹ، کامیو، سارتر اور یوجین آئی نسکو کے سماجی شعور سے آپ کی شاعری اور سجاؤ کی مماثلت قرینِ قیاس ہے؟

☆☆ آپ نے جن ادیبوں کا ذکر کیا ہے، جدیدیت کے زمانے میں ان کی طرف نئی تعلیم یافتہ نسل نہ صرف متوجہ ہوئی بلکہ ان کے تراجم بھی کیے گئے۔ میرا ڈراما 'پیچھے کوئی ہے' میں ان کے جو اثرات کارفرما ہیں ان کے علاوہ آواں گارد اور ایلیٹ وغیرہ کے تصورات نقد نے بھی لسان وفکر کو متاثر کیا تھا۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کے عروج کو دیکھا اور ان پر دھند کی پرتیں چڑھتے ہوئے بھی دیکھیں۔ اب مارکس اور فرائڈ کے بجائے سوسیئر، فوکو، بارتھ، بین جمن، کرسٹیوا، دریدا وغیرہ کا حوالہ روزمرہ بن گیا ہے لیکن جدیدیت نے جن ادبی تصورات کا احیا کیا تھا اور جس تجربہ پسندی کے لیے راہیں ہموار کی تھیں اس سے مفر آج بھی نہیں ہے۔

☆ بین کرتا ہوا شہر کے بعد تکلم کی اشاعت میں تاخیر کے علاوہ آزاد نظم، نثری نظم کی جانب رجحان اور وکالت کے اسباب بھی وضاحت طلب ہیں؟

☆☆ نثری نظم بھی نظم ہی ہوتی ہے، شاعری ہوتی ہے۔ شاعری اور غیر شاعری کی پہچان کیا ہے؟ وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اس کی نثر نہیں کی جاسکتی اور کسی نثری نظم کو نثر کی نحوی منطق کے طور پر منتقل کریں گے تو وہ بے معنی اور مجذوب کی بڑ نظر آئے گی۔ نثری نظم کی زبان بھی ناراست، علامتی یا استعاراتی یا محض تخلیقی ہوتی ہے۔

☆ عروض دان کو اچھا شاعر نہ ماننے والے کس دلیل کی بنیاد پر یہ رائے قائم کیے ہوئے ہیں؟

☆☆ عروض دانی اچھی چیز ہے، لیکن جو شعرا فاعلاتن کے ناپ تول کے بغیر ایک مصرعہ بھی نہیں کہہ سکتے وہ کبھی اچھے شاعر نہیں بن سکتے۔ عروض کا علم ضرور حاصل کرنا چاہیے لیکن اس کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ بڑے بڑے عروض داں استاد گزرے ہیں لیکن ان میں کوئی ایک بھی اچھا یا بڑا شاعر نہیں بن سکا۔

☆ نامور اور قادر الکلام شاعر کا مشاعروں سے گریز کئی طرح کے سوالات اور خدشات کو جگہ دے رہا ہے؟

☆☆ مشاعروں میں سنسنی خیز شاعری رائج ہے۔ عوام کو وہی پسند بھی ہے۔ تاہم کم معیاری اور غیر معیاری ہونے کے باوجود مشاعرے کی روایت کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب چونکہ مشاعرے بھی ڈرامے اور داستان سرائی کی طرح Performing art میں بدل گئے ہیں اس لیے مشاعروں میں کامیابی کی ضامن اب اچھی شاعری یا فکر انگیز شاعری نہیں ہے۔ ہر ایک شاعر اسٹیج پر کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ عوام اسے گوارہ کریں گے۔

☆ شاعروں کی نسبت افسانہ نگاروں سے آپ کی قربت کے چرچے اکثر سنے گئے ہیں۔ یہ اتفاق ہے یا انتخاب؟

☆☆ چونکہ شاعری کے علاوہ ناول اور افسانوں سے بھی شروع سے رغبت رہی ہے اس لیے میں شاعری ضرور کرتا ہوں۔ ناول لکھنے کا خیال تک نہیں آیا، ناول بہت مشکل آرٹ ہے۔ اس کے لیے ہوم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشاہدات و تجربات کا غیر معمولی ذخیرہ ہونا چاہیے۔ سیدھے سپاٹ قسم کے ناول لکھنے سے بہتر ہے آدمی صرف ناول کا قاری بنا رہے تو مجھے اسی میں عافیت نظر آتی ہے۔

☆ ابتدا آپ نے شاعری سے کی مقام آپ نے تنقید میں زیادہ پایا۔ مستقبل کی شناخت کس حوالے سے پسند فرمایئے گا؟

☆☆ -----

☆ آپ کا اوّلین تنقیدی مجموعہ تاخیر سے منظر عام پر آنے کی وجوہات کیا ہیں اور کئی احباب اس مجموعے کی نسبت سنجیدگی اور گہرائی کی باتیں کن معنوں میں کیا کرتے ہیں؟

☆☆ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا تو تنقید کے دلدل میں پھنسنا پڑا تب ہی ترقی ملتی ہے مطالعے کی عادت تھی، مشکل قسم کی تحریریں پڑھنے کی عادت لڑکپن سے تھی اور مختلف نقادوں کے متعدد مضامین رجسٹروں میں نقل کرلیا کرتا تھا۔ اس لیے تنقید کی زبان میرے لیے نامانوس نہیں تھی۔ میں نے لیکچرر شپ کے لیے راتوں رات کچھ مضامین لکھے اور 1978 میں قدر شناسی کے نام سے مجموعہ بھی تیار کرلیا۔ اس کے بعد فرمائشیں آنے لگیں اور باقاعدہ نقاد بن گیا۔ لیکن تخلیق افضل ہوتی ہے۔ تنقید کا عمل بے حد ذمہ داری اور جواب دہی کا عمل ہی نہیں تہذیبی عمل بھی ہے اس لیے اس کی وقعت، معنویت اور اہمیت تخلیق سے کم نہیں ہے۔

☆ آپ کے تنقیدی روّیوں کے ضمن میں بین ہمین، ٹی ڈبلیو اڈونو، ہربرٹ مارکیوز، بلوخ اور ایرک فرام جیسے نو مارکسیوں کا ذکر اس لیے لازم ہے کہ آپ نے مذکورہ بالا مفکرین کو قطعی طور پر لائق توجہ نہیں گردانا؟

☆☆ -----

☆ آپ کے حوالے سے جدید نقاد کی اصطلاح پڑھنے والوں کے لیے نئی بات نہیں مگر جب ذکر ساختیات ردِ ساختیات، نئی تاریخیت، قاری اساس، ریڈیکل سسٹیم، نئی مارکیٹ اور ہائپر ریلٹی کی ہوتی ہے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں؟

☆☆ -----

☆ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ساتھ عالمی ادب میں رہ پانے والے ڈسکورس سے آپ کی قربت یا ہم آہنگی کن وجوہات کے سبب کی جاتی ہے؟

☆☆ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور پھر اس کے زوال کے ساتھ جدیدیت کا آغاز، ارتقا اور پھر سست رفتاری بھی دیکھی۔ نتیجتاً میں نے یہی نظریہ قائم کیا کہ ہر تحریک اور رجحان پر گہرائی اور معروضیت کے ساتھ غور وخوض کرنا چاہیے۔ سب نے اپنے اپنے دور میں دعووں کی جھڑی لگائی ہے۔ ان میں سے وقت کے ساتھ بہت کچھ رد ہوچکا ہے اور بہت کچھ ایسے تصورات ہیں جنھیں نئی نسلیں قبول بھی کررہی ہیں۔ نقل وتکرار کے نتائج کبھی یکساں صورت میں برآمد نہیں ہوتے۔ ہر نقل میں عقل، وجدان اور تخیل

کے ساتھ ساتھ ماضی کی روایات کا عمل بھی کارفرما ہوتا ہے۔اس طرح نقالی تقلیب Tranformation کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ہم نہ تو ماضی کو بدل سکتے ہیں اور نہ ہو بہو اس کی نقل کرسکتے ہیں۔وہ تو ہمارے لاشعور میں پیوست ہوتا ہے۔

جدیدیت کا بھی ایک تاریخی تناظر ہے۔بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ایک کے بعد ایک ایسے کئی تصورات کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا جن میں شدت اور بغاوت کا پہلو سب سے نمایاں تھا، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی قدروں کو بھی کئی چیلنجز کا سامنا تھا۔ بین الاقوامی رشتوں میں بھی پہلی جنگ عظیم اور مارکسی فلسفے کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تحت غیر معمولی تبدیلیوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ تاثریت کے بعد دادازم، سریلزم، مونتاژ اور اسمبلاژ کی جو صورتیں مصوری میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔شعروادب میں بھی لسان وہیئت کی سطح پر اسی قسم کی کئی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔انیسویں صدی کی علامتی تحریک پہلے ہی فضاسازی کا کام کرچکی تھی۔تنقید، فلسفے، مصوری، عمارت سازی، مجسمہ سازی، فیشن، کھانے کی چیزوں کی عادات، سائنسی علوم کی طرف رغبت، روزگار کے لیے بیرونی ممالک کی طرف نوجوان نسلوں کا میلان، تشکیکیت، بنیاد پرستی کی طرف رجحان، تجربہ پسندی کے پہلو بہ پہلو احیا پسندی اور روایت کو نئے معنی مہیا کرنے کی طرف رغبت، روشن خیالی کی نئی تعبیریں وغیرہ وغیرہ یہ وہ صورت حال ہے جو کافی گڈمڈ تھی۔

نئی صورت حال جسے مابعد جدید کہا گیا ہے اس میں اب بھی بہت کچھ جدید کے باقیات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد کا سرد جنگ کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے پوری دنیا کو دو دھڑوں میں بانٹ دیا تھا۔غیر جانبداری بھی پوری غیر جانبداری نہیں تھی۔جو ملک سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے مالا مال تھا اس کی داداگری کا دور شروع ہوگیا۔روس کو اپنی نوآبادیات سے بے دخل ہونا پڑا۔عراق، شام، فلسطین، افغانستان میں جس طور پر انسانی جانوں کا زیاں ہوا اور ان ممالک کے عوام کو بار بار دربدر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔کن کن المیوں کی داستانیں سنائیں مابعد جدید صورت حال اور پیش رو جدید صورت حال میں یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے مابعد جدیدیت کی تشہیر میں 70-1960 کے دوران اہاب حسن، اورنگ ہوو، لیزلی، فیڈلر وغیرہ نے بنیادی فضا سازی کا کام کیا تھا۔ چارلس جینکس (Charles Jeneks) نے آرچی ٹیکچر میں جو نئے اسالیب متعارف ہورہے تھے، اس تعلق سے مابعد جدیدیت کی اصطلاح استعمال کی تھی۔گویا نئی صورت حال کا احساس اب زندگی کے کئی صیغوں میں ہونے لگا تھا۔دراصل یہ اصطلاح اس معاصر تہذیبی صورت حال کی نمائندگی کررہی تھی جس میں تناسب کا فقدان تھا، کلاسیکیت اور پاپولر کلچر کے بے میل انضمام، حقیقت اور التباس کی صورتیں مسخ ہونے، اعداد وشماریات کے روزافزوں چلن، فنی ہیئتوں پر ان کے اثرات، میٹافکشن، سائبر ٹیکسٹ، سائبر آرٹ جیسی اصطلاحات کے علاوہ بیانیہ سے متعلق کئی نئی اصطلاحوں کا تعارف، قائم شدہ established روایتوں اور وایت سازوں کو سوال زد کرنے کے عمل، شیرازہ بندی، بنیاد پرستی اور مرکزیت کی نفی، تکثیریت heterogensity، چھوٹے، مقامی، حاشیہ رسید، اور نامکمل بیانیوں کے خیر مقدم جیسی صورتوں سے مابعد جدیدیت عبارت ہے۔ان کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ایسا ہے جس کا قصد انارکی، قومی اور تہذیبی شدت پسندی اور انسانیت کی ان اعلیٰ ترین قدروں کی نفی ہے جن سے انسانی یکجائی کے تصور کو تقویت پہنچتی ہے۔

میں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں جو کچھ قبول کرنے کے لائق چیزیں ہیں انھیں قبول کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔اس لیے ادب وتنقید کو بین النظریاتی اور بین العلومی کہتا ہوں۔اس بات پر بھی مجھ اصرار ہے کہ جہاں سے بھی مجھے اگر کوئی علم ملتا ہے اسے اخذ کرکے میں غور وفکر ضرور کرتا ہوں۔قبولیت کی کلید ہمیشہ اپنے پاس ہونا چاہیے۔شعروادب میں مابعد جدیدیت کے اثرات ان معنوں میں نمایاں ہیں کہ اب کوئی ایسا تصور اور نظریہ نہیں ہے جو مستحکم ہو۔انتخاب اور اظہار کی آزادی پر کسی دعوے کی قدغن نہیں ہے۔ ہیئت پرستی کے بجائے ہیئتوں کے انہدام کا دور ہے۔کبھی کبھی انہدام بھی ضروری ہوتا ہے لیکن ردوانکار کی کوئی بنیاد کوئی جواز ہونا چاہیے۔قبولیت میں اتنے خطرات نہیں ہیں جتنے ردوانکار کے عمل میں ہیں۔ردوانکار کا عمل زیادہ علم کا تقاضہ کرتا ہے، زیادہ عقل واستدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔دریدا، رولاں بارتھ، پال دی مان، میشیل فو کو اور امریکی یالے اسکول کے ردوانکار محض ردوانکار نہیں ہیں بلکہ ان کا اصل مقصود راست اور مرکوز متنی مطالعے کی طرف ہے جس کا مقصد متن میں پنہاں بدیعیاتی یا منطقی تضادات کو نمایاں کرکے دکھانا ہے۔ہر متن کی ایک واضح اور صریح وصاف منطق ہوتی ہے جس سے مخفی تحت المتن متصادم ہوتا اور اسے جھٹلاتا ہے۔دریدا، مراکز، وسلیت، شناخت، معنی خیزی وغیرہ کو سوال زد کرتا ہے اور معنی کو مابعد الطبیعیاتی التباس سے تعبیر کرتا ہے۔ بارتھ کے 'مصنف کی موت' کے تصور کا مقصد بھی بس اتنا ہے کہ قاری یا قاریوں کا سلسلہ تو غیر مختتم ہے لیکن مصنف کی موت کے بعد اس کی محض تحریر ہوتی ہے اور اس کے قاری یا نقاد اسے نئے نئے معنی سے سرفراز کرتے رہتے ہیں۔ ہر متن آپ سے ایک سے زیادہ بار قرأت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ بلکہ بعض متون بہت آہستگی کے ساتھ گرہ کشائی کا مطالبہ کرتے ہیں اور ہر گرہ کھلنے پر ایک نئی سرشاری کے احساس سے ہم دوچار ہوتے ہیں۔اس لیے کسی حد تک یہ بھی صحیح ہے کہ منشائے مصنف محض ایک بھرم ہے اور قاری ہی تمام معنی کا حق دار ہے اور برخلاف یہ بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہر متن اتنا تہہ دار، پیچیدہ اور بے زبان نہیں ہوتا کہ آپ اسے نئے سرے سے خلق کرسکیں۔تفہیم بھی ایک سطح پر خلق کرنے کا نام ہے۔

اس طرح بہت سے تصورات ہیں جو لائق توجہ ہیں اور قطعاً نئے ہیں۔ مابعد جدیدیت اب تک کی تمام ادبی اور فنی تحریکات ورجحانات میں سب سے زیادہ بھڑک دار، منھ زور اور انقلابی ہے۔

☆ مارکسی جمالیات، ردِتشکیل ہرمنیات، ساختیات اور پس ساختیات پر اس قدر مغز پچی کیوں ضروری گردانی گئی؟

☆☆ -----

☆ آپ کے ہاں تنقید کی نسبت لفظ اشتہار بازی کس بنا پر برتا گیا اور اس عمل کے رد میں آپ نے کیا کاوشات کیں؟

☆☆ ----

☆ اقبال، میراجی، منٹو، بیدی، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، مجید امجد، انتظار حسین حتی کہ فیض احمد فیض کو بھی متبادل فنکار گردانا کیوں ضروری ٹھہرا؟

☆☆ دراصل متبادل ادب وتنقید کا تصور میرے ذہن ہی کی اختراع ہے۔ میرے سامنے اردو ادب کی پوری تاریخ اور روایت کا سلسلۂ دراز ہے۔ میں نے یہی محسوس کیا بلکہ نتیجہ اخذ کیا کہ جتنے اہم قابل ذکر اور بڑے شاعر اور فکشن نگار ہیں ان کے یہاں روایت کا شدید احساس وعلم ہے لیکن ان کے اپنے کچھ ذہنی، تخلیقی، داخلی تقاضے ہیں وہ ان کی اَن دیکھی نہیں کرتے۔ اپنی اندر کی آواز بھی ان کے لیے محترم ہوتی ہے۔ وہ معاصر عہد کے شعری اور افسانوی اسالیب اور ادبی، فنی، فلسفیانہ رجحانات سے بھی باخبر ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے مقابلے میں ان کا تنقیدی شعور زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ محسوس اور غیر محسوس طور پر بعض رجحانات سے متاثر بھی ہوتے ہیں لیکن وہی تاثر ان کے لیے آخری تاثر نہیں ہوتا۔ انھوں نے معاصر تنقید کے دعوؤں کو تعویذ بنا کر گرہ میں باندھنے والوں کا حشر بھی دیکھا ہے اور کسی ایک تحریک یا عصری حاوی رجحان کے سجدہ گزاروں کی مٹی پلید ہوتی ہوئی بھی دیکھی ہے۔ متبادل ادیب یا تو ماضی میں بہت دور جا کر ان گمشدہ اسالیب کو ایک ایسی نئی زندگی بخشتا ہے جو اسی کی ملک ہوتی ہے یا اپنے تخیل اور وجدان اور بصیرت سے اظہار کے پیرایوں اور ادائیگی کے طریقوں یا تکنیکوں کو انتہائی نامانوس اور نوزائدہ بنا کر پیش کرنے کی جرأتوں کو بروئے کار لاتا ہے یا یہ اس کا شعوری عمل نہیں بلکہ خود رو عمل ہوتا ہے۔ کسی بھی فن پارے کو شروع کرنے کے بعد فن پارہ بہت جلد تخلیق کار سے رسیاں تُڑا لیتا ہے اور اپنی راہ خود نکالتا چلا جاتا ہے۔ مصنف کا منشا ایک طرح دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہی صورت اقبال، میراجی، ناصر کاظمی، اختر الایمان، مجید امجد، قاضی سلیم، انتظار حسین، قرۃ العین، جمیلہ ہاشمی، فیض احمد فیض، منٹو وغیرہ کی ہے۔ اقبال کو اسلامی مفکر کے نام سے یاد کریں یا فیض کو ترقی پسندان کے اسالیب میں نہ تو کسی پیش رو نہ کسی معاصر حاوی رجحان کا کوئی گہرا نقش ملتا ہے۔ غالب کے بعد غالب کو عبور کرنا خود غالب کے لیے مشکل ہوتا اگر وہ 20 ویں صدی میں دوبارہ پیدا ہو جاتے۔ اقبال نے غالب کو رد نہیں کیا اور نہ انھیں آسیب بنایا۔ انھوں نے غالب کو غالب کے تحت المتون میں ان اسالیب کو دریافت کیا جن تک ہر کس و ناکس کی نظر تک نہیں پہنچتی۔ غالب تو اس وقت بھی وہی غالب تھے جتنا حالی نے انھیں دریافت کیا تھا اس لیے اقبال اور ان کے بعد عبدالرحمٰن بجنوری تک غالب شناسی نے مستحکم رجحان کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ تفہیمات غالب محض شروح ہیں۔ جس طرح غالب اپنے عہد وعصر میں ایک متبادل شاعر اور نثر نگار تھے اسی طرح اقبال، حالی وآزاد کی طرح محض موضوعاتی شاعر بن کر کسی مختلف مقام کا تعین نہیں کر سکتے تھے۔ اقبال نے نظم کی صنف کو مالا مال کر کے متعین بھی کر دیا۔ بڑے اور متبادل شاعر و فکشن نگار کو بعد ازاں ہر ادبی تحریک اپنا نمائندہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ میر، غالب، اقبال جدید بھی ہیں ترقی پسند بھی۔ ان پر اب ہر کوئی اپنا دعویٰ کر سکتا ہے۔ قرۃ العین کو ترقی پسندوں نے تسلیم کیا اور نہ جدیدیوں نے انھیں لائق تحسین گردانا۔ ہمارے دور کے اہم نقادوں نے نہ تو قرۃ العین اور نہ اختر الایمان اور نہ مجید امجد اور نہ منٹو کا ہم دردانہ فہم نہ سہی بے دردانہ فہم کے ساتھ بھی اپنی بحث کے مرکز میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وارث علوی اور شمیم حنفی نے منٹو اور قرۃ العین کی طرف توجہ کی۔ اگر شمیم حنفی کے قرۃ العین یا انتظار حسین سے ذاتی مراسم نہیں ہوتے تو شاید وہ اتنی گہرائی کے ساتھ بمشکل ہی متوجہ ہوتے یا ہوتے ہی نہیں اختر الایمان اور مجید امجد کی طرف تو انھوں نے بھی کوئی توجہ نہیں کی اور نہ وارث علوی، فاروقی یا رنارنگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ناصر کاظمی تو خوش قسمت تھے کہ ان پر لکھنا ایک فیشن بن گیا تھا۔ زیادہ تر نقادو ں کے یہاں بعض نکتوں کو محض بار بار دہرایا گیا ہے۔ ناصر کاظمی کا شعری کینوس بھی اتنا وسیع نہیں تھا۔ ان کے نرم رو دھیمے آہنگ میں نئی آب سی تھی۔ فراق کے اسلوب شعر کے وہ عناصر جو فراق کی یافت تھے۔ فراق نے انھیں اپنی شناخت کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ مشن کے طور پر انھیں اپنی انتہا تک لے جانا تھا۔ یہ کام ناصر کاظمی نے کیا اور انتہائی اطمینان اور خاموشی کے ساتھ کیا اور بازی مار گئے۔

☆ آپ کے تنقیدی محاکموں میں غالب کو کھوجنے کی کوشش وجستجو میں کیا کچھ نیا ہاتھ لگا اور احباب نے اُس کی نسبت کس طرح کی رائے قائم کی؟

☆☆ غالب بڑا ظالم اور پینترے باز شاعر ہے۔ جس طرح پہلوان اکھاڑے میں جسم پر تیل مل کر اترتے ہیں تا کہ دوسرا حریف اسے چھو تو سکتا ہے، مضبوطی سے پکڑ نہیں سکتا۔ بڑے بڑے داؤ لگانا پڑتے ہیں پھر بھی ہر بار ہاتھ پھسل ہی جاتا ہے۔ غالب بھی ایسا ہی پہلوان ہے۔ وہ جتنا پکڑ میں آتا ہے ہمیں بس اتنے ہی پر قانع رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قرأت پر ایک نئے غالب سے تعارف ہوتا ہے۔ غالب کو مالا مال کرنے میں ہمارے صاحب نظر قاریوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

☆ ادبی اصلاحات کی وضاحتی فرہنگ کی نسبت جناب اسلوب احمد انصاری نے جو اعتراضات اُٹھائے ہیں اُس کے حوالے سے آپ کی رائے ریکارڈ پر آنا ضروری ہو گیا ہے؟

☆☆ میں اسلوب احمد انصاری مرحوم کا بہت معترف ہوں اور وہ میرے لیے بہت محترم ہیں۔ انھوں نے جن اصطلاحات کی طرف توجہ دلائی تھی ان پر میں نے بھی بہت غور کیا۔ بعض تبدیلیاں بھی کیں اور بعض کو میں نے اسی شکل میں رہنے دیا۔ اصطلاح کا معاملہ ہی یہ ہے کہ متفق الرائے ہونا بہت مشکل ہے۔ بحث ہوتی رہے، رد وقبول کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جو سکہ چل گیا پھر اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ایک بار چلن میں آنا ضروری ہے۔ میں نے ان خطرات کو قبول کرتے ہوئے پہل کی۔ اگر یہ اعتراف کیا گیا تو میرے لیے کافی ہے۔

☆ مہا کوی کالی داس اور بھرتر ہری سے آپ کی ملاقات کب اور کیونکر

ہوئی اور اُس کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟

☆☆ -----

☆ مراری بابو کو آج کے دور کا کالی داس اُن کی کس خوبی پر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ کالیداس اور بھرتر ہری کے تراجم بہتوں نے کیے ہیں۔ میں نے صرف انھیں پڑھا ہے، ان پر لکھا کبھی نہیں۔

☆ آپ کے بقول! ہر دور میں کوئی نہ کوئی رجحان حاوی ہوا کرتا ہے۔ آپ کے تخلیقی سفر میں کون کون سے رجحان نمایاں رہے اور آپ نے کن رجحانات کا زیادہ اثر لیا اور اُس کے نتائج کیا رہے؟

☆☆ اس کا جواب تو تقریباً ہر جگہ مذکور ہے۔

☆ آپ کی قلمی کاوشات نے یہاں اُجالا، وہاں چراغ دھرنے کی جو سعی کی اُس کی ناکامی یا نامرادی کے سبب آپ کے ہاں کس طرح کی سوچ اُبھرتی اور اُس کے زیرِ اثر آپ کا عمل کیا ہوا کرتا ہے؟

☆☆ ہر شاعر یا فکشن نگار کا ادبی سفر کئی سنگِ ہائے میل پر مشتمل ہوتا ہے۔ وجدان و تخیل ہی نہیں زبان کو بھی جلا ملتے ملتے بہت وقت لگ جاتا ہے۔ آپ جتنا اپنے ذہن و تخیل کی مشین سے کام لیں گے اور جتنا وجدان سرگرم رہے گا اور زبان کے اندر چھپی ہوئی لامحدود قوتوں کی فہم ہوتی جائے گی۔ شعوری عمل بڑی حد تک لاشعوری عمل میں بدلتا جائے گا۔ اس باریک سے نکتے کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ تخلیق کار مختلف علوم کے ذخائر سے استفادہ بھی کرتا رہے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاسی زیر و زبر اور سائنسی و تکنیکی اور ترسیل و ابلاغ کی غیر معمولی ترقیات اور اس کے مثبت و منفی نتائج سے بھی باخبر ہو لیکن اکثر تخلیقی فنکاروں کے تئیں بہت زیادہ باخبری بھی تخلیقی خود روی پر قدغن لگا دیتی ہے اور بے خبری ایک نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ تخلیقی فنکار بہت حساس ہوتا ہے۔ ایلیٹ نے جذبات سے فرار کی بات اس معنی میں نہیں کہی تھی کہ آدمی غیر جذباتی اور ٹھس ہو جائے بلکہ اس خیال کے پیچھے یہ نکتہ مخفی ہے کہ بنیادی طور پر ادیب جذباتی ہوتا ہے اور جذبے کی اپنی رَو ہوتی ہے۔ اس سیلِ رواں پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے اور اکثر شاعر معمولی قسم کے عشقیہ اور مایوس کن جذبوں کے اظہار میں زیادہ تسکین حاصل کرتے ہیں۔ تخلیقی فنکار اپنی ذات کے علاوہ دوسرے انسانوں کے ان جذبات و محسوسات کی نمائندگی بھی کرتا ہے جن کا تعلق مشترک اور عمومی جذبات انسانی سے ہے۔ ڈراموں، رزمیوں، ناولوں، داستانوں، افسانوں وغیرہ میں مصنف کو اپنے انفراد میں ایک سے زیادہ انسانوں کا مجموعہ بننا پڑتا ہے۔ عشقیہ اور عارفانہ مثنویوں میں بھی اپنے ذات کو پرے رکھنا پڑتا ہے اور دوسروں کی ذات میں غوطہ زن ہو کر اس کے اندرون تک پہنچنے کی سعی کرنی پڑتی ہے، لیکن شاعری کی ہر صنف کے تقاضے مختلف ہیں۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامے یا فکشن کی کسی دوسری صنف میں ایک سے زیادہ منفی یا مثبت کرداروں کے جذبات، ارادوں، شکوک کو پیش کرتے وقت کیا محض غیر جذباتی ہو کر کسی کردار کے جذبات کے اظہار کی صحیح نمائندگی ممکن ہے۔ ظاہر ہے اس معنی میں ایلیٹ کے اس خیال کی پوری تائید نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے بنیادی طور پر ذات کے اردگرد ہی اس کا ہالہ بنتا ہے۔ شاعر کو مصنوعی جذبے سے بھی تخلیقی حس کو حرکت میں لانا پڑتا ہے۔ شاعر کے سوا اس باریک سے نکتے کو جاننے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ شاعری لفظوں کا کھیل ہی ہے۔ کسی کو کامرانی ملتی ہے اور کسی کو ناکامی اور ادب کا میدان ہی ایسا ہے کہ یہاں ہر تحریر کو نیکی سمجھ کر دریا میں ڈال۔ وقت اور قاری سے بہت زیادہ توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ میں 62-1960 تک دوسرے قابل ذکر شعرا کے اسالیب کی نقل کرتا رہا۔ جوش کے مجموعوں میں اعراب کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ ان سے اپنی اردو درست کی۔ کبھی میر، کبھی غالب، کبھی فیض، کبھی عدم کے لب و لہجے کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ کبھی انگریزی تاریخ ادب کے ترجمے کا ڈول ڈالا۔ ٹیگور کی گیتانجلی کی متعدد نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔ بھوپال جا کر مشرقی صاحب مرحوم کی کتابوں کی دوکان سے پاکستانی رسائل خرید کر لاتے، ان میں نقوش اور اس کے نمبر، ادبی دنیا، اوراق، کبھی کبھی ماہ نو، ادبِ لطیف، نیا دور اور دوسرے مجلّے خریدنے اور دستیاب ہونے پر روحانی خوشی ملتی تھی۔ مشرقی صاحب مرحوم بے حد منکسر المزاج اور مخلص انسان تھے۔ ہم لوگوں کی بہت عزت کرتے تھے اور حوصلہ افزائی میں بھی انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان رسائل کے ذریعے مجید امجد، عبدالعزیز خالد، جعفر طاہر، جعفر شیرازی، ناصر کاظمی، منیر نیازی، عبدالعزیز فطرت، تابش دہلوی، جیلانی کامران، رشید امجد، سائرہ ہاشمی، خالدہ حسین، ادا جعفری، وزیر آغا، قیوم نظر، یوسف ظفر اور خصوصاً میراجی کی شخصیت، زندگی ان کے تراجم، تجزیے اور شاعری پڑھ کر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا۔ میرے عزیز دوست اور رفیقِ صبح و شام صادق نے مجھ سے زیادہ خلاقانہ طبیعت پائی تھی۔ انھوں نے ہندی شاعری کا مطالعہ خوب کیا تھا۔ اسی لیے وہ نثری نظم لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ سجاد ظہیر کے بعد وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مسلسل کئی نثری نظمیں لکھیں۔ ان دنوں اردو رسائل نثری نظمیں شائع نہیں کرتے تھے۔ میں ان دونوں نثری نظم یعنی 62-1960 کے اردگرد نہیں لکھ سکا۔ صادق نے اعلیٰ درجے کی منظوم اور نثری نظمیں اور غزلیں کہیں اور درمیان میں اعلیٰ درجے کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کی۔ تجرباتی افسانے بھی لکھے، مصوری بھی کی، بعد میں ٹی وی سیریلز کی طرف رجوع ہو گئے۔ علاوہ اس کے تعلق سازی اور دوست و احباب کے حلقے کو وسیع کرنے اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاری کا ان کا اپنا طور تھا۔ میں بدبخت شاعری کرتے کرتے اردو لیکچرر شپ کے چکر میں نقاد بن بیٹھا اور یہ طوق ابھی تک گلے میں لٹکا ہوا ہے۔ صادق نے تنقید کی طرف کم ہی توجہ دی۔ میرے لیے میدانِ تنقید دلدل ثابت ہوا۔ اس ظالم کو نبھانے کے لیے پڑھنا بہت پڑتا ہے۔ آدمی پاگل بنا رہے۔ بہت زیادہ علم تخلیقی حس کو مار دیتا ہے۔ شاعری کی معصومیت کو غارت ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ باوجود اس کے میں آج تک شعری

تجربے کرتا رہا۔ میری 1965 کے بعد کی غزلیں زیادہ تر 'شب خون' الہ آباد میں شائع ہوتی تھیں۔ 1971 میں 'ایک سوغزلیں' کے نام سے پہلا مجموعہ کلام حیدرآباد سے شائع ہوا۔ یہ تیار تو 1969 سے تھا لیکن حیدرآباد کے ایک شاعر صاحب جو کاتب بھی تھے انھوں نے اور پھر ایک رسالے کے مدیر صاحب نے پیسے لینے کے باوجود ڈیڑھ دو سال برباد کیے۔ 'ایک سوغزلیں' نوجوان العمری کی یادگار ہیں۔ جو اپنے ڈکشن (تلفیظ) خیال وفکر، لسانی سانچوں اور محسوساتی سانچوں کے اعتبار سے اس قدر نامانوس تھیں کہ انھیں اس دور میں برداشت نہیں کیا گیا۔ جس میں قدم قدم پر روایت شکنی، لسانی توڑ پھوڑ، غیر شاعرانہ کہلانے والے الفاظ، مایوسی، لب ولہجے میں زہرناکی اور کڑواہٹ، خوف زدگی، بے زمینی و بے چارگی کا احساس عام قاری کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں بچپن کے دنوں سے یعنی 1947 کے بعد سے جو حالات رونما ہوتے رہے ان کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی امید کی کوئی کرن دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھ سے ایک روز میرے بزرگ معاصر کمار پاشی کہنے لگے میں اپنے رسالے 'سطور' میں آپ کے مجموعے پر تبصرہ ضرور کرتا لیکن آپ کی غزل کو غزل کون کہے گا۔ میں بھی کیا لکھوں گا۔ میں نے بس اتنا کہا، آپ صحیح کہتے ہیں اسے بس مجذوب کی بڑ سمجھیے۔ میں نے اس کے بعد آج تک اپنی کتاب کا 'اجرا' کرایا، اور نہ تبصرے کے لیے کسی رسالے کو بھیجا اور نہ مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ شب خون اور نقد ونظر (مدیر اسلوب احمد انصاری) کو جو کتابیں بھیجی تھیں انھوں نے انھیں تبصرے کے لائق سمجھا۔ فاوقی مرحوم نے بعض کوتاہیوں کی طرف نشاندہی بھی کی اور کھل کر تحسین بھی کی اور آخر میں اپنی معاصر نسل میں سب سے ذہین بھی قرار دیا، اسلوبِ غزل کی انفرادیت کا حوالہ بھی دیا۔ اسلوب صاحب کو صرف بین کرتا ہوا شہر اور اصطلاحات والی کتاب کی پہلی جلد ارسال کی تھی۔ میں نے تبصرے کے لیے گزارش بھی نہیں کی تھی مگر انھوں نے بے لاگ تبصرے کیے۔ اب میں 'ایک سوغزلیں' کی بعض ایسے اشعار نذر کررہا ہوں جو 1964-67 تک کے زمانے کی یادگار ہیں:

رسی لٹک رہی ہے گلے کو نہ بھینچ لے
خنجر چمک رہا ہے، بدن میں اتر نہ جائے

منھ پھاڑتی ہیں گھر کی دراڑیں اِدھر اُدھر
اِک قہقہہ کہ جیسے فضا میں بکھر نہ جائے

تو جب آیا ہے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
غار کے منھ سے جو یہ سنگ ہٹیں تو دیکھوں

ساری چیزیں غیر مناسب لگتی ہیں
ہاتھ میں دے دی جائے اک تلوار مجھے

اینٹیں جانے کب حرکت میں آجائیں
جانے کس دن چن لے یہ دیوار مجھے

ایک قدم رکھتا ہوں آگے
اور اک دور گزر جاتا ہے

میں آگیا تھا خود اپنے ہی پانو کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر

اڑان بھرنے سے پہلے ہی پھٹ پڑی ہے زمیں
جہاں کھڑے تھے زمیں دوز ہوگئے ہیں وہیں

سمجھ سکے تو اسے جا کے خود ہی بتلاؤں
کہ آج سوکھے ہوئے دھڑ میں پھر ہوئی سرسر
کشادہ دست ہی میرے نہ پُرشکم میرا
اے میرے شہر کے پندار! مجھ فقیر سے ڈر

میں آہی جاؤں گا اور تو بھی مل جائے گا
اس اعتماد سے اب میرا انتظار نہ کر

میں سرِ راہ پڑا تھا کوئی ٹھہرا نہ ذرا
وہ تو یہ کہیے کہ خود میں نے بچایا مجھ کو
خوف آتا ہے قدم رکھتے ہوئے پانی میں
اتنا پیاسا نہ ہو پی جائے یہ دریا مجھ کو

ننگا بدن ببول کے کانٹوں پہ تان دے
لوہے کی گرم سیخ سے چوٹیں لگا مجھے
میں بار بار لگاتا ہوں جست اس کی طرف
وہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتا ہے

نسوں میں قینچیاں چلتی ہیں ایک ساتھ کئی
اور اس پہ تان دیے ہیں لباس پتھر کے

پھینکا گیا تھا ہم کو غلیلوں سے بار بار
جن پتھروں پہ ٹوٹے وہی نوکدار تھے

زبان میں کئی سوراخ ہوگئے پیدا
ادا جو کر چکے اس چیخ میں نہاں کیا تھا

پھیلائے ہی تھے میری طرف اس نے دونوں ہاتھ
پیچھے سے جانے کس نے اک برچھی اتار دی

سینگ کی نوک پہ رکھا ہے مجھے
پار بھی پُل کے اترنا ہے مجھے
پتلیاں آنکھ سے جھڑ جانے دے
قہر پر تولتے دِکھتا ہے مجھے
کھینچ دی ایک دھوئیں کی چادر
اس پہ پھر آگ سے لکھا ہے مجھے
ہلدیاں ہاتھ میں آگ آئی ہیں
جانے کس قہر کا خطرہ ہے مجھے

میں ایسا بچہ تھا نالی میں جس کو پھینک دیا
بلکتا دیکھ کے مجھ پر جھپٹ پڑیں چیلیں

زمیں پہ آگ لگی ہے میں الٹا لٹکا ہوں
کوئی درخت سے مجھ کو اتارتا بھی نہیں

میں ایک کانچ کا پَر تولتا پرندہ تھا
اڑان بھر نہ سکا اور چھن سے ٹوٹ گیا
کبھی تو توڑ مری ایک سی انا کا بھرم
کبھی تو ریڑھ کی ہڈی میں قہر بن کر آ

سبھی کے ہاتھ کٹے ہیں، بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا

بچ کے بھاگا ہی تھا اک دوزخ سے میں
دوسرے دوزخ میں آکر پھنس گیا

عمر سرکس کے کسی شیر کے مانند کٹی
تازیانوں کے نشاں کیسے مٹائے کوئی

چیختا ہے مرے اعصاب میں دھرتی کا بدن
کتنا پیاسا ہو مجھے کھود کے دیکھا جائے

میں کہاں تک اپنے ان اشعار کا انتخاب کروں جو ایک 'سوغزلیں' میں شامل تھے۔ دراصل گذشتہ صدی سے تشدد، بے دردی، انسانی جانوں کی بے حرمتی کا جو سلسلہ جاری ہے وہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے۔ ہر مذہب کی تفسیریں بدل گئیں، خدا کو بس کتابوں میں بند کر رکھا ہے۔ کسی کا خوف ہے نہ رحم۔ انسانیت کا تعویذ باندھے ہوئے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھنے کی تاب بھی نہ رہی جہاں امن وامان کی فصلیں پھولتی پھلتی ہوں۔ میرے یہاں 'ایک سوغزلیں' کے بعد وہ شدت تو نہیں رہی جو جوان العمری کے جذبات و محسوسات اور بلاخوفی کا مظہر تھیں۔ 'بین کرتا ہوا شہر' اور پھر 'تکلم' 2016 میں شائع ہوا۔ ان میں نظمیں بھی شامل ہیں۔ اب فکر اور گہری سنجیدگی پچھلی بے اختیاری پر حاوی ہوگئی ہے۔ اسی دور میں تنقید کے شکنجے میں پھنسا اور جن میں پھنستا چلا گیا۔

ہم سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب ہم نے قدم رکھا یہ خاکداں ویراں تھا

کبھی گلو، کبھی خنجر مجھے دکھائی دیا
یہ ایک خواب ہی اکثر مجھے دکھائی دیا
بہت سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں پہلے
پھر اس کے بعد وہ منظر مجھے دکھائی دیا

یہ درمیان میں کس کا سراپا آتا ہے
اگر یہ حد ہے تو حد سے گزر کے دیکھا جائے

ہم اپنے آسمانوں میں کہیں تھے
ہمارے پیچھے کوئی آرہا تھا

زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں
کہ ایک شخص اِدھر سے اُدھر نہیں جاتا

کتنے برسوں کے بعد آنکھ کھلی
اور اسی روز مجھ کو مرنا تھا

ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ

''چہارسُو''

کون گزرا تھا محرابِ جاں سے ابھی، خامشی خامشی شور بھرتا ہوا
دھند میں کوئی شئے جوں دمکتی ہوئی، اک بدن سا بدن سے ابھرتا ہوا
میرے بس میں تھے سارے زمان و مکاں، لیک میں دیکھتا رہ گیا
چل دیا لے کے چٹکی میں کوئی زمیں، آسماں آسماں گرد کرتا ہوا

چراغ ہاتھ کے بجھ رہے ہیں، ستارہ ہر رہ گزر میں رکھ دے
اتار دے چاند اس کے در پہ، سیاہ دن میرے گھر میں رکھ دے
یہ صَرف و حاصل گزیدہ دنیا نہ دن ہی میرے نہ میری راتیں
کہاں تلک دیکھتا ہی جاؤں، ساعتیں کچھ نظر میں رکھ دے

اب ایسی شب کی سیاہی کا رزق میرا نصیب
اب ایسے دن ہیں تو ان پر گزارا کرتا ہے

اک اندھیرا ہوں سر سے پانو تک
پھر یہ پہلو میں کیا چمکتا ہے

وہ دشمنوں کی طرح مجھ پہ وار کرتا ہے
مگر گروہ میں اپنے شمار کرتا ہے
اِدھر اُدھر سے بچاتا ہے وقت میرے لیے
کبھی کبھی ہی سہی انتظار کرتا ہے

نہ ایک رات ہی ایسی نہ ایک دن ایسا
مگر میں رات کو دن سے ملانے والا تھا
اک اور گمان نے سایہ سا مجھ پہ تان دیا
اک اور گمان کی زد میں جب آنے والا تھا

پڑا ہوا تھا کھلی چھاتیوں پہ سر رکھ کر
اڑا کے لے چلے بگلوں کے سلسلے مجھ کو
میں سر سے پانو تلک ایک آنکھ بن جاؤں
جہاں سے بھی تجھے دیکھوں دکھائی دے مجھ کو

یاد اس کے وہ گلنار سراپے نہیں آتے
اس زخم سے اس زخم کو بھرتے ہوئے دیکھا
پانی تھا مگر اپنے ہی دریا سے جدا تھا
چڑھتے ہوئے دیکھا نہ اترتے ہوئے دیکھا

تم نے تو فقط اس کی روایت ہی سنی ہے
ہم نے وہ زمانہ بھی گزرتے ہوئے دیکھا

دور اس کی روانگی کا تھا
ہر طرف سے گزر گیا ہوں میں
دیکھ نظارہ اس کو کہتے ہیں
پاؤں پہ سِل ہے زیرِ پا ہوں میں

وہ میرے نالے کا شور ہی تھا، شبِ سیہ کی نہایتوں میں
میں ایک ذرہ عنایتوں پر، میں ایک گردش کثافتوں میں
گرفت اور اس کی کر رہا ہوں، جو آب ہے ان بصارتوں کی
کمند اور اس پہ پھینکتا ہوں جو تہِ نشیں ہے ساعتوں میں
میں ایک شب کتنی راتیں جاگا، وہ ماہ بیتے کہ سال گزرے
پہاڑ سا وقت کاٹتا ہوں، شمار کرتا ہوں ساعتوں میں

ستم کے ہاتھ تھے اور آسماں کو چھوتے تھے
ذرا جھکا دیا ہوتا تو سر نہیں جاتا
وہ چاند تارِ گریباں میں جا کے اٹکا ہے
تمام آسماں دامن میں بھر نہیں جاتا

شعارِ زیست ہنر تھا سو ہم نہ جان سکے
جو کام ہم نے کیا دوسرا نہ کرتا تھا
فضا میں ہاتھ تو اٹھے تھے ایک ساتھ کئی
کسی کے واسطے کوئی دعا نہ کرتا تھا

جو تنگ ہوتے گئے قلب ہائے سینہ تمام
کوئی مقام، مقامِ دعا نہیں ہوگا

ایک آنسو بھی کم نہیں ہوتا
ہم چراغوں میں بھر کے لائے تھے

اتنے بہت سے اشعار میں نے دو وجہوں سے نوٹ کیے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی رسالے کو میرا نمبر نکالنے کی اجازت دی، نہ میں نے کسی سے اپنی شاعری کے سفر پر کوئی مقالہ لکھوایا۔ تین یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی بھی ہوئی۔ کہیں میری کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا اور نہ کسی انعام و اکرام کے لیے تعلق سازی یا خوشامد یا درباداری کی۔ میں نے تفصیل کے ساتھ اپنے شعری

سفر کے محض چند سنگ ہائے میل کی طرف اشاہ کیا ہے۔ان کے جذباتی اور ذہنی محرکات بھی تھے۔جو غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوئے۔شکوہ ہے تو زیرلب، احتجاج ہے تو زیرلب۔ یہ سب ذات اور وجود اساس تجربات ہیں۔میری نظموں میں بھی ان تجربات کی گونج محسوس کی جاسکتی ہے۔سوات و مردان کی سرزمینوں میں ہماری جڑیں ہیں اس لیے میرے رگ و پے میں جو خون سرگرم ہے اس کی شدت کو resist کرنے کی کوشش کرتا ہوں پھر بھی خون کی اپنی رَو اور زبان ہوتی ہے وہ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔

☆ اس احساس یا خیال کی نسبت آگاہی دیجیے کہ حیات و کائنات کی محدودیت کن معنوں کُن وجوہات کی بنا پر محسوس کی جاتی ہے اور اس کا سدِ باب کس طرح ہوسکتا ہے؟

☆☆ ابھی تک کسی ایسے سیارے کا پتہ نہیں چلا ہے کہ وہاں زندگی کے موافق آب و ہوا ہو۔ہمیں جو سیارہ ملا ہے اس میں زندگی کے ارتقا کی تاریخ صدیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔کائنات تو بے حد بسیط ہے۔کتنی کہکشائیں، کتنے ثابت و سیار، کتنے سورج ہیں ان کا علم شاید کبھی نہیں ہوسکے گا۔ ہر ترقی یافتہ ملک اس تحقیق و دریافت میں اپنا کوئی الگ مقصد رکھتا ہے۔سب سے بڑا المیہ ہے کہ دنیا کو سجانے بنانے کے سارے کام ادھورے ہیں۔امن و امان کے ہر تصور نے مضحکہ خیز صورت اختیار کرلی ہے۔آدمی پاور کے نشے میں اپنی اوقات ہی بھول گیا ہے۔انفرادی طور پر خواب سازی اور فنطاسیہ کی ایک راہ تھی جس سے جھوٹی تسلی تو میسر آجاتی تھی مگر اب قویٰ بہت مضمحل ہوگئے ہیں اور سائنس و تکنالوجی کی اندھا دھند ترقی اور عقلی موشگافیوں نے خود فریبی کی ہر راہ مسدود کردی ہے۔

☆ آپ کے دور میں جتنے نظریے اور تھیوریز بصیرتوں اور بصارتوں کی پہچان بنے۔کس نظریے اور تھیوری نے آپ کو زیادہ متاثر کیا اور جن سے آپ کے ہاں اجنبیت محسوس کی گئی۔ اُن کی نشان دہی اور وجوہات بتلانا وقت کی اہم ضرورت ہے؟

☆☆ اس سوال کا جواب پہلے ہی کہیں دے چکا ہوں۔

☆ موجودہ ابتر عالمی صورتِ حال، اجتماعی فسطائیت اور ایٹمی خلجان کے زعم میں دنیا کو زیروزبر کرنے کی کوشش یا کاوش کا انجام کیا ہوتا دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ میں نے اس سے قبل پاور کے نشے کی بات کی تھی۔سائنس اور تکنالوجی یا یہ کہیے کہ علم اب ایک طاقت ہی نہیں کاری ہتھیار بھی ہے۔مشرقی ممالک کئی مذاہب کے سرچشمے رہے ہیں اور اس وقت کی بڑی طاقتوں نے جسے چاہا لُوٹا، جہاں چاہا حکومت سازی کی۔ وہ بازوؤں کی طاقت کا زمانہ تھا۔اب صرف اور صرف علم کی طاقت کا بول بالا ہے۔افریقی ایشیائی ممالک میں غربت، بھک مری، آپسی جنگ و جدال کی جو صورتیں ہیں۔انھیں ترقی یافتہ ممالک صرف اس لیے اَن دیکھی کررہے ہیں کہ ان کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔مغرب کسی افریقی ایشیائی ملک کو اپنے برابر نہیں آنے دے گا۔''ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو'' ترقی پذیر ملکوں پر بھی مغرب کی نظر ہے وہ کسی بھی بہانے ترقی پر قدغن لگا سکتے ہیں۔ ذات، قوم، مذہب، تہذیب، نسل، مسلک وغیرہ۔اتنے بہت سے آپسی اتحاد کو توڑنے کے حربے ہیں کہ مغرب کو خود کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ہم ہی عقل کے اندھے ہیں ان کی آنکھیں تو چوبیس گھنٹے کھلی ہوئی ہیں وہ اپنے پتے بہت بعد میں کھولتے ہیں ہم ہی میں صبر و استقلال نہیں ہے۔ان میں صبر بھی ہے اور لوہے کو پورا پکنے بھی دیتے ہیں۔ہمیں کٹھ پتلیاں بننے کی عادت ہوگئی ہے۔ جو اپنے آپ کو بدلنا نہیں چاہتا اسے میرا رب بھی نہیں بدلتا یعنی اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔

Vote for Laughter

God asks Nehru how many children he had during his time on earth. Nehru says that he had only one. Happy with the relatively good family planning adopted, God gives Nehru a Mercedes!Next God puts the same question to Lal Bahadur Shastri. He replies saying he had three! God is a bit upset and gives him a cheaper car.Laloo is next. When God learns about his nine children, God is quite out off and hands him over a bicycle. Sometimes later, the three see Mahatma Gandhi returning on foot. They ask him why God had not given him anything. Gandhiji replies with anger, "Some idiot told God that I was the father of the nation!"

''بصارتوں کی کمند''

(پروفیسر عتیق اللہ صاحب کے گلہائے گراں مایہ)

فاری شا (راولپنڈی)

جہاں کچھ یاد رکھنا ہے وہیں پر بھول جاتا ہوں
پتہ تو یاد رہتا ہے مگر گھر بھول جاتا ہوں

نہیں دیکھے تھے جو منظر وہ سارے یاد رہتے ہیں
مگر دیکھا ہوا اِک ایک منظر بھول جاتا ہوں

میں خود کو ڈھونڈتا رہتا ہوں گھر کے کونے کونے میں
وہ جس کو طاق کے اوپر ہی رکھ کر بھول جاتا ہوں

کبھی دانستہ کوئی کام بھی کرتا نہیں ہوں میں
مجھے جو یاد رکھنا ہے وہ اکثر بھول جاتا ہوں

کسے میں نے بلایا تھا، بمشکل یاد رہتا ہے
کسی کو کیا میں اس کو بھی بلا کر بھول جاتا ہوں

بھلا دینا بھی اچھا ہے پر اتنا بھی نہیں اچھا
کہیں بھی قیمتی چیزوں کو رکھ کر بھول جاتا ہوں

مجھے تالا لگانا ہے یہی بس یاد رہتا ہے
وہ کس کا گھر تھا میں تالا لگا کر بھول جاتا ہوں

☆

اسی فلک ہی کے نیچے، اسی زمیں پہ ہیں
اگرچہ تم ہو کہیں اور ہم کہیں پہ ہیں

کھڑے ہوئے تھے جہاں پر بھی ہم وہیں پر ہیں
ہمیں خبر ہی نہ تھی پاؤں کس زمیں پہ ہیں

سمجھ چکے ہیں کہ کس کے نشانے پر ہیں ہم
چھپے ہوئے کئی خطرے یہیں کہیں پہ ہیں

وہ دیکھتا نہیں اپنی قمیض کا دامن
نگاہیں اس کی فقط میری آستیں پہ ہیں

نکل نہ پایا گماں کی جو دھند سے اب تک
مدار سارے ہمارے اسی یقیں پہ ہیں

یہاں وہاں کئی بیٹھے ہیں تیر تانے ہوئے
مگر شکوک اسے اپنے ہم نشیں پہ ہیں

○

☆

جتنا سمجھے تھے ہم خطرہ گرچہ خطرا اتنا نہیں تھا
ہم نے فصیلیں ہی دیکھی تھیں شہر کو دیکھا اتنا نہیں تھا

واقف تو ہم اس سے بہت تھے لیکن سمجھا اتنا نہیں تھا
ربط بھی رکھا تھا کم کم ہی، زخم بھی گہرا اتنا نہیں تھا

ہم نے دکھایا چاکِ گریباں اور دریدہ یہ داماں بھی
اس سے یارانہ تھا لیکن اس کو بھروسہ اتنا نہیں تھا

چیزیں اپنی شکل و صورت کیسے بدلتی رہتی ہیں
ایسا بھی کچھ ہوسکتا ہے ہم نے سوچا اتنا نہیں تھا

جنگل اور بیابانوں سے ہو کے گزر آیا کرتے تھے
پار اگر کرنا ہوتا تھا دریا گہرا اتنا نہیں تھا

کب سے ہماری دہلیزوں پر ہی بیٹھے ہوئے ہیں آدم خور
کل ہی کی تو باتیں ہیں یہ، ڈر بھی کسی کا اتنا نہیں تھا

○

☆

سُرنگ میں ہم پھنسے تھے پہلے بھی اور پڑا تھا یہ سامنا بھی
نکل کے اِک آ گیا تو سمجھو نکل ہی آئے گا دوسرا بھی

میں روکنا اس کو چاہتا تھا مگر اسے دکھ نہ تھا ذرا بھی
مٹا مٹا کے چلا گیا وہ ہر ایک اپنا نشانِ پا بھی

یہ ہم نہیں، کہہ رہی ہے خلقت کہ مستحق تھے اسی سزا کے
جو سننا تھا وہ نہیں سُنا، جو نہ کہنا تھا پھر وہی کہا بھی

کہیں پہ کوئی بچھڑ گیا تھا، بچھڑ گیا تھا کوئی کہیں پر
کسی نے سوچا نہ مُڑ کے دیکھا میں دیر تک چیختا رہا بھی

یہ کم نہیں ہے کھُلا ہوا ہے درِ عدالت درِ سماعت
ہمارے منصف نے کچھ سُنا ہے مگر بہت کچھ نہیں سُنا بھی

.....○.....

☆

وہ میرے نالے کا شور ہی تھا، شبِ سیہ کی نہایتوں میں
میں ایک ذرّہ عنایتوں پر، میں ایک گردش کثافتوں میں

گرفت اور اُس کی کر رہا ہوں، جو آب ہے ان بصارتوں کی
کمند اور اُس پہ پھینکتا ہوں، جو تہِ نشیں ہے ساعتوں میں

مرے لیے شہرِ کج میں رکھا ہی کیا ہے جو اپنے غم گنواؤں
وہ ایک داماں بہت ہے مجھ کو سکوت افزا فراغتوں میں

میں ایک شب کتنی راتیں جاگا وہ ماہ بیتے کہ سال گذرے
پہاڑ سا وقت کاٹتا ہوں، شمار کرتا ہوں ساعتوں میں

ترے فلک ہی سے ٹوٹنے والی روشنی کے ہیں عکس سارے
کہیں کہیں جو چمک رہے ہیں حروف میری عبارتوں میں

وہ بوجھ سر پر اُٹھا رکھا ہے کہ جسم و جاں تک ہیں چور جن سے
پچاس برسوں کی ذلتیں جو ہمیں ملی تھیں وراثتوں میں

○

☆

وہ بات کیا تھی کہ جس کا اثر نہیں جاتا
کسی کا ذہن تری بات پر نہیں جاتا

زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں
کہ ایک شخص اِدھر سے اُدھر نہیں جاتا

کچھ اور تیری طرف سے امید رکھتا ہوں
میں اِس طرح کی عنایات پر نہیں جاتا

ستم کے ہاتھ تھے اور آسماں کو چھوتے تھے
ذرا جھکا دیا ہوتا تو سر نہیں جاتا

گُماں کے ہاتھ سے مشعل کہاں پہ جا کے گری
اگر میں اپنی حدوں سے گزر نہیں جاتا

وہ چاند تارِ گریباں میں جا کے اٹکا ہے
تمام آسماں دامن میں بھر نہیں جاتا

○

☆

وہ خاکِ نم بھی مری تھی شکستہ دل بھی مرے
یہی اثاثہ ابھی میں گنوانے والا تھا

نہ ایک رات ہی ایسی نہ ایک دن ایسا
مگر میں رات کو دن سے ملانے والا تھا

غریبِ شہر کا سر ہوگیا قلم آخر
کہاں کی چیز، کہاں پر لٹانے والا تھا

اِک اور گمان نے سایہ سا مجھ پہ تان دیا
اک اور گمان کی زد میں جب آنے والا تھا

یہ تیغ بجھ گئی اور سر بھی جھک گئے ورنہ
تماشہ اور ہی تجھ کو دکھانے والا تھا

.....○.....

☆

وہ سنگ پاش اذیّت تھی تاب لا نہ سکا
میں اپنی چیخ میں پیوست ہو کے گونج اُٹھا

تراش دے کسی خنجر سے میرے دست وپا
مرے حواس کو چمگادڑوں کا خون پلا

میں ایک کانچ کا پر تولتا پرندہ تھا
اُڑان بھر نہ سکا اور چھن سے ٹوٹ گیا

جو چہرے ہوگئے منسوخ ان پہ لعنت بھیج
اُکھڑ گئے ہیں جو خیمے اُنھیں اب آگ دکھا

جو کوب پیٹھ پر اُگ آئی ہے تراش اسے
جو سینگ سر پہ نکل آئے اُن کو چھانٹ ذرا

اذیّتیں ہیں بہت ہیملیٹ بننے میں
مری طرح سے کلاؤن بن کے عمر بِتا

○

☆

قلب گہہ میں ذرا ذرا سا کچھ
زخم جیسا چمک رہا تھا کچھ

یوں تو وہ لوگ مجھ ہی جیسے تھے
ان کی آنکھوں میں اور ہی تھا کچھ

تھا سرِ جسم اک چراغاں سا
روشنی میں نظر نہ آیا کچھ

ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ

دوسروں کی نظر سے دیکھیں گے
دیکھنا کچھ تھا ہم نے دیکھا کچھ

کچھ بدن کی زبان کہتی تھی
آنسوؤں کی زبان میں تھا کچھ

○

☆

بدن کا سارا تناؤ آنکھوں میں کھنچ گیا تھا
مگر وہ دَلدَل جو ہڈیوں میں پھنسا ہوا تھا

تمام چیزوں پہ ایک جیسی اُداسیاں تھیں
سبھی کی آنکھوں میں ایک اندیشہ پل رہا تھا

گُلاب سب اُس نے آنسوؤں میں ڈبو دیے تھے
میں اُس کے نزدیک سر جھکائے کھڑا ہوا تھا

سروں سے بالشت بھر پہ چٹانیں رُک گئی تھیں
وہ اِک نظارہ کہ قہر آثار جا بہ جا تھا

اُٹھا لیے دونوں ہاتھ دشمن نے دوست کہہ کر
مگر وہ خنجر جو میرے سینے پہ لگ چکا تھا

..... ○ .....

☆

کون گذرا تھا محرابِ جاں سے ابھی خامشی شور بھرتا ہوا
دھند میں کوئی شے جوں دمکتی ہوئی اِک بدن سا بدن سے اُبھرتا ہوا

صَرف کرتی ہوئی جیسے ساعت کوئی، لمحہ کوئی فراموش کرتا ہوا
پھر نہ جانے کہاں ٹوٹ کر جا گرا ایک سایہ سروں سے گذرتا ہوا

ایک عمر گریزاں کی مہلت بہت پھیلتا ہی گیا میں اُفق تا اُفق
میرے باطن کو چھوتی ہوئی وہ نگہ اور میں چاروں طرف پانّو دھرتا ہوا

یہ جو اڑتی ہوئی ساعتِ خواب ہے کتنی محسوس ہے کتنی نایاب ہے
پھول پلکوں سے چنتی ہوئی روشنی اور میں خوشبوئیں تحریر کرتا ہوا

میرے بس میں تھے سارے زمان و مکاں لیک میں دیکھتا رہ گیا این و آں
چل دیا لے کے چٹکی میں کوئی زمیں، آسماں آسماں گرد کرتا ہوا

اپنی موجودگی سے تھا میں بے خبر دیکھتا کیا ہوں ایسے میں یک دم اُدھر
قطع کرتی ہوئی شب کے پہلو میں اک آدمی ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا

○

☆

لہو کی دھار الجھتی ہے پھر گُزر بہ گُزر
کھڑا ہوا ہوں تری سرزمیں پہ کیا بھی کر

میں آ گیا تھا خود اپنے ہی پانو کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر

ابھی تو واپسی باقی ہے شعلہ بازوں کی
پھر اُس کے بعد یہ میداں ہے اور نہ یہ منظر

یہ پیش و پشت جو سائے لٹک رہے ہیں ابھی
محیط ہونے سے پہلے انھیں جدا بھی کر

سمجھ سکے تو اُسے جا کے خود ہی بتلاؤں
کہ آج سوکھے ہوئے دھڑ میں پھر ہوئی سَرسَر

کشادہ دست ہی میرے نہ پُر شکم میرا
اے میرے شہر کے پندار! مجھ فقیر سے ڈر

○

میرے عتیق اللہ

خالد جاوید
(دہلی)

عتیق اللہ کی شخصیت پر کچھ لکھنا میرے لیے آسان کام نہیں ہے مگر یہ بھی ہے کہ اُن کی شخصیت پر جتنا بھی لکھا جائے، وہ کم ہے۔ عتیق اللہ ہمارے عہد کے سب سے جدید نقّاد ہیں۔ اُن کی تحریروں نے اُردو تنقید کا منظرنامہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ تنقید کی پرانی روایت سے استفادہ کرنے کے ساتھ انھوں نے اُردو تنقید میں تھیوری کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ اِسی زمانے میں اُن کے بعض ہم عصروں نے بھی اِسی نہج پر کام کرنا شروع کیا مگر عتیق اللہ کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف تفصیل کے ساتھ ساختیات، ساخت شکنی، نئی تاریخیت، قاری اساس تنقید، ایکو کریٹیسم، نئی مارکیٹ اور ہائپر رئیلٹی جیسے جدید ترین مابعد جدید رجحانات کو تواتر کے ساتھ، اردو میں روشناس کرایا بلکہ اطلاقی تنقید کے نمونے بھی پیش کیے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ عتیق اللہ کی تحریروں سے پہلے، کی اُردو تنقید اور اس کے بعد کی اُردو تنقید کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ یقیناً گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، قمر جمیل، فہیم اعظمی نے اور قاضی افضال حسین کی خدمات کو اِس ضمن میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ سب عبوری دور تھا اور چیزیں پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آرہی تھیں۔ عتیق اللہ نے مگر، اِن رجحانات کو استحکام بخشا اور کلاسیکی شعراء اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ جدید لکھنے والوں پر بھی اس زاویہ تنقید کے ساتھ مضامین قلم بند کیے۔ آج، تقریباً بیس بائیس سال بعد، یہ زاویۂ تنقید اور تھیوری اگر ہمیں اجنبی نہیں محسوس ہوتی اور ہر شخص اِن چیزوں کے حوالے اپنے مضمون میں دیتا پھرتا ہے تو یہ صرف عتیق اللہ کی تحریروں کے باعث اور بدولت ہی ہے۔ ہاں، جملہ معترضہ کے طور پر، ہمارے زمانے کے نوجوان نقّاد، ناصر عباس نیر، مابعد جدید تنقید کا بہت ہی معتبر اور منفرد حوالہ بن کر ابھرے ہیں۔ مگر اُن کا میدان زیادہ تر پوسٹ کلونیزم رہا ہے۔ شافع قدوائی کی تحریروں میں بھی ایک بصیرت اور بالکل نئی روشنی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب اِن مابعد جدید نظریات اور تھیوری کو کوئی شک وشبہے کی نظر سے نہیں دیکھتا مگر اِسی مقام تک پہونچانے میں سب سے بڑا اور بنیادی کام عتیق اللہ نے ہی کیا ہے۔ اُن کی تصانیف میں بیانات، ترجیحات اور تصورات اس سلسلے کی بہت اہم کڑیاں ہیں جن کا ہر مضمون ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے ذہنی افق کو بدل کر رکھ دیتا ہے اور ادبی تھیوری کی آفاقیت ہم پر روشن ہوجاتی ہے۔ نیز، تھیوری اور آئیڈیولوجی کا فرق بھی بہت آسانی کے ساتھ واضح ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں ابھی حال ہی میں اُن کا بہت بڑا کارنامہ تنقید کی ''جمالیات'' ہے، جو چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ اُردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے اور پہلی نظر میں کسی انسان کے بس کا روگ نہیں لگتی۔ اِس گراں مایہ تصنیف میں عتیق اللہ نے مغربی اور مشرقی نظریات کی تمام تاریخ اور اُس کے اصول وضوابط بیان کیے ہیں۔ اِس کتاب کا مطالعہ ہمیں اِس حقیقت سے بھی روشناس کراتا ہے کہ کس طرح کلاسیکی اور جدید تنقید کی شعریات مابعد جدید تنقید سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے، گویا ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی زنجیر ہے جس میں ہماری ادبی تنقیدی روایت بندھی ہوئی ہے۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ عتیق اللہ نے اِس زنجیر کی کسی بھی کڑی کو نظرانداز نہیں کیا۔ ایک سلسلہ ہے، ایک سفر ہے جس کا ہر پڑاؤ ہمارے سامنے ہے۔ اُردو میں اِس نوعیت کے جہادی کام ۔۔۔ بہت کم ہوئے ہیں۔ مثلاً شمس الرحمان فاروقی کی شعرشورانگیز اور شمیم حنفی کی 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' وغیرہ۔

مگر عتیق اللہ کا ذہن سوچنا نہیں چھوڑتا اور ادب وثقافت کے حوالے سے ہر وقت ان کے وجود میں نئی نئی فکری کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں اُن کی ایک نئی تصنیف سامنے آئی ہے جس کا عنوان ـــــ ''مغرب میں تنقید کی روایت' قدیم یونان وروما'' سے دریدا تک ہے۔ اِس کتاب کو بھی اُردو تنقید کی روایت میں ایک اضافہ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟ اِس نوعیت کی کوئی کتاب ہمارے یہاں اِس سے پہلے موجود نہ تھی۔ مغرب میں تنقید کی اِس روایت کا بالتفصیل مطالعہ کرکے، ہمیں اپنی مشرقی شعریات کی روایت اور تنقید کی ایک زبردست فہم حاصل ہوتی ہے۔ عتیق اللہ کی تنقید اپنے ہم عصر تنقید نگاروں سے بے حد مختلف ہے اور اُن کی ترجیحات بھی وہ نہیں ہیں جو دوسروں کی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی روایت اور تنقیدی روایت کو کلّیت میں دیکھا اور سمجھا ہے اور اس سلسلے کو لمۂ موجود سے منسلک کیا ہے۔ یہ اُن کا اِتنا بڑا کارنامہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کہاں تک ذکر کیا جائے۔ ادبی اصلاحات کی وضاحتی فرہنگ جیسی کوئی کتاب بھی اُردو میں نہیں ہے جسے پڑھ کر کم ازکم میں نے تو اِتنا سمجھا جو بڑی بڑی کتابوں سے نہ سمجھ سکا۔

مگر آخر، بات کو اِس مقام سے آگے بھی تو بڑھنا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی شخص اتنا ہی بلند پایہ تخلیق کار بھی ہو۔ مغرب میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، اور ڈی ایچ لارنس یا ہمارے زمانے میں امبرا تیکو اِس کی مثالیں ہیں یا پھر اُردو میں شمس الرحمان فاروقی۔ عام طور سے تنقید اور ٹھوس علمیت تخلیق کا گلا گھونٹنے کا ہی کام کرتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے اور ہماری درس گاہیں اور اُن کے اساتذہ، ہمیشہ نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی تخلیقی حسّیت کا قتلِ عام ہی کرتی آئی ہیں۔ بہت حیرت ہوتی ہے جب ہم عتیق اللہ کو بطور ایک فنکار، ایک سچّے اور جینوئن تخلیق کار کی حیثیت سے پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے کس طرح اپنے آپ کو، اپنے تخلیقی وجود اور تجربے کو مکروہات دنیا سے بچالیا اور اپنی تخلیقات کو، اپنی شاعری کو اِس نام نہاد اکیڈمک دنیا کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ وہ زندگی بھر ـــ یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پروفیسری کرتے رہے، اعلیٰ ترین نقّاد کی حیثیت سے، ساری اُردو دنیا سے اپنا لوہا منواتے رہے مگر

ایسی شاعری بھی کرتے رہے جس تک پہونچتے پہونچتے ہر تنقید کے پر جلنے لگتے ہیں (میرا خیال ہے کہ خود اُن کی تنقید کے بھی)۔

عتیق اللہ نے ستّر کی نصف دہائی میں شاعری شروع کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدید اور علامتی شاعری کا ہمارے یہاں نیا نیا چلن ہوا تھا۔ ظفر اقبال، عادل منصوری اور دیگر شعرا کی لسانی شکست و ریخت کا بہت چرچہ تھا۔ خیال اور موضوع کی سطح پر بھی نئے نئے اسالیب، منظر عام پر آرہے تھے مگر واضح مقبولیت صرف ظفر اقبال اور عادی منصوری اور کمار پاش وغیرہ کے حصے میں ہی آئی تھی۔ شاید 1965 میں عتیق اللہ کی شاعری کا مجموعہ ''ایک سو غزلیں'' منظر عام پر آیا جس نے سب کو چونکا کر رکھ دیا۔ انہوں نے اِس بے باکی اور قوت اعتماد کے ساتھ یہ غزلیں کہی تھیں کہ تمام ناقدین ادب کو اِن کا زبردست نوٹس لینا پڑا۔ کمالِ حیرت کی بات یہ تھی کہ عتیق اللہ کے اُوپر ظفر اقبال وغیرہ کا ہلکا سا پرتو بھی نہ تھا۔ یہ بالکل نئے انداز اور نئے تیور کی شاعری تھی۔ روایتی غزل کے مضامین اور اسلوب میں کس طرح اینٹی غزل کا مدھم چہرہ نظر آتا تھا، یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جدیدیت کے رُجحان کے تحت لکھنے والوں میں عتیق اللہ کا نام شاعری کا بہت مستند اور منفرد حوالہ ہے۔ 2012 میں اُن کی شاعری کا ایک انتخاب بعنوان 'عبارت' شائع ہوا ہے جس میں اُن کی تازہ غزلوں کے ساتھ پرانی غزلیں بھی شامل ہیں۔ ''عبارت'' کا مطالعہ کرکے، ہم ایک ایسی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں ہمارے حواس واعصاب گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عالم ہُو، اور دشت تحیّر کا سا سماں ہے۔ میں اِسی شاعری کو دلدل میں چپّو چلانے کا نام دیتا ہوں۔ اپنے وجود کی دھنستی ہوئی سیاہ دلدل میں اُترنا اور باہر آنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تخلیقی تجربے میں جب اِتنی شدت ہو تو اکثر زبان و بیان تو کیا، زمان و مکان اور ارض و سما تک کے سانچے بکھر کر اور ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور تخلیقی تجربہ کسی مخصوص فارم یا ہیئت میں خود کو پوشیدہ کرنے یا تحلیل ہو جانے سے انکار کر دیتا ہے مگر یہاں تو یہ شاعری اپنے زمان و مکان خود تعمیر کرتی ہے۔ نئے نامانوس زمان و مکان جن تک ہماری رسائی خود ہمارے وجود کی تمام نادیدہ اور پُر اسرار جہات کو روشن کر دیتی ہے۔

جکڑ لیا مجھے مکڑی کے سخت جالے نے
ابھی میں کمرے کی محرابیں چُھو کے پلٹا تھا

بندھے ہوئے ہیں چٹانوں سے دست اور بازو
گلے میں کیل گڑی ہے کہ چیخ بھی نہ سکوں

شگاف کرتا چلا جاؤں اپنے پاؤں تلے
کہیں جگہ نہ ملے تو اِسی میں دھنس جاؤں

یہ جو محفوظ رہا کرتا ہے اندر اندر
اپنے ہاتھوں سے ہی اس شخص کے ٹکڑے کر دو

خود اپنے پر ہی گھنا پیڑ بن کے ٹوٹ گرا
وہ برق رو تھی کہ میں چیخ چیخ جاتا تھا

مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے
بہت دن ہو گئے رویا نہیں تھا

آسماں کی یہ جگہ جو خالی ہے
یہیں کہیں ہمارا بھی ٹھکانہ تھا

دوسروں کی نظر سے دیکھیں گے
دیکھنا کچھ تھا ہم نے دیکھا کچھ

انھیں گھروں سے عبارت ہے اپنی شام جہاں
چراغِ طاق بھی اکثر جلا نہ کرتا تھا

میں چھپا رہوں گا نگاہ و زخم کی اوٹ میں
کسی اور شخص سے دل لگا کے بھی دیکھنا

یہ اشعار بغیر کسی شعوری کوشش کے میں نے درج کر دیے ہیں۔ یہ منتخب اشعار نہیں ہیں۔ میرے لیے عتیق اللہ کی پوری شاعری ہی ایک انتخاب ہے۔ مگر فی الوقت، میں اُن کی شاعری یا تنقید پر کوئی مقالہ لکھنے نہیں جا رہا ہوں۔ یہ میری حیثیت نہیں ہے۔ میں صرف وہ باتیں قلم بند کر رہا ہوں جو فوری طور پر میرے ذہن میں آرہی ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ عتیق اللہ کی شاعری اُن کی معتبر وجودی کرب اور اذیت سے پھوٹ کر باہر آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زخم، چوٹ، خراش، اُن کے یہاں زندہ تصویروں یا پیکروں میں ڈھل کر حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں دکھ، اذیت اور تکلیف ہی نہیں، خوف اور دہشت کی ایسی نمایاں پرتیں بھی نظر آتی ہیں جو بقول ہائیڈیگر ایک معتبر وجودی شناخت سے عبارت ہیں۔ جہاں فرد اپنی تنہائی کے خول میں گرفتار نہیں ہے بلکہ اپنے وجود کی ڈھلان پر شارع عام سے ہٹ کر چلتے ہوئے اپنی منزل کے لیے اپنا الگ راستہ منتخب کرتا ہے۔ وہ وجودی بے چینی اور لایقنیت کو گلے لگاتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے اور اُسے اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ لگاتار لہولہان ہوتا جا رہا ہے۔ کرچی کرچی ہو کر، بکھرتا جا رہا ہے۔ اُسے پروا نہ نہیں ہوتی مگر اس پُر اسرار صورت حال کا سچا شعور ضرور حاصل ہوتا ہے۔ یہی شعور کسی کو شاعر کا منصب بخشتا ہے اور کسی کو صوفی کا یا جوگی کا۔

عتیق اللہ خود کو کرچی کرچی ہوتے دیکھتے ہیں، پھر اِنھیں کرچیوں کو چُن کر، اُن کے اندر چھپے ہوئے لفظ کو اِس طرح باہر نکالتے ہیں جیسے سیپ سے

موتی باہر آتا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر، یہودا امی خائی نے کہیں لکھا ہے کہ ''شاعر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ زبان کو ایسی جگہ لے جائے جہاں وہ پہلے کبھی نہ گئی تھی۔''

عتیق اللہ کی زبان میں جو ایک ہلکا سا کھردرا پن ہے وہ اُنھیں راستوں پر چلنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو زبان کو اُس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں وہ پہلے نہیں گئی تھی۔ ایسے اجنبی راستوں پر چلنے سے خود زبان کے پیر بھی زخمی اور کھردرے ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے ایسا میڈیم تشکیل کیا ہے جو شعوری ترصیع وآرائش کو جگہ ہی نہیں دے سکتا۔ اور یوں دیکھیں تو کُھردرا پن ایک وہم کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مجبور ہیں اور ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہم اِسی مسئلہ کی ایک کڑی ہے۔ میرے خیال میں عتیق اللہ کی شاعری اُردو کی واحد کافکائی شاعری ہے چاہے، اِس حوالے سے میر نیازی کا نام لوگ زیادہ لیتے ہوں۔ عتیق اللہ کی شاعری میں ایسے بہت سے شیڈس ہیں جن کا منیر نیازی کے یہاں دُور دُور، پتہ نہیں ہے، مگر بہرحال وہ ایک الگ داستان ہے۔

چلئے، میں نے نقاد الگ کردیا، شاعر الگ کردیا مگر اِس نابغۂ روزگار کا حق کہاں ادا ہوا؟ عتیق اللہ کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ ایک عمدہ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ اُن کا ایک ڈرامہ ''پیچھے کوئی ہے'' کو نہ صرف اُردو بلکہ کسی بھی زبان کے بہترین ڈراموں کی صنف میں رکھا جاسکتا ہے، فرد اور سماج کی کشمکش تو ایک کلیشے ہے، اُن کے یہاں البسرڈ ڈرامے کی وہ روایت جو سیموئل بیکٹ سے منسوب ہے، اور Drama of Cruelty جو آرتو سے متعلق ہے، دونوں کا ایک حیرت انگیز سنگم پایا جاتا ہے۔

اِس حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو میں، انھوں نے بالکل نئے انداز کی ڈرامہ نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔ کاغذ پر لکھے ہوئے یہ ڈرامے وجود کے اُس جبر اور شدت کے ساتھ..... سامنے آتے ہیں کہ صفحات بجائے خود اسٹیج میں بدل جاتے ہیں۔ جہاں لفظ، روشنی اور آواز، اور کردار اور اُن کی پرچھائیوں میں منقلب ہوجاتے ہیں۔ اَور یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اس پر جتنی بھی حیرت کی جائے کم ہے۔ مگر ابھی ہم نے اِس طرف شاید توجہ نہیں کی ہے اور خود عتیق اللہ اپنی کسی تحریر کی طرف ہماری توجہ مبذول کرنے کے لیے اصرار نہیں کریں گے۔ اُن کی بے نیازی یہ سب کرنے ہی نہیں دے گی۔

میں نے عتیق اللہ کی علمی، تنقیدی اور تخلیقی شخصیت کا ایک خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ میں اِس کوشش میں بُری طرح ناکام ہوا ہوں مگر آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا کیونکہ آپ خود محسوس کریں گے کہ ایسی ہمہ جہت اور نابغۂ روزگار شخصیت کے بارے میں لکھنا واقعی آسان کام نہیں ہے اور خاص طور سے اُس صورت میں جب آپ کو اپنے تئیں بھی ایماندار رہنا ہو ورنہ مضمون تو اِس طرح بھی لکھا جاسکتا ہے جیسے لانڈری کو دیے گئے کپڑوں کی فہرست پر سطریں گھسیٹی جاتی ہیں۔

مگر یہ تو میں نے عتیق اللہ کے بارے میں لکھا ہے جن سے آپ سب بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

آخر، میرے عتیق اللہ صاحب کہاں ہیں؟

یہ سن 2000 کی بات ہے جب شمیم حنفی صاحب کی سفارش پر عتیق اللہ صاحب نے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوشیٹ کی مدت سے خالی پڑی آسامی پر میرا تقرر کیا۔ اُس وقت اُنھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں وہی خالد جاوید ہوں جو افسانہ نگار کے بطور بھی بدنام ہے۔ جب اُن سے میرا تعارف ہوا تو انہوں نے مجھے والہانہ انداز میں گلے لگالیا۔ یقین کیجئے کہ آج تقریباً بیس سال بعد گزر جانے کے بعد بھی، عتیق اللہ صاحب سے میری وہی والہانہ ملاقات چلی آتی ہے۔ میں دہلی یونیورسٹی میں بہت کم عرصے تک رہ سکا۔ آٹھ مہینے بعد ہی، شمیم حنفی صاحب کی بے پایاں عنایات اور کرم کے باسبب میرا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اُردو میں بطور لیکچرار ہوگیا۔ مگر کیا عتیق اللہ صاحب کا تعلق مجھ سے ٹوٹ سکتا تھا۔ میری حالت اُس ڈوبتے ہوئے جہاز کے ملاح کی سی تھی جو اندھیری گھپ رات میں، آسمان پر نمودار کسی ایک ستارے پر نگاہ رکھتا ہے اور اُسی کے سہارے اپنی منزل تلاش کرتا ہے۔ اپنی سمت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عتیق اللہ صاحب میرے لیے اُس ستارے کے مانند تھے اور ہیں۔ اُن کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔ سب سے بڑا احسان تو محبت کا ہوا کرتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے بے حد محبت کا سلوک روا رکھا۔ جب شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوگیا تو جوائن کرنے کا مرحلہ آیا۔ پتہ نہیں، کیوں اُن دنوں میرا بلڈ پریشر بہت ہائی رہنے لگا تھا۔ میں بریلی کالج میں اپنی ملازمت چھوڑ کر دہلی آیا تھا۔ بریلی کالج میں میری حیثیت، فلسفے کے ایک عارضی لیکچرر کی تھی ممکن تھا کہ آگے چل کر یہ مستقل ملازمت میں بدل جاتی اور ریسرچ ایسوشیئیٹ کی پوسٹ بھی بہرحال مستقل نہ تھی بلکہ پانچ سال کے کنٹریکٹ پر ہی تھی۔ اُس سے دو سال پہلے میں سول سروسیز کی گروپ۔ بی کی ملازمت چھوڑنے کی حماقت کر ہی چکا تھا اور کافی خوار ہو چکا تھا۔ شاید میری بے چینی، انتشار اور ہائی بلڈ پریشر کی بنیادی وجوہات یہی رہی ہوں۔ مجھے یہاں ایک بات اور بھی واضح کردینی چاہیے کہ عتیق اللہ صاحب سے متعلق کوئی بھی گفتگو خود اپنے بارے میں بھی بات کرنے جیسی ہوگی۔ اِسی بدمذاقی کے لیے سوائے معافی مانگتے رہنے کے، میرے پاس اور کیا چارہ ہے۔ برسبیل تذکرہ، میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں اپنی اِس پہاڑ جیسی زندگی پر، جن تین لوگوں کے احسانات اپنے سر پر رکھے ہوئے جی رہا ہوں، وہ شمیم حنفی صاحب، شمس الرحمان فاروقی صاحب اور ـــــ عتیق اللہ صاحب کے سوا کوئی نہیں ہیں۔ شمیم حنفی صاحب اور شمس الرحمان فاروقی صاحب کے بارے میں لکھ چکا ہوں مگر یہ کہانی پہلی بار سنا۔

جوائننگ تھی کہ ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ جب جاتا، دہلی یونیورسٹی کے ڈسپنسری کے انچارج ڈاکٹر متّل، میرے ہائی بلڈ پریشر ہونے کی وجہ سے،

جوائننگ رکوادیتے۔ یہ صورت حال نہ صرف میرے لیے بلکہ خود عتیق اللہ صاحب کے لیے بھی خاصی پریشان کُن تھی۔ اُدھر یار لوگوں نے اُردو کے اخباروں میں گمنام خطوط لکھ لکھ کر، میری تقرری کو ہی سوالات کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ایک دن عتیق اللہ صاحب مجھے اپنے گھر لے کر گئے۔ اُس زمانے میں وہ پیتم پورہ کے غالب اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر پر، دوپہر کا بہترین کھانا کھلایا اور اُس کے بعد، نا جانے کیوں، میرے ایک افسانے ''کوبڑ'' پر زور وشور کے ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ یہ افسانہ انھیں دنوں شب خون میں شائع ہوا تھا۔ کھانا کھا لینے کے بعد، اپنی سفید ماروتی کار میں، مجھے لے کر، وہ ڈسپنسری کے لیے روانہ ہوئے۔ کار میں بھی وہ لگاتار مجھ سے کوبڑ کے بارے میں بات کرتے رہے۔ جب ہم ڈسپنسری پہونچے تو مریضوں کی کافی لمبی لائن تھی۔ ہم دونوں باہر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ عتیق اللہ صاحب نے فلسفہ وجودیت اور بیگانگی پر بولنا شروع کیا مگر نفس مضمون میرا افسانہ ہی تھا۔ اب میں بھی کچھ اظہار خیال کرنے لگا۔ میں یہ بھول گیا کہ یہاں میڈیکل چیک اپ کرانے آیا ہوں۔ اِسی درمیان اچانک میرا نام پکار لیا گیا۔

ڈاکٹر متّل نے میرا بلڈ پریشر ناپا۔

-/120/80

دوسری بار ناپا۔

-120/80

ڈاکٹر متّل نے فٹنس لکھ دی۔ میری جوائننگ ہوگئی۔ اُس کے بعد عتیق اللہ صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا کہ اگر آج وہ مجھ سے میرے افسانوں کے بارے میں بات نہ کرتے تو آج بھی بلڈ پریشر ہائی ہی نکلتا۔

''میں آپ کا دھیان بٹا رہا تھا۔ آپ صورت حال کے تئیں بہت Conseious ہو جاتے تھے۔ آپ کے افسانوں کے ذکر نے آپ کے اندر تخلیقی تجربے کی یاد تازہ کر دی اور آپ میڈیکل چیک اپ کے لیے غیر حاضر دماغ ہو گئے۔ دیکھئے خالد جاوید صاحب۔ یہ پروفیسری وغیرہ تو ٹھیک ہے مگر اپنے اندر کے تخلیق کار کو کبھی مرنے نہ دیجئے گا۔ یہی آپ کا سب سے بڑا اعتماد ہے۔''

غور کرنے کا مقام ہے کہ کون کس کے لیے اتنا کرتا ہے، کون کسی کی اتنی زیادہ پرواہ کرتا ہے۔ اپنے سگوں کی بھی نہیں اور پھر میں تو اُن کا کوئی نہ تھا۔ نہ دوست، نہ عزیز اور نہ رشتہ دار۔ میری اُن کی ملاقات کو مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے۔ مگر وہ تو ہمیشہ ہی میری اِتنی پرواہ کرتے رہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُن سے کسی کام کے لیے کہا ہو اور انھوں نے منع کر دیا ہو۔ قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے ہر مقام پر میری مدد کی ہے اور میرے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ مجھے اُن پر ناز ہے۔ سامنے تو تعریف کرنا بہت آسان ہے مگر کسی کے غیاب میں اُس کی تعریف کرنا اور اُس کی موافقت میں بولنا مشکل ہے۔ عتیق اللہ صاحب کا معاملہ تو یہ ہے کہ انھوں نے میرے لیے کئی اشخاص سے جھگڑے مول لے لیے اور ہمیشہ مجھ ناچیز کی معمولی تحریروں کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی اور سب کے سامنے میری عزت افزائی کی۔ میرا قد خود میری نظروں میں اونچا ہو جاتا ہے جب میں اُن سے ملتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ اِس بات کا بہت قلق رہا ہے کہ عتیق اللہ صاحب کی عالمانہ شخصیت اور بلند مرتبے سے حسد اور جلن رکھنے والے لوگوں نے اُن پر بے بنیاد الزام لگائے ہیں۔ میں گواہ ہوں کہ عتیق اللہ صاحب کس قدر خود دار اور بے نیاز واقع ہوئے ہیں۔ پیشہ خرچ کرنا کوئی اُن سے سیکھے، وہ ایک شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر اپنے اُوپر تو ہر کوئی پیسہ خرچ کرتا ہے۔ عتیق اللہ صاحب دوسروں پر بے پناہ خرچ کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کتنے طالب علموں کی معاشی مدد وہ کرتے رہے ہیں اور کبھی زبان پر، اِس سلسلے کا ایک حرف بھی نہ آیا۔ وہ بے حد دریا دل اور رحم دل واقع ہوئے ہیں۔ اِس حوالے سے اُن کے ڈرائیور ''شوا'' کے پاس بہت تفصیلات ہیں۔ ''شوا'' آپ کو بتائے گا کہ عتیق اللہ صاحب کی فطرت کیا ہے اور انھوں نے کیسا سخی دل پایا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ''ہیڈ کلرک'' عتیق اللہ صاحب کے بارے میں اکثر کہا کرتے تھے ''میرا ہیڈ تو بادشاہ ہے'' اُن ہیڈ کلرک صاحب کا نام شاید کوئی شرما تھا۔ اگر شعبہ میں کبھی چائے یا دیگر لوازمات کا کوئی موقع آتا تو مجال ہے کہ کوئی بل کی ادائیگی کرے۔ عتیق اللہ صاحب کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا۔ مگر اب نہ کوئی اِن باتوں کا ذکر کرتا ہے اور جن لوگوں کے اوپر اُن کے بے پناہ احسانات ہیں، وہ بھی کبھی حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب کے تقرر کا معاملہ تھا اور اُن کو انٹرویو لیٹر نہیں مل رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ صاحب تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ ایک دن جب، بے حد بارش ہو رہی تھی بلکہ مہاوٹیں تھیں، گرجتی، کڑکتی بجلیوں اور گرتے ہوئے اولوں میں، عتیق اللہ صاحب، میرے ساتھ انٹرویو لیٹر حاصل کر کے، خود اُن کے گھر گئے اور اُنھیں یہ انٹرویو لیٹر تھمایا۔ دہلی یونیورسٹی سے اُن صاحب کا گھر بہت دور تھا۔ تقریباً تیس کلو میٹر کے فاصلے پر اور بے حد گنجان اور پتلی پتلی گلیوں کے بیچ میں واقع تھا۔ اِن گلیوں میں عتیق اللہ صاحب کی کار نہیں جا سکتی تھی۔ گلیوں، سڑکوں پر خطرناک پھسلن اور کیچڑ تھی۔ بارش اور سردی جسم کا خون جمائے دیتی تھی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ پوری دلّی میں اس دن پاور بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اُن کی پتلون پر کیچڑ کے دھبّے تھے۔ کوٹ بھیگ کر تر ہو گیا تھا اور وہ تھے کہ اِن اندھیری گلیوں میں سنبھل سنبھل کر میرا ہاتھ پکڑے اُن صاحب کے گھر کی طرف بڑھتے ہی جاتے تھے۔

پھر اُن صاحب کا تقرر ہوا، اور صرف عتیق اللہ صاحب کی وجہ سے ہوا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر آج بھی جیسے ٹھہر کر رہ گیا ہے۔ اب تو اِس بات کو زمانہ گزر گیا۔ کون یاد رکھتا ہے۔ خود عتیق اللہ صاحب کو بھی یہ سب یاد نہ ہوگا۔ ویسے بھی ''وہ نیکی کر دریا میں ڈال'' والے محاورے کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

عتیق اللہ صاحب نے بدلے میں کسی سے کبھی کچھ بھی نہ چاہا۔ ایک درویشانہ بے نیازی ہمیشہ سے اُن کا وقف رہی ہے، نہ کسی ایوارڈ کی تمنا، نہ کسی اعزاز واکرام کے لیے کوئی جوڑ توڑ، نہ کسی ستائش کی آرزو اور نہ کسی صلے کی پرواہ،

اُن کا قد، ویسے بھی ہر ایوارڈ سے بڑا ہے، اور یوں تو اُنھیں بہت سے ایوارڈ ملے ہیں مگر خود عتیق اللہ صاحب نے کبھی ان کا ذکر تک نہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایوارڈ معتبر ہو گیا جو عتیق اللہ صاحب تک آیا۔

دراصل عتیق اللہ صاحب کی پوری شخصیت میں ایک نڈر پن، بے باکی اور ایمانداری ہے۔ وہ لاگ لپیٹ میں بات کرنے کے عادی ہی نہیں ہے۔ تخلیقی ذہانت اور علم دوستی کی روشنی میں وہ ہمیشہ نہائے رہتے ہیں۔ اِس لیے جہالت کے اندھیروں میں اپنا راستہ تلاش کرنے میں اُنھیں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ انھوں نے جس پر بھی لکھا، بغیر کسی مصلحت کے لکھا اور کبھی یہ پرواہ نہیں کی کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز پر لکھا اور ضمیر کی اِس آواز کی گونج میں، اُن کے لیے، دنیا داری، مصلحت کوشی، اقربا پروری اور جھوٹ اور ریاکاری کی ساری آوازیں دب کر رہ گئیں۔ عتیق اللہ صاحب نے اِن آوازوں کو سنا ہی نہیں، یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ ظاہری اعتبار سے بھی بہت پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ مگر اُن کا یہ ظاہر، اُن کے باطن نے بنایا ہے۔ علم کا ایک سمندر اُن کے اندر ٹھاٹیں مارتا ہے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ وہ جس موضوع پر بات کرتے ہیں، اُسے روشن کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ساری گتھیاں سلجھا کر رکھ دیتے ہیں۔ ادب، فلسفہ، نفسیات، معاشیات اور سیاسیات، کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر انھیں دسترس نہ حاصل ہو یا وہ اُس پر بے تکان گفتگو نہ کر سکے ہوں اور دوسرے تو سوائے گنگ ہو کر سننے کے اور کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ سراپا محبت اور اخلاص کا مجسمہ، عتیق اللہ صاحب دراصل ایک ہپناٹائز کر دینے والی قوت کے مالک محسوس ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی جب اُنھیں پی ایچ ڈی کے اسکالر کا وائیوا لیتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی موضوع ہو، وہ اُس کی تمام پوشیدہ جہات سامنے لے آتے ہیں اور مقالے میں کوئی نہ کوئی اضافہ ضرور کر دیتے ہیں۔ اُس وقت بھی مجھے ہمیشہ اپنی کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے علم کے ایک بڑے دریا نے، اچانک آ کر، ہم جیسی چھوٹی چھوٹی ندیوں کو شکار کر دیا ہو۔

مجھے نہ صرف عتیق اللہ صاحب بلکہ اُن کے گھر کے تمام افراد کی محبت اور شفقت حاصل ہے جس پر مجھے فخر ہے۔ فریدہ بھابی کا سلوک ہمیشہ میرے تئیں ایک بڑی بہن کا رہا ہے۔ اُن کا اکلوتا بیٹا شبیہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اب تو ماشااللہ بہت بڑا ڈاکٹر بن گیا ہے مگر مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب شبیہ صاحب نکر پہنا کرتے تھے اور میری جیب میں سے.....چاکلیٹ نکال کر کھایا کرتے تھے۔

مجھے جب بھی کتابوں کی باتیں کرنا ہوتی ہیں، میں عتیق اللہ صاحب کے گھ چلا جاتا ہوں۔ مجھے معلوم رہتا ہے کہ اُن کے گھر پر، ذہنی اور جسمانی دونوں غذائیں میرے لیے وافر مقدار میں موجود ہوں گی۔ میں اکثر، تب بھی ان سے ملنے جاتا ہوں جب ایک بے نام سی اُداسی کا دورہ میرا اُوپر پڑتا ہے۔ میرے والد اور میری پھوپی کے سانحہ انتقال پر عتیق اللہ صاحب نے جس طرح میری دلجوئی کی، میرا حوصلہ بڑھایا اور میرے غم کو سمجھا، اُسی طرح کوئی نہ کر سکا۔ دراصل وہ میری تنہا روح کو سمجھتے ہیں اور ہر طرح سے اِس تنہائی میں شریک رہتے ہیں۔ ہر بُرے وقت میں انھوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔

عتیق اللہ صاحب ایک معتبر وجودی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اپنے زخموں پر مسکرانے کے عادی ہو چکے ہیں۔.....

مگر میں..... میں تو اُن کے لیے کبھی کچھ نہ کر سکا۔ انھوں نے کبھی مجھے اپنی خدمت کا موقع ہی نہ دیا۔ میں تو بس اُن کے ہر سلوک کے سامنے شرمندہ ہی رہا۔ اب یہی دیکھئے کہ میں اُن کے بارے میں کچھ لکھ بھی نہ سکا۔ اُن کے بارے میں ڈھنگ سے کچھ لکھنا میرے بس میں نہیں ہے۔ زبان ہی میرا ساتھ نہیں دیتی ہے، میں کیا کروں، مجھے پتہ نہیں کیا، کیا اور لکھنا چاہیے تھا، مگر عتیق اللہ صاحب جیسے دیوزاد، بھلا میری زبان کی گرفت میں آتے ہیں!

اب ایک طرف تو عتیق اللہ ہیں جن کو سب جانتے ہیں اور دوسری طرف ''میرے اپنے عتیق اللہ صاحب'' ہیں۔ میں اِن دونوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ مجھے یہیں کھڑے رہنے دیجئے۔ میں یہاں سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتا۔''

کوئی زمیں تو ہوگی تری زمینوں پر
''ہمارے جیسا کوئی نقش پا نہیں ہوگا''

(عتیق اللہ)

- بقیہ -

اردو کا خوش پوش ناقد

گفتاری اور خوش پوشی میں پچیس تیس سال کی عمر کو تجاوز نہیں کر پائے ہیں۔ اردو میں ایسے خوش پوش اور نستعلیق ادیب وہ بھی نقاد کم نظر آئیں گے کیونکہ محقق اور ناقد اپنی تحقیق اور تنقید کو مستند ثابت کرنے کے لیے کم عمری میں بھی بزرگانہ حلیہ اور اطوار دکھانے کی کوشش کرتا ہے تا کہ اس کے بیان کو کوئی طفلانہ نہ سمجھے۔ صحت مند ادب تخلیق کرنے کے لیے صحت مند ماحول اور صحت مند فکر ضروری ہے جو پروفیسر عتیق اللہ کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کی نستعلیقیت ان کی پوری زندگی پر حاوی ہے، ان کے لباس پر شکن اور گھر میں تنکا نظر نہیں آتا البتہ دسترخوان پر سمرقند و بخارا کے علاوہ افغانستان اور ہندوستان بھی دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے وہ شاہ دل بھی ہیں اور شاہ خرچ بھی، اس لیے ان کے دوست زیادہ ہیں دشمنوں کا مجھے علم نہیں۔ جنھوں نے پروفیسر عتیق اللہ کو نہیں دیکھا وہ دیکھ لیں اور نہیں ملے ہیں تو ملاقات کر لیں تا کہ میرے بیانات کی تصدیق ہو سکے۔ اس لیے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں سچ کہتا ہوں سچ کے سوا کچھ اور کہنے کی کوشش نہیں کرتا۔

شعری سفر کی ثقافتی جہتیں

ڈاکٹر انتخاب حمید خان
(اورنگ آباد)

عتیق اللہ دُنیائے ادب میں تنقید و تخلیق کے تعلق سے ایک ایسا نام ہے جو کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ شاعری اور تنقید' ہر دو میدان میں' عتیق اللہ نے اپنے آپ کو فرسودہ روایات اور ادارہ بند نظریات سے دو چند دور رکھا ہے۔ وہ کسی طرز یا رویئے کو فیشن یا مسلک کے طور پر اپنائے جانے پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ عمل ناگزیر صورتوں میں رونما ہونے والے تغیرات کا ہمرکاب ہو سکتا ہے، نہ ان سے مطابقت کا کوئی اِمکان روا رکھتا ہے اور اسی لیے حقیقی تخلیق کے لیے مہمیز ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ تاہم صحت مند ادبی روایات اور ان کی توسیع کے تئیں عتیق اللہ کی مساعی واضح نظر آتی ہیں۔ شاعری میں بساط بھر نئی زمینیں، نئی بحریں خلق کی ہیں، نئی لفظیات' نئے استعارات و علائم وضع کیے ہیں۔ جدید ترین موضوعات اور حساس ترین مسائل کو تازہ کار لہجے میں نظم کیا ہے۔ بحیثیتِ نقاد بھی ان کے یہاں قابلِ قدر وسعت و گہرائی نظر آتی ہے۔ جدید اور مابعد جدید تھیوری اور نظریہ سازی کی تہہ داریوں' ان کے اسرار و رموز' ان کی پیچیدگیوں' ان کے دانشورانہ کرّ و فر سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کی تخلیق اور تنقید میں ان اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔

عتیق اللہ کا ویژن ان کے عہد کا زائدہ ہے۔ ان کا تخلیقی شعور' تجاوز اور ماورائیت کی گنجائشوں کے باوجود' اپنے زمان و مکان کو محیط ہے۔ اس کی تشکیل میں ایک طرف تخلیق کار کی انفرادیت' اس کی قوتِ ارادی' قوتِ ادراک' ادراک کی حِسّاسیت کلیدی کردار ادا کرتے ہیں تو دوسری طرف حقائق کا جبر' معاشی و معاشرتی حالات' ثقافتی تغیرات اور دانشورانہ رویے اس کے لیے محرکات کا حکم رکھتے ہیں۔ تخلیق کا انگُر اپنی عصریت اور ارضیت کی کوکھ سے پھوٹتا ہے اور مختلف مراحل سے گزرتا ہوا اپنی آخری شکل کو پہنچتا ہے، ہم عصریت اور ارضیت نہ صرف تخلیقی شعور کے رویوں کا تعین کرتی ہے بلکہ وہ ہیئت اور وسائلِ اظہار کے تعین میں بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نارتھراپ فرائی کہتا ہے کہ اس دور میں رزمیہ/مہاکاویہ نہیں لکھے جا سکتے کیونکہ اس صِنف کے لیے Theosophic society تھیو صوفیانہ معاشرہ درکار ہے اور معاصر ثقافتی تناظر اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔

عتیق اللہ کی تخلیقی رو اپنے عصر سے واضح مطابقت رکھتی ہے۔ وہ جدید شاعروں کی دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو شاعری میں جدیدیت اُس وقت بھی پورے شد و مد کے ساتھ رواں دواں تھی، تاہم متشدّد تجربات اور تجریدیت کو قدرے قرار آ چکا تھا۔ مغرب کے زیرِ اثر اُردو ادب میں جدیدیت استقامت ضرور حاصل کر چکی تھی لیکن مابعد جدیدیت کے خدوخال یہاں کے ادبی اور دانشورانہ مخاطبات میں اس طرح سے واضح نہیں ہو سکے تھے جس طرح وہ مغرب میں تھیوری، نظریات اور ثقافتی تغیرات کے تحت متشکل ہو چکے تھے۔ در اصل مغرب میں مابعد جدیدیت بیسویں صدی کے دوسرے نصف ہی سے اپنی جڑیں استوار کرنا شروع کر چکی تھی اور 1980 تک وہاں اس کا غلبہ مانند پڑنے لگا تھا۔ لیکن برصغیر کے ادب میں جدیدیت مختلف رویوں کے تحت ہنوز اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ چنانچہ تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی حالات، ثقافتی تغیرات، سائنس و ٹیکنالوجی کی ترجیحات جو اس دور کے شناختی نشانات ہیں عتیق اللہ کی شاعری کا پیش و پس منظر فراہم کرتے ہیں۔

☆

عتیق اللہ کے ابتدائی کلام کے بیشتر موضوعات بھی اپنے قریب تر پیش روؤں ہمعصر شعراء سے یکسر مختلف نہیں ہیں لیکن اس تعمیم کو قدر شناسی کا کلیہ یا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ہر متن، دوسرے متن کی بازگشت یا بین المتونیت کے باجود، فی نفسہٖ خود مکتفی اور خودکار ہوتا ہے اور اس کا جوہر اپنی قدر شناسی کے لیے موضوعات کے علاوہ لسانی امکانات' ہیئتی حسن اور معنوی گنجائشوں کے خلاقانہ تصرف کا تقاضہ بھی کرتا ہے کہ متن کی یہی وہ مضمرات ہیں جو شعری حُسن اور شاعر کے تشخص کا تعین بھی کرتے ہیں۔ شعری زبان اپنے اندر وہ رازہائے سربستہ رکھتی ہے جو تکثیریت کے توسط سے معنی کے نئے نئے جہان آباد کرتے ہیں، نئے رنگ و آہنگ کے امکانات بہم پہنچاتے ہیں۔ زبان' ہیئت' شخصیت اور معاشرہ ہم آہنگ ہوں تو شعر کی تاثراتی اکائی اپنا سحر ضرور دِکھلاتی ہے۔ مادیت پرستی' انتشار و اخلاقی بحران' انسانی عظمتوں اور اعلیٰ اقدار کی پامالی' رشتوں کا انہدام' اجنبیت' روح فرسا تنہائی جدید سماج کے امتیازی نشانات ہیں۔ Herbert Marcuse (ہربرٹ مارکوز) اس معاشرہ کے زائیدہ انسان کو ''یک بُعدی'' قرار دیتا ہے۔ Erich Fromme کے مطابق یہ معاشرہ حواس باختہ معاشرہ ہے اور David Riesmon اسے تنہا بھیڑ سے موسوم کرتا ہے، مزید برآں سائنس اور ٹیکنالوجی نے آج کے انسان کو ایک رُوبوٹ کی شکل دیدی' محبت و انسیت' دوستی و رواداری' ایثار و قربانی کے جذبات سے یکسر عاری۔ ایک مشین یا پھر اس کا کوئی کل پرزہ۔ اس سماج' انسان اور اس کے رویّوں کی شعری تصویر ملاحظہ فرمائیں:

شہر شیشہ کی طرح اپنا بھرم رکھتا ہے
ایک پتھر کسی جانب سے گرایا جائے
شوکیس میں سجائیں، نمائش میں بھی رکھیں
انساں نہیں تو، کوئی تو انسان سا لگے
جب گھر سے نکل آئے باہر، آسیب زدہ ماحول مِلا
کچھ ننگے دھڑ، بے دست و پا، کچھ شعلہ صفت، چہرہ غائب
اُسی نے ظلمتیں پھیلا رکھی ہیں
اساسِ خواب پر جس کو رکھا تھا

عہدِ رواں کا معاشرہ اخلاقی بے راہ روی و بحران کا شکار ہے۔ ظاہر ہے اس لایعنیت کی شعری عبارت نئی لفظیات اور نئے پیرایۂ اظہار کا تقاضہ کرتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں تخلیق کار عموماً naturalistic طرزِ تحریر کو ترجیح دیتے ہیں۔ عتیق اللہ کا ویژن بنیادی طور پر آزاردہ وژن Tortured Vision ہے۔ آج کے انسان کے چہرے پر چڑھے ہوئے مکھوٹے، اس کا سوانگ اور ریا کاری حساس ذہن کے لیے بڑے اذیت ناک تجربے ہیں۔ یہ انسان اپنی عظمتوں اور اپنے اشرف المخلوقات جیسے اعلیٰ مرتبے کو یکسر نظر انداز کر کے اپنی مقصد براری کے لیے کسی بھی حد تک گر سکتا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتا ہوا یہ انسان اور آج کا یہ دورِ قمر و مریخ!

برصغیر کا یہ لغویت آمیز معاشرہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے اس absurd معاشرہ سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے جس کی تصویر کشی سیموئیل بیکیٹ، کامیو، سارتر، کافکا اور یوجین آئی نسکو اور دیگر کئی ادیبوں اور سماجی ماہرین نے اپنی تخلیقات اور نگارشات میں بڑے مؤثر طریقہ سے کی ہیں۔ عتیق اللہ کی شاعری عہدِ رواں کے انسان کی مختلف النوع کیفیات، اس کے مختلف زاویوں poses، اس کے بھاؤ سبھاؤ postures، اس کی حرکات و سکنات کی شعری آرٹ گیلری ہے۔ ہر شعر اس کی ایک عجیب ہیئت، ایک نئی شکل تراشتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص اپنی تہذیب و معاشرت کا زائدہ و پروردہ ہے اور اپنے عہد کی علامت و استعارہ بھی۔ یہ شخص کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے، نہ لائقِ تحسین بشر، وہ کہیں مجہول ہے، کہیں مضحکہ خیز اور کہیں خالص لطیفہ۔ اس کے ہونے کے واقعہ کا شعری بیان ایک نئے اسلوب، نئی امیجری، نئی تلفیظ کا متقاضی ہے۔ Low mimetic mode 'جانوروں اور حشرات الارض کی علامات و استعارات ہی اس بیان میں اثر انگیزی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس معنی میں عتیق اللہ نے مروجہ شعری محاورہ کو توڑ کر نیا شعری محاورہ خلق کیا ہے:

کاکروچوں مکڑیوں کی فصل آ کر تو بھی دیکھ
عمر بھر دیکھا جو میں نے وہ گھڑی بھر تو بھی دیکھ
منحنی گردن میں پاؤں ڈال کر
کینچوؤں کی بھیڑ میں میں بھی تو تھا
جو کوب پیٹھ پر اُگ آئی ہے تراش اِسے
جو سینگ سر پہ نکل آئے اُن کو چھانٹ ذرا
اب خدا کی برکتوں کے دِن گئے
آدمی پھر اِک لطیفہ بن گیا
چیختا، چلاتا، خود کو کاٹتا
شہر ہے یا اِک سگِ پا 'سوختہ'
کارٹونوں کی طرح لوگ نظر آتے ہیں
آدمی دوسرا جادو سے بنائے کوئی

عتیق اللہ نے اپنے شعری سفر کی ابتداء جدیدیوں کے ساتھ ضرور کی تاہم وہ صرف جدیدیت ہی تک محدود نہیں رہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے خطوط ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے تشکیلی عناصر ان کی شاعری اور تنقید دونوں ہی میں نمایاں ہیں۔ ان کے غالب موضوعات میں تاریخی جبر، ظلم و استبداد، عصبیت، نسلی افتراق، حالیہ فسادات اور غالب طبقہ کے منفی رویئے انہیں آج کے عالمی ادب میں راہ پانے والے ڈسکورسیز سے قریب تر کرتے ہیں۔ تاریخ و سرحد کے مشمولات عالمی سطح پر تخلیق کیے جانے والے مخاطبات (discourses) کا خاصہ ہیں۔ گلوریا انزالدوا، اگامبین اور فوکو جیسے دانشوروں نے اس پر ہمہ جہتی تبصرے اور مخاطبات خلق کئے ہیں۔ درج ذیل اشعار انسان اور انسان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج و عصبیت کا اعلامیہ ہیں:

زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں
کہ ایک شخص ادھر سے ادھر نہیں جاتا
ڈیرے جما لیے تھے چڑیلوں نے در بدر
کیا کرتا میں بھی اونچے درختوں پہ چڑھ گیا

یہ دونوں اشعار سعادت حسن منٹو کے افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے منسوب توجیہات کے شعری بیان ہیں جو اپنے محذوفات میں سفاک سیاسی خودمرکوزیت اور جارحیت Jingoism کی چیرہ دستیوں پر سخت تنقید بھی ہیں۔

عتیق اللہ کی شاعری کا نقطۂ ارتکاز عرفانِ ذات کی کوشش ناتمام کو محیط ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس میں پُر وقار طریقۂ حیات اور آسودگیٔ قلب و نظر ایک دیوانے کے خواب کے مماثل ہیں۔ جہاں ضمیر، ایمان، خلوص و محبت 'اشیائے' جا چکے ہیں۔ جہاں نہ پیروں تلے زمین ہے، نہ 'خدا کی نرم چھاؤں' ہے نہ سروں پر آسمان، آسمان جیسی ہتھیلی، جہاں رفاقتیں، اذیتیں ہیں، اور محبتیں، عذاب۔ جہاں استحصال کی حکمرانی اور حرص و ہوس کی فراوانی ہے۔ ذکی الحس کے لیے اس تحت الثریٰ سے مفر بھی ممکن نہیں۔ اس معاشرہ کا فرد آر، ڈی ینگ کے الفاظ میں انتشار پیز ذات Fragmented Self ہی ہوگا۔ ٹوٹتی، بکھرتی، پاش پاش ہوتی ہوئی ذات۔ ان اشعار کا اندازِ تکلم اور راست بیانی ملاحظہ فرمائیں:

میں کسی چیخ کا اَنکر تھا کہ اِس جنگل میں
جس جگہ پھوٹ کے نکلا ہوں وہیں شور ہوا
ایک نشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں خود سے
اپنے نزدیک بھی مشکل سے نظر آتا ہوں
میری نا رَسائیوں کی حد ہے یہ
اپنے سامنے سے آرہا ہوں میں
میں آ گیا تھا خود اپنے ہی پاؤں کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر

اس دَور کی ترشی اور تلخی کچھ اس طرح سے وجودِ ذات میں سرایت کر چکی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا جسم میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی، صرف تیزاب ہی تیزاب ہے جو رگ و پے میں گردش کر رہا ہے۔ یا پھر وہ کوئی الف لیلوی دُنیا کا باسی ہے جسے ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کرنے والی سزائیں سنا دی گئیں ہیں۔ درجِ ذیل اشعار کی تلفیظ' جدت اور آہنگ کی ندرت دیکھیے گا:

کہیں کہیں سے اگر جِلد کو ذرا چھیلیں
اُبل پڑیں کئی تیزاب سے بھری جھیلیں
یہ جسم ہے کہ کوئی شہرِ الف لیلیٰ ہے
ہر ایک سمت جہاں گاڑھ دی گئیں کیلیں
بندھے ہوئے ہیں چٹانوں سے دست اور بازو
گلے میں کیل گڑی ہے کہ چیخ بھی نہ سکوں
دیکھ نظارہ اس کو کہتے ہیں
پاؤں پہ سِل ہے، زیرِپا ہوں میں
میں ایک کانچ کا پر تولتا پرندہ تھا
اُڑان بھر نہ سکا اور چھن سے ٹوٹ گیا

عتیق اللہ کے یہاں تصورِ ذات بیک وقت نہایت (deceptive) فریب کار حقیقت بھی ہے اور استعارہ بھی۔ وہ بے بضاعتی و بے بسی کی مظہر بھی ہے اور تضحیک و تمسخر کا ہدف بھی، اپنی تحقیر و تذلیل پر زہر خندہ بھی ہے لیکن وہ سادیت پسند ہرگز نہیں ہے، کیونکہ سادیت پسندی ایک مرض ہے جس میں مبتلا کوئی شخص اپنے آپ کو اذیت پہنچا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ عتیق اللہ کے یہاں اس قبیل کے بہتیرے اشعار ملیں گے جن میں اپنی ذات کو ہدف بنایا گیا ہے۔ یہ اشعار ہدفِ ذات، تذلیل و تضحیکِ ذات کے معنی کی ایک سطح پر، مظہر ضرور ہیں اور سادیت پسندی کا مغالطہ بھی پیدا کرتے ہیں لیکن عتیق اللہ کے یہاں یہ عمل ایک شعوری اور شدید نوعیت کا ردِعمل ہے۔ چونکہ شاعر/فرد/ ذات دورِ حاضر کے نظامِ حیات اور بے حِس و جابر معاشرہ کے بالمقابل بے بس و لاچار ہے، چونکہ وہ اس کو بدلنے کی استعداد رکھتا ہے اور نہ ہی اس قدر تاب و توانائی کہ ذہنی اور روحانی دیوالیہ پن کے حامل اس معاشرہ کو تہہ و بالا کر دے، اس لیے یا تو وہ اپنی بے بسی کے تئیں مجبور ہو کر اپنے اندر مراجعت کرتا ہے یا پھر اپنی ہیئت کذائی کے توسط سے معاشرہ کی چیرہ دستی، بے حِسی یا بے ضمیری پر کڑا وار کرتا ہے۔ یہاں مراجعت بھی ایک critique یا طرزِ مکافات کی دوسری شکل ہے۔ اسی لیے عتیق اللہ کے یہاں فنطاسیہ نہایت فطری اور غیر شعوری طور پر دَر آتا ہے۔ یہ کوئی تراشیدہ، کشیدہ یا اوپر سے چسپاں کیا گیا طرزِ تخلیق ہے نہ تصنع آمیز طرزِ اظہار۔ در اصل یہ عتیق اللہ کی شعری انفرادیت اور ان کے ویژن کے اذیت ناک پہلوؤں سے واضح مطابقت رکھتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کے یہاں فنطاسیائی تلفیظ کو محض نئی لفظیات اور محض نئے پیکروں پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ علائم و استعارے ایک مخصوص محسوساتی فضاء تشکیل کرتے ہیں جو ان کے آزاردِہ Tortured Vision کے تخلیقی محرکات ہیں۔ ان کے کلام کا جوہر ایک نامانوس دُنیا کی تلاش ایک نئے رومانوی اندازِ فکر کو درج کرواتا ہے۔

☆

جذبہ انگیزی اُردو شاعری اور خصوصاً اُردو غزل کا بنیادی تقاضہ ہے، عتیق اللہ کے یہاں محسوسات کو خیال میں منقلب کرنے اور خیال کو فکر اور فکر کو شعری قالب میں ڈھالنے کی سعی نظر آتی ہے۔ ان کے شعر کے حوالہ جاتی تناظر اور معنوی تکثیریت عصریت مرکوز ہیں۔ تمام خارجی محرکات، واقعات و حادثات کا اثر پُر پیچ مراحل سے گذر کر شدتِ احساس اور وارداتِ قلبی کی شکل میں ان کے شعری متن کی تشکیل و تہذیب کرتا ہے جو اپنے عصر سے ہوتے ہوئے ان کی انا بردوش ذات/شخصیت تک اور ذات سے ہوتے ہوئے پھر اپنے عصر کو منعکس کرتا ہے یا پھر اس کے برعکس۔ اس طرح عتیق اللہ کا شعر اپنے عہد میں زندگی کو سمجھنے اور زندگی کرنے کے عمل سے عبارت ہے۔ خوف و ہراس کا یہ عالم اپنے وقت کی لرزہ خیز تصویر ہے:

زمیں پہ آگ لگی ہے میں اُلٹا لٹکا ہوں
کوئی درخت سے مجھ کو اُتارتا بھی نہیں
کبھی گلو، کبھی خنجر مجھے دکھائی دیا
یہ ایک خواب ہی اکثر مجھے دِکھائی دیا
رسّی لٹک رہی ہے گلے کو نہ بھینچ لے
خنجر چمک رہا ہے، بدن میں اُتر نہ جائے
منہ پھاڑتی ہیں گھر کی دراڑیں اِدھر اُدھر
ایک قہقہہ کہ جیسے فضاء میں بکھر نہ جائے

تشکیک و تردد کا رویہ عتیق اللہ کی شاعری کا قابلِ ذکر نشان ہے، عصریت سے تطابق کے پیشِ نظر جو شعری التزام کو اعتبار اور استعاراتی امکانات کو حقیقتِ حال سے قریب تر کرتا ہے۔ عتیق اللہ کے شعر کا تشکیکی رویہ دراصل ایقان کے فقدان کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایقان و استحکام کی جستجو کا اشاریہ بھی ہے کہ یہی جستجو بے جہتی کو ایک خاص جہت اور بے بضاعتی کو قوت و توانائی عطا کر سکتی ہے۔ داخلی بیقراریاں اس نہج پر شدید نوعیت کے تخلیقی محرکات فراہم کرتی ہیں:

خوف آتا ہے قدم رکھتے ہوئے پانی میں
اتنا پیاسا نہ ہو پی جائے یہ دریا مجھ کو
اِک اور گمان نے سایہ سا مجھ پہ تان دِیا
اِک اور گمان کی زد میں جب آنے والا تھا
یقیں کی کترنیں جیبوں میں چھاٹ کر بھر لیں
قدم قدم پہ اِک اندھا سراب تھا آگے

کیسا یقیں، یقین ہے خود ایک التباس
اپنے وجود، اپنے انا پر ہے شک مجھے

قرار وشکیب کی کوئی صورت نہیں، خوف وہراس ہیں کہ اپنا شکنجہ سخت ترکیے جارہے ہیں۔ دُنیائے ادب میں جنس/لمس کو روح فرسا حقائق کے بالمقابل ایک معتبر Props کے طور پر برتا گیا ہے۔ عتیق اللہ نے بھی لمس کے موضوع پر بڑے خوبصورت اشعار کہے ہیں لیکن صد حیف کہ لمس کا یہ فرحت بخش عمل بھی دانشورانہ مباحث یا عصری طرزِ فکر کی بھینٹ چڑھ گیا، اس قابل ہی نہیں رہا کہ مہین ومخملی لمحات کو جاوداں کر سکے۔ یا پھر یہ کہ جن سے خستگی کی داد پانے کی توقعات وابستہ تھیں، وہ 'ان' سے بھی زیادہ خستہ تیغِ ستم نکلے:

چھوا ہی تھا کہ فضاء میں بکھر کے پھیل گیا
مری ہی طرح دھوئیں کی لکیر تھا وہ بھی

لمس کی شدتیں محفوظ کہاں رہتی ہیں
جب وہ آتا ہے کئی فاصلے کر جاتا ہے

زہر اب اپنے حصہ میں جتنا تھا پی گئے
اس نے چھوا تو اس کا بھی کچھ زہر آ گیا

اذیتوں کے ہنر سے وہ باخبر ہے بہت
روانہ ہونے سے پہلے گلے لگاتا ہے

توڑ لے اپنے سبھی لمس کے رشتے مجھ سے
تاکہ محسوس نہ ہو عمر بہت لمبی ہے

لبوں سے گنگناؤں میں ترے مساموں کو
وہ رن پڑے کہ تری جلد سے چپک جاؤں

عتیق اللہ کا شعر اپنے قاری کی فہم وبصیرت پر اعتماد ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے 'ان کہا' ان کے شعر کی بین السطور میں جہانِ معنیٰ آباد رکھتا ہے۔ تخیل اور تفکر کی interchangibility قاری کے ذوقِ تجسس کو متحرک اور متن کو تکثیریت مہیا کرتی ہے۔ ان کا شعر یکے بعد دیگرے کئی سوالات کھڑے کرتا جاتا ہے۔ عتیق اللہ کے یہاں تخیل اور تفکر کے درمیان حدِ فاصل تحلیل ہونے لگتی ہے۔

اکثر ان کے سِرے متصوفانہ حدوں سے جا ملتے ہیں۔ ماورائیت کا یہ احساس، سریت کا یہ تجربہ ہمیں ایک ایسی دنیا کا تصور پیش کرتا ہے جو انتہائی نامانوس ہیں لیکن اندر ہی اندر ہم خود بھی اس کے سراغ میں رہتے ہیں۔ عتیق اللہ کا مرغوب استعارہ آسمان ہے جو ہمیشہ ہمارے لیے ایک جادو کا حکم رکھتا ہے:

میں ایک شب کتنی راتیں جاگا، وہ ماہ بیتے کہ سال گزرے
پہاڑ سا وقت کاٹتا ہوں، شمار کرتا ہوں ساعتوں میں

وہ آسمان ملا سر پہ سایہ کر نہ سکا
وہ سرزمین ملی جس پہ پاؤں دھر نہ سکے

فلک پہ اپنا بسیرا تھا اور ہم اکثر
فلک کے آخری کونے پہ جا نکلتے تھے

آسماں کی یہ جگہ جو خالی ہے
یہیں کہیں ہمارا بھی ٹھکانہ تھا

اب ہمارے سروں پہ رکھ بھی دے
ایک ہتھیلی کہ آسماں جیسی

وہ چاند تارِ گریباں میں جا کے اٹکا ہے
تمام آسماں دامن میں بھر نہیں جاتا

آسمان ایک اور چاہیے
کہیں سے ایک اور آسماں لا

اور پھر بالخصوص یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ

اس شعر کا جمالیاتی حسن اور تفکراتی تناظر ایک عمومی لفظ، ایک اشارتی اسم ''کچھ'' کے تفاعل میں پنہاں ہے۔ آسمان یہاں روایتی جبر وجفا کی علامت نہیں ہے۔ آسمان عتیق اللہ کے یہاں ایک غالب استعارہ ہے جو اپنے وسیع تر مفہوم میں اونچائیوں، سچائیوں، تقدس، ضمیر اور ذمہ داریوں کے شدید احساس وعمل کے انسلاکات بہم پہنچاتا ہے۔ اور کہیں یہ استعارہ شاعر کی ذات، اس کی وابستگی اور زندگی کے تئیں اس کے پُرخلوص رویے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اشارتی اسم ('کچھ') نہ صرف شعر کے لہجے کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ معنوی جہتوں کے تہذیبی مشمولات کی توضیح وتشریح کا جواز بھی فراہم کرتا ہے۔ 'کچھ' ایک معنیٰ میں یاس وحرماں نصیبی کا حسرت انگیز اشاریہ ہے اور دوسرے معنیٰ میں انسان کی کم مائیگی کا کہ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ اشرف المخلوقات کے خطاب کے منافی ہے۔ اس کی تشکیل وتعمیر میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ صفاتِ جمیلہ تو کہیں گم ہو گئیں اور صفاتِ رذیلہ اور سفلہ پروری کا غلبہ ہے۔ اس کے رویے میں جو کجی ہے، جو منفی میلانات ہیں وہ روزِ ازل ہی سے موجود ہیں اور جن کی اصلاح یا بازتعمیر کے امکانات ہی گویا معدوم ہوں۔ ایک اور معنیٰ میں یہ شعر انسان اور اس کی تعقل پسندی کو ایک چیلنج بھی ہے۔ درج بالا شعر ذیل کے شعر کے لیے پیش سایہ افگنی Foreshadowing کا کام کرتا ہے:

مجھ میں خود میری عدم موجودگی شامل رہی
ورنہ اس ماحول میں جینا بہت دشوار تھا

☆

ذات کی پیچیدگیوں اور پنہائیوں کے علاوہ عتیق اللہ کے یہاں گجرات ہے، بھاگلپور ہے، ہجرت ہے، تاریخ کا جبر ہے، بے زمینی کے صدمات، بے بسی وخدشات ہیں۔ جلتے ہوئے مکانوں کی جھلسا دینے والی تپش بھی ہے جو اس دَور کے انسان کی سفاکی وسنگدلی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ہر طرف سناٹے

چنگھاڑتے ہیں، دہشت وخوف کے عفریت مظلوموں کی ہڈیاں چباتے ہیں۔سولہ اشعار پر مشتمل یہ غزل اسی ذہنی کیفیت اور روح فرسا حقائق کی مؤثر ترجمان ہے:

یہ چیخیں کب سنیں تھیں اس سے پہلے
یہ منظر پہلے بھی دیکھا کہاں تھا
اکھڑتے جارہے تھے سارے خیمے
ہوا پرزور کچھ اپنا کہاں تھا
اذانوں میں بھی یہ لرزش کہاں تھی
نمازوں میں بھی یہ دھڑکا کہاں تھا
نہیں تھا پہلے یہ گجرات ایسا
یہ بھاگلپور بھی ایسا کہاں تھا
نکل آئے تھے ننگے سر گھروں سے
یہ سوچا بھی نہیں جانا کہاں تھا
کہاں اک انچ بھر بھی پاؤں رکھتے
زمیں کا ایک ٹکڑا بھی کہاں تھا

یہ غزل اور اس قبیل کے اور کچھ اشعار وضاحتی نوعیت کے ہیں جو غماز ہیں ان صدمات کے جن سے اُن خوفناک واقعات نے شاعر کے تخلیقی شعور کو مہمیز کیا۔غماز ہیں تخلیقی شعور کی بے بسی کے کہ اُس نے غزل کے نازک ترین صنفی مطالبات کے اور لفظیاتی ومعنیاتی جمالیات کو یکسر نظر انداز کر کے خالص نظمیہ انداز میں بلا تامل اظہار کے لیے مجبور کیا۔اس نہج پر عتیق اللہ کے خلقی (Original) شعری ولسانی ابعاد اور تکثیریت کے امکانات کی کمی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔لیکن یہ وسیلۂ اظہار انھیں عصری discourses ڈسکورسیز سے قریب تر کردیتا ہے جو اور کئی زبانوں میں تخلیق کئے جارہے ہیں۔یہ ڈسکورسیز ثقافتی آمریت، سرمایہ دارانہ سامراجیت، فرقہ وارانہ عصبیت، فسطائی نظریات اور نسلی تفریقات پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔

عتیق اللہ کی شاعری کی جمالیاتی دروبست اور اس کا کُلّی تاثر اپنے مخصوص اندازِ تکلم، اپنے مخصوص لہجے، ڈرامائیت آمیز تلفیظ، ڈکشن کے کہیں کھردرے پن، کہیں کلاسیکی رچاؤ اور کہیں محاکاتی اندازِ بیان کے وساطت سے نمو پاتی ہے۔مصرعوں کے تہہ نشین آئرنی ان کے شعر میں تہہ دار ابعاد کا اضافہ کرتی ہے۔تازہ کار تشبیہیں اور نئے پیکر واستعارے ان کے منفرد اسلوب کے امتیازی نشانات ہیں۔یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تھا سرِ جسم اِک چراغاں سا
روشنی میں نظر نہ آیا کچھ
کوئی زمین تو ہوگی تیری زمینوں پر
ہمارے جیسا کوئی نقشِ پا نہیں ہوگا
تو جب آیا ہے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
غار کے منہ سے جو یہ سنگ ہٹیں تو دیکھوں
ایک آنسو بھی کم نہیں ہوتا
ہم چراغوں میں بھر کے لائے تھے
اب ایسی شب کی سیاہی کا رزق میرا نصیب
اب ایسے دِن ہیں تو ان پر گذارا کرنا ہے

موجودہ ابتر عالمی صورتِ حال، اجتماعی فسطائیت اور ایٹمی فوقیت کا جنون اور اس جنون کو منتج انقطاعِ توانائی (Entropy) اور مظاہر کے معدوم ہونے کے خدشات عتیق اللہ کے شعر کے سیاق مرتب کرتے ہیں۔انہوں نے ان خدشات کو اس چابک دستی اور Subtility کے ساتھ انگیز کیا ہے کہ وہ ان کے ویژن کے خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر اہم ترین تشکیلی عنصر نظر آتے ہیں۔ایک طرف ''دُنیا تمام آتشیں دھاروں کی زد میں'' نظر آتی ہے:

سنسنا اُٹھیں گی دشتِ سنگ کی فصلیں تمام
اِک بگولہ اُڑ کے سارے شہر پہ چھا جائے گا
رات کے اعصاب پر جب مردنی چھا جائے گی
شہر کا خالی بدن نیزوں سے چھیدا جائے گا
کہ جیسے گرنے ہی والا ہے آسماں سر پر
کہ جیسے اپنے مداروں سے ہٹ رہی ہے زمیں

تو دوسری طرف درونیت کے توسط سے کی گئی لفظیاتی اور معنوی تطابق کی نیرنگیاں دیکھئے جو ان کے ویژن کی مظہر اور کلاسیکی غزل کا اثبات بھی ہیں:

سارے حواس اپنے مداروں سے ہٹ گئے
پہلو میں جس کا زور تھا وہ رگ ہی کٹ گئی
کچھ تیرا درد چاٹ گیا ہے میرا بدن
کچھ زندگی نے پی لیا اندر تلک مجھے
دھواں سا بنتا رہا اور محو ہوتی رہیں
وہ صورتیں جو ابھی میرے گردو پیش میں تھیں

عتیق اللہ کا کلام مہیب اندھیروں اور حوصلہ شکن حالات میں 'یہاں ستارہ' وہاں 'چراغ' دھرنے کا حوالہ فراہم کرتا ہے۔خوابوں کی کرچیاں ہیں کہ آنکھوں کی پتلیوں میں گھُسی جاتی ہیں، لیکن خواب، انفس وآفاق کے درمیان ربط وارتباط کے خواب، بے لوث رفاقتوں کے خواب، نہ صرف شاعر بلکہ عالمِ انسانیت کا اثاثہ ہیں:

نگاہ اور چراغ اور یہ اثاثۂ جاں
تمام ہوتی ہوئی شب کے نام کرنا تھا
فرار کے لیے جب راستہ نہیں ہوگا
تو بابِ خواب بھی کیا کوئی وا نہیں ہوگا
گذارنے کی وہ صورت قیامِ خواب میں تھی
جہاں سے اور کئی راستے نکلتے تھے

عتیق اللہ زندگی کے ناگزاریوں میں محبوس ومقید بار بار اپنے قلب کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں جو روشنی کا مرکز ومنبع بھی ہے اور راہِ نجات بھی یہیں سے ہوکر گزرتی ہے۔قلب اور' قلب گاہ عتیق اللہ کی شاعری میں ایک مابعد الطبیعیاتی فضاء کی تشکیل کرتے ہیں۔' قلب' آسمان ہی کی طرح ایک حاوی استعارہ بھی ہے اور ناقابلِ تردید حقیقت بھی۔مخدوم محی الدین نے گُلِ تر کے دیباچے میں کہا ہے کہ شعر کی ماورائیت سماجی حقیقتوں میں پیوست ہوتی ہے:

آسماں کا ستارہ نہ مہتاب ہے
قلب گہہ میں جو اِک جنسِ نایاب ہے
تمام پیش و پسِ قلب گاہ روشن ہے
اگرچہ سرکو بدن سے جدا سا پاتا ہوں
میں جب بھی خواب کے روزن سے دیکھتا ہوں اسے
سیاہ رات کا باطن کھلا سا پاتا ہوں
اِک اندھیرا ہوں سر سے پاؤں تک
پھر یہ پہلو میں کیا چمکتا ہے
قلب گہہ میں ذرا ذرا سا کچھ
زخم جیسا چمک رہا تھا کچھ
وہ قلب گاہِ تمنا میں اِک چراغ کی لو
کو تیز رکھتا تھا، نذرِ ہوا نہ کرتا تھا
میں جُھک کے دیکھ رہا تھا کہ ہے چمک کیسی
اِک اور نقش سا دِل پر مجھے دکھائی دِیا

عتیق اللہ کی بیش تر شاعری ہمیں بڑے ہولناک زندگی کے تجربوں سیمھوردنیا سے گزارتی ہے لیکن کہیں کہیں انھوں نے اپنے مخصوص محسوساتی سانچوں کو توڑا بھی ہے جس کے باعث ان کی شاعری میں توازن کی سبیل بھی نکلی ہے:

پڑا ہوا تھا کھلی چھاتیوں پہ سر رکھ کر
اڑا کے لے چلے بگلوں کے سلسلے مجھ کو
میں سر سے پاؤں تلک ایک آنکھ بن جاؤں
جہاں سے بھی تجھے دیکھوں دکھائی دے مجھ کو
اس کے سارے لمس بدن میں زندہ ہیں
میں تو ان ہاتھوں کی اک اک شاخ پڑھوں
اِدھر اُدھر سے بچاتا ہے وقت میرے لیے
کبھی کبھی ہی سہی انتظار کرتا ہے
یہ درمیان میں کس کا سراپا آتا ہے
اگر یہ حد ہے تو حد سے گزر کے دیکھا جائے
یہ دیکھا جائے وہ کتنے قریب آتا ہے
پھر اس کے بعد ہی انکار کرکے دیکھا جائے

- بقیہ -

قلم سے پھوٹتی کرنیں....!

کبھی کبھی ہمیں غم دے کے غم گساری کر
اُڑان بھرنے سے پہلے ہی پھٹ پڑی ہے زمیں
جہاں کھڑے تھے زمیں دوز ہو گئے ہیں وہیں
ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ
اذیتوں کے ہنر سے وہ باخبر ہے بہت
روانہ ہونے سے پہلے گلے لگاتا ہے
(شعری مجموعہ۔عبارت)

ایسا چونکا دینے والا غیر معمولی اور انوکھا اظہار مجھے بہت کم کم نظر آتا ہے۔ایک اعلیٰ شاعر اپنا ایک حصہ اپنی ہر شاعری کے ذریعہ معاشرے کو دیتا ہے جو پروفیسر عتیق اللہ کر رہے ہیں۔ان کا اتھاہ علم ان کی تحریر کے ذریعہ ادبی دنیا کو منور کر رہا ہے اور ان کے قلم سے پھوٹتی کرنیں اسی طرح اجالا بکھیرتی رہیں گی۔بقول مشہور امریکی نقاد مارگریٹ فلر Margaret Fuller (1810-1850)

" If you have knowledge, let others light their candles in it." اگر آپ کے پاس علم ہے تو اس سے دوسروں کی شمعوں کو روشن کریں"

آخر میں کچھ گستاخی بھی کرتی چلوں کہ وقت کے ساتھ جب ان سے اور واقفیت ہوئی تو یہ حقیقت بھی آشکارا ہوئی کہ یہ بہت نازک مزاج ہیں۔ذرا ذرا سی بات ناگوار گزرتی ہے اور خفا ہو جاتے ہیں۔یہ علم وفضل کی تابناکی کا پرتو ضرور ہیں لیکن ان کی نازک مزاجی سخت وار بھی کرتی ہے۔اکثر مصروفیت کی وجہ سے فون اور ٹکسٹ کا جواب ہی نہیں دیتے جس سے لوگ پریشان رہتے ہیں۔ان کے ہونہار بیٹے ڈاکٹر شبیح اللہ یہ مشکل آسان کرنے میں ہمیشہ مدد کرتے ہیں۔ایک اور حقیقت سے بھی آگاہ ہوئی کہ پروفیسر عتیق اللہ اپنے قلم کے ساتھ بہت بے رحمی سے پیش آتے ہیں۔اُس بیچارے کو کبھی چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔وہ بھی اپنی انا میں ڈوبا رہتا ہے اور کہتا ہے مجھے جتنا دوڑائیں میں تھکنے والا نہیں۔ان کی غیر معمولی ادبی فتوحات پر میں اپنا ایک شعر عرض کرتی ہوں:

گیت بنتے ہیں ترے ہی فن کے ہر سو آبشار
ہو رہی ہے فکر یوں تیرے تخیل پر نثار

قلم سے پھوٹتی کرنیں....!

پروین شیر

(نیوجرسی)

علم کی پتوار سے عاری زندگی کی کشتی وقت کے دھاروں پر بھٹک جاتی ہے۔سماعت، بصارت وبصیرت دھند میں ڈوب جاتی ہیں۔انسان صرف لا علمی کا ڈھانچہ ہو کر رہ جاتا ہے جو فکر وخیال کی دہلیز پار نہیں کرسکتا۔اُس کے پاس نا آگہی کے موتی مونگا کی پٹاری تو ہوتی ہے لیکن آگہی کے کرب کی چنبیلی اور گلاب نہیں ہوتے جو زندگی کی انگنائی میں خوشبو لٹائیں اور اسے علم کی چھاؤں میں خوش آئیند مستقبل کے حوالے کر دیں۔فکر وآگہی کی مفلسی میں لاعلمی کی اطلسی قبائیں جامہ زیب کیے لایعنی لن ترانیوں سے سرشار، دنیا کی رنگا رنگی میں مصروف زندگی خالی دامن ہی رہ جاتی ہے۔ظاہری آسودگی ذہن کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔کاملیت کی معراج تب ہوتی ہے جب بصیرت کی مانگ سوچ کے صندل سے بھر دی جائے۔قلم کی پیشانی فکر کے عطر سے معطر کی جائے۔تب ہی وجدان کی کھڑکیاں کھلتی ہیں اور روشنی اندر آتی ہے جو بے پایاں دانائی کا سرچشمہ بن کر زندگی کو زندگی عطا کرتی ہے۔علم خوب سے خوب تر ہونے کی ترغیب عطا کرتا ہے اور روحانی طاقت بخشتا ہے۔معروف امریکی مصنف Will Durant (1885-1981) کا یہ کہنا سچ ہے کہ:

Knowledge is the eye of desire and can become the pilot of the soul".

''علم ہماری خواہش کی بینائی ہے جو روح کے ناخدا کا درجہ رکھتی ہے''۔

خوابیدہ ذہنوں کو جگانے والا علم ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔زندگی کی پُر ہجوم تاریک راہوں پر گام زن چند ہی مسافروں کے پاس روشن چراغ ہوتے ہیں۔

ان چند مسافروں میں ایک ایسا مسافر ہے جو اپنے قلم سے پھوٹتی کرنوں کے ذریعہ مستقل راہ نمائی کر رہا ہے۔اس غیر معمولی ادیب، نقاد، محقق اور تخلیق کار کا نام ہے پروفیسر عتیق اللہ جو اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں۔ان کے متعلق لکھنے کے لیے قلم تو اُٹھالیا ہے۔لکھنا سمندر ہے لیکن لکھ سکوں گی ایک قطرہ۔

پروفیسر عتیق اللہ سے مجھے پہلی ملاقات کا شرف ۲۰۰۷ میں حاصل ہوا تھا۔ابھی گزرے ہوئے وقت کے بند دروازے کُھل رہے ہیں اور غبار میں نہاں ماضی کے چہرے سے گرد چھٹ رہی ہے۔برسوں پرانے لمحے کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گئے ہیں۔اس سال میرے شعری مجموعے کا تعارف جامعہ ملیہ (دہلی) میں وہاں کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے ذریعہ ہوا تھا۔اس وقت میری تخلیقات پر کئی اسکالرس کے تاثرات سننے کو ملے تھے لیکن ایک بہت منفرد آواز سن کر چونک گئی تھی کہ اس میں حیرت انگیز گہرائی، ندرت اور تخلیقیت تھی۔سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ پہلی بار کسی اردو اسکالر نے میری شاعری کی مناسبت سے میری مصوری کے الفاظ بھی سنے تھے اور اس پر اپنے بھرپور تاثرات سے نوازا تھا۔وہ بالکل ہی برجستہ بول رہے تھے۔فکر انگیز طرز اظہار علم وبصیرت سے لبریز تھا۔میرے شریک حیات وارث شیر بھی بہت متاثر تھے۔میں نے اسی دوران پروفیسر قمر رئیس سے دریافت کیا تھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔انھوں نے بتایا کہ یہ پروفیسر عتیق اللہ ہیں جو صرف معروف نقاد ہی نہیں بلکہ ایک بہترین شاعر، ڈرامہ نگار، اور محقق بھی ہیں۔اُس مختصر وقت میں ہی انھیں سن کر ان کی ادبی قدآوری نے ایک احترام پیدا کر دیا تھا۔کیونکہ جسم کا ایک قطرہ خون ہی پوری تشخیص کر دیتا ہے اور وہی ہوا۔روبرو ملاقات نہ ہونے کے باوجود ان کی علمی آواز شناسائی کے لیے کافی تھی۔پھر ان سے دہلی میں تین ملاقاتیں ہوئیں جب ہم لوگ ہندستان گئے تھے۔ایک بار وارث اور مجھے اپنے دولت کدے بھی لے گئے تھے۔ان کی بیگم (فریدہ) سے مل کر بہت اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ان دونوں کے خلوص نے ہم دونوں کو بہت متاثر کیا تھا۔آج تک یاد ہے۔رفتہ رفتہ ان کی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کے اوصاف سے واقف ہوئی۔یہ اندازہ ہوا کہ ان کی علمی اور ادبی شخصیت جتنی قدآور ہے اتنی ہی ان کی ذاتی شخصیت بھی ہے۔اخلاق، خلوص اور انکسار سے بھرپور کہ پھلوں سے لدی ہوئی شاخ ہمیشہ خمیدہ رہتی ہے۔ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ادبی سیاستوں سے دور، شہرت کی ہوس سے نابلد ہیں جبکہ یہ خطرناک اور لاعلاج مرض میں نے کئی اعلیٰ اور محترم علمی وادبی شخصیات میں بھی دیکھا جو ادب کے لیے ایک ناسور ہے۔

ادبی دنیا میں اکثر گرجنے والے بادل ہوتے ہیں جو برسنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور ادب کی زمین سیراب نہیں ہوتی۔ایسے ادیب ادب کے سمندر کی سطح پر ہی غوطے لگاتے ہیں۔گہرائیوں میں اُتر کر وہ سیپیاں برآمد نہیں کر سکتے جن سے انمول موتی حاصل ہو سکیں۔پروفیسر عتیق اللہ کی ادبی فتوحات کی تہیں مجھ پر کھلتی گئیں اور حیرانی بڑھتی گئی۔مجھے فخر ہے کہ انھوں نے میری تصنیفات توجہ سے پڑھیں اور اپنے گراں قدر تاثرات سے نوازا۔انھوں نے خاموشی کے ساتھ اردو ادب کے بال و پر سنوارے ہیں۔بہت باریک بینی سے مختلف پہلوؤں کو ان کے قلم نے اجاگر کیا ہے جو شاید کبھی نہ ہو پاتے۔اس کی گونج چہارسو ہے کیونکہ خوشبو تو خودمختار ہوتی ہے جسے پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جنھیں خودرو پودے اس کے اردگرد پیدا ہو کر اسے نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتے۔

کچھ مستقل مزاج چراغ ایسے ہوتے ہیں جنھیں تند ہواؤں کا خوف نہیں ہوتا۔

علم وادب کو محفوظ رکھنے کی جو قوت پروفیسر عتیق اللہ کے پاس ہے وہ نسل در نسل منتقل ہوگی اور زندگی کا ادھورا پن دور کرے گی۔یہ قوت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو معاشرے کا آئینہ ہی نہیں اس کی تعمیر بھی کرتی ہے۔تبادلۂ علم

انسانی زندگی کے لئے بے حد اہم ہے۔ امریکہ کے صدر ابراہم لنکن (1865-1809) نے بہت صحیح کہا تھا کہ ''اگر میرے پاس ایک ڈالر ہے اور تمہارے پاس بھی ایک ڈالر ہے۔ اسے ہم ایک دوسرے سے تبدیل کرلیں تو بھی ہم دونوں کے پاس ایک ڈالر ہی ہوگا۔ لیکن ایک علم میرے پاس ہے اور ایک تمہارے پاس، اگر یہ ایک دوسرے سے تبدیل کرلیں تو ہم دونوں کے پاس دوگنا علم ہوگا''۔ پروفیسر عتیق اللہ اس حقیقت سے واقف ہیں اور اپنے اہم خیالات و مشاہدات کے تبادلے زندگی کی بہبودی کے لیے مستقل کیے جارہے ہیں۔ ادب پر ان کے بے شمار احسانات ہیں۔

ایک عالی دماغ رہنما ہوتا ہے جو زندگی کو وجدان عطا کرتا ہے اور یہ وجدان بند ذہن کے دروازے توڑ کر، لاعلمی کا پیمانہ چھین کر چکنا چور کر دیتا ہے۔ علم کی مدرا کا قطرہ قطرہ رس پلاتا ہے۔ لیکن اعلیٰ نگارش سے سیراب ہونے کے لیے وہ نظر چاہیے جو ہر کسی میں نہیں ہوتی۔

ادبی تنقید کے وسیع آسمان پر بے شمار ستارے ہیں لیکن کچھ ہی نمایاں اور تابناک ہیں۔ تنقیدی مضامین خشک ہوا کرتے ہیں ۔ میرے محدود علم میں پروفیسر عتیق اللہ کے علاوہ صرف پروفیسر وارث علوی کی تنقید میں تخلیقیت بھی موجود ہے جو مضمون کو دل چسپ بنا دیتی ہے اور خشک نہیں رہنے دیتی۔ پروفیسر عتیق اللہ کے تنقیدی مضامین کے چند اقتباسات یہ ظاہر کررہے ہیں کہ تنقید میں بھی کیسی تخلیقیت ہے:

''تخلیق سے بڑا چھلاوا بڑا عشوہ ساز محبوب اور بڑی بے وفا معشوقہ کوئی اور نہیں'' (اسالیب۔ صفحہ ۷)

''کسی کے لیے اپنی زندگی پوری ایک جنگ ہے کسی کے لیے عیش ہی عیش۔ کسی کے لیے محض ایک سوال، ایک شبہ۔ ایک وہم۔ جب ہم کسی ضد سے دوچار ہوتے ہیں، جب ہمیں کسی ناآہنگی کا سامنا ہوتا ہے تو ایک تصادم کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ آسائش ارباب غفلت کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، زمین کے کسی ٹکڑے پر ہم کھڑے ہیں اور وقت کی زد میں ہیں۔ لیجیے بیانیہ رقم ہوگیا۔ رقم ہوگیا لیکن ابھی ادھورا ہے۔ تماشہ ابھی ناتمام ہے۔ کیونکہ تماشے کا تمام ہونا بیانیہ کا تمام ہونا ہے۔ اور بیانیہ کا تمام ہونا زندگی کے لیے موت ہے۔ زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے بیانیہ کا جاری رہنا ضروری ہے۔ اور بیانہ کو جاری رکھنے کے لیے تصادم ضروری ہے اور تصادم کے لیے بہر حال اپنی ان عیش گاہوں کو تیاگنا ضروری ہے جو ہماری پناہ گاہیں بھی ہیں۔ جب تک کوئی سودا سر میں نہ سمایا ہو، سود و زیاں کے پھیر سے ہم باہر نہ نکل گئے ہوں، دیوانگی کو ہم نے اپنا وطیرہ نہ بنالیا ہو بیانیہ ایک بے نقط بیانیے کے مماثل ہے'' (اسالیب۔ صفحہ ۲۱۷۔۲۱۸)

تنقید میں محاکے کے عمل کو کچھ اس طرح دیکھتے ہیں: ''تنقید میں حتمی رائے اور فیصلہ نام کی چیز محض ایک بھرم ہوتا ہے۔ ہم کچھ قبول کرتے ہیں کچھ رد۔ سچائی ہمیشہ بین بین ہوتی ہے۔ سچ کو دریافت کرنے کے عمل میں ہمیں بہت سے جھوٹ سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہی جھوٹ جو کبھی سچ مانے جاتے تھے جس طرح سچ خود ایک بھرم کا نام ہے جھوٹ بھی ایک بھرم ہی ہوتا ہے'' (اسالیب۔ پیش روی)

پروفیسر عتیق اللہ کی آنکھوں نے صرف کتابیں ہی نہیں بلکہ اطراف پھیلے ہوئے قدرت کے مناظر بھی پڑھے ہیں۔ ان کی کلیت کو ایک وسیع تناظر میں افشا کیا ہے:

''سورج غروب ہوتے ہوئے چہار سمتوں پر ایک ہلکی سی نور آگیں دھند کی چادر تان دیتا ہے۔ سورج کیا ڈوبتا ہے، دل ڈوبنے لگتا ہے اور اداسیاں ، ہلکی ہلکی نورانی پھواریں اور دھندلی ڈوبے ہوئے سارے مظاہر کی بے زبانی سرگوشیاں سی کرنے لگتی ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ خاموشی کی بھی زبان ہوتی ہے۔ شاعری کی مبہم اور معنی خیز زبان جسے ہمارا سارا وجود سنتا ہے، کچھ سمجھتا ہے کچھ نہیں سمجھتا ہے۔ اداسیاں بھی زبان خاموش رکھتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے اداسیوں سے زیادہ حسین کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔ جس کی رفاقت میں وفا ہے، لمسیاتی شدت ہے، بے پناہی ہے۔ وجود کا ایک ایک ذرہ سمٹ کر ان رفاقتوں کے لمحات میں گھل مل کر غیاب میں چلا جاتا ہے'' (نکتہ شناسان سخن۔ صفحہ ۱۵)

ان کی تنقید کی تپتی ہوئی دھوپ میں بھی تخلیقیت کی دھیمی دھیمی ٹھنڈی بوندوں کی بارش یہاں موجود ہے:

''وہ شاعری ہی کیا؟ جو تھوڑا سا بے چین نہیں کر دیتی، تھوڑا سا اندر سے توڑ پھوڑ نہیں دیتی، ہمیں اپنے سے جوجھنے اور دست و گریبان کرنے کے لیے مہمیز نہیں کرتی۔ شاعری میں اگر سرکشی کی توفیق ہے تو وہ نہ تو خود کو جھٹلائے گی اور نہ ہمیں کسی خوش خواہیے کو تراشنے کے فریب میں مبتلا کرے گی۔ شاعر سے زیادہ سچی اور شاعر سے زیادہ جھوٹی کوئی اور مخلوق نہیں ہوتی''۔ (نکتہ شناسان سخن۔ صفحہ ۱۱)

ایک شاعر تخیاں گھونٹ گھونٹ کر شہد پیش کرتا ہے۔ کڑی دھوپ میں تپ کر، اتنی تمازتوں میں خود کو جلا کر۔ کتنے درد سہنے کے بعد شاعری جنم لیتی ہے جس کا اندازہ مجھے بہ خوبی ہے۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو جنم دیتے وقت جس تکلیف سے گزرتی ہے اسی طرح ایک نظم یا غزل پیدا ہوتی ہے۔ تخلیق کار کے تجربات حیات ایک افسانوی دنیا سے کم نہیں ہوتے۔ وہ اپنی سوچ کی بنسری بجاتا ہے اور اپنی زندگی کا ورق ورق پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کے تخیل کا چراغ آندھیوں سے لڑتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہوائیں اتنی تند ہو جاتی ہیں کہ تخلیق کار بے بسی کے زنداں میں سلاخوں کو تھامے ہوئے اپنی تخلیقی قوت کے چراغ کو دور سے بے قرار ہوکر تکتا رہتا ہے کہ کہیں یہ بجھ ہی نہ جائے۔ ذہن یہ کہتا ہے کہ ایسا ہونے والا ہے، دل کو پھر بھی یہ ضد کہ ایسا نہیں ہوگا۔ معجزے ہوتے رہتے ہیں جب ہٹ دھرم تخلیقیت کا چراغ آندھیوں سے لڑتے لڑتے بھی سانس لینے کی عادت ترک نہیں کرتا اور ایک نظم بن جاتا ہے۔ شاید آندھیاں ہی اس کی سانسوں کو جلا بخشتی ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ کا قلم مسلسل سفر میں ہے۔ اس کے قدم ہمہ وقت متحرک رہتے

ہیں۔تحقیق اور تنقید کے علاوہ تخلیق کے چراغ اپنی روشنائی سے روشن کرتا رہتا ہے۔الفاظ کے جگنوساعتوں کی مٹھی میں آتے رہتے ہیں۔ان کی شاعری احساس کی بھٹی میں کندن بن کرظاہر ہوتی ہے۔الفاظ کے سمندر پر تیرتی ہوئی نظموں اور غزلوں کی ناؤمیں بیٹھ کرکیا کیانظارے سامنے آتے ہیں۔تخیل کی پرواز کہاں کہاں اُڑائے لیے جاتی ہے۔ان کے تفکرات کے طلسم کی تہوں کو کھولنا کبھی کبھی آسان نہیں ہوتا۔نظمیں دور سے اشارہ کرتی ہیں اور قریب آنے نہیں دیتیں۔لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ لطیف احساسات کی شعاعیں الفاظ پہ بکھری ہوئی نظر آتی ہیں جو بند دریچے کھول کر روشنی کوسامنے لاکھڑا کر دیتی ہیں۔کبھی دھوپ کی شدت کے ساتھ تو کبھی چاندنی کی فرحت کے ساتھ۔ان کی اعلیٰ شاعری نے بھی اردو ادب کو نادر خزانہ عطا کیا ہے۔نظم ''اچھا ہی ہوا'' دل چیر دینے والی یہ نظم پڑھ کر جو محسوس ہوا اسے الفاظ میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔اس نظم نے پلکیں نم کر دیں۔دل سے نکلی ہوئی سچی آواز سن کر یہی ہوتا ہے۔جذبے آنسوؤں کے دھبے بن جاتے ہیں۔

''اچھا ہی ہوا'' (اپنے عزیز ترین بھانجے فضل محمود کی ناگہانی موت پرنظم)

ہرطرف ڈنک اُگے ہوئے ہیں
ہرراستے پرنکیلی کیلیں گڑی ہیں
اچھا ہی ہوا
تم اس کیچ بھری فضا سے کپڑے جھاڑ کر نکل گئے
نلکیوں سے اترتے ہوئے
بوند بوند۔۔۔رات اور دن

پیپ بھرے گڑھوں میں ڈوب جاتے ہیں
خواہشوں کے چیتھڑے جہاں تہاں لٹکے ہوئے ہیں
تمہاری پھٹی ہوئی آنکھوں میں
دنیا کتنی چھوٹی سی ہوگئی ہے
زماں ومکاں مٹھی میں کس لیے ہیں
اکتیس برس ایک ساعت میں سمٹ آئے ہیں
بالشتیوں سے بھری ہوئی دنیا کا بھرم ٹوٹ گیا ہے
اکتیسویں برس کی آخری چٹان ڈھوتے ڈھوتے
تمہاری پھولی ہوئی سانسیں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں
زرد پانیوں کا فوارہ چھوٹ پڑا
اور تم
خاموش
چت پڑے ہوئے
یکا یک
منھ پھاڑتی دراروں سے باہر نکل گئے
بغیر ہاتھ ہلائے ہوئے
بغیر پیٹھ دکھائے ہوئے (شعری مجموعہ 'تکلم' صفحہ ۹۹)

الفاظ کے قلب گاہوں سے ایسے نازک احساسات جب عیاں ہوتے ہیں تو دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔اس نظم نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

شاعری دو قسم کے احساسات سے مستفیض کرتی ہے۔لطف انگیز اور فکر انگیز۔ذاتی طور پر مجھے فکر انگیز شاعری پسند ہے۔پروفیسر عتیق اللہ کی شاعری فکر انگیز ہے۔بہت منفرد اور انوکھا طرز اظہار ہے۔ایک اور بہت پر اثر اور فکر انگیز نظم جس سے ہم سب گزرتے ہیں:

''بس یہی ہوتا ہے''
جب بھی سامان سفر باندھتا ہوں
کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے
کبھی کچھ صرف 'کچھ' ہوتا ہے
کبھی کچھ 'بہت کچھ' ہوتا ہے
جیسے جوتے رکھ لیے اور تسمے رکھنا بھول گئے
پیسے رکھ لیے ٹکٹ رکھنا بھول گئے
بہت کچھ وہاں ہوتا ہے
جب یہ بھی یاد نہیں آتا
کہ کہاں جانا ہے
اور کس کام کے لیے جانا ہے
گھر اور اسٹیشن کے بیچ 'بہت کچھ' یاد آجاتا ہے
اور ایک منٹ کی دیری کے بغیر
واپس گھر لوٹتے ہیں
اور یاد کر کر کے ہر چیز رکھ لیتے ہیں
مگر اتنی دیر میں
وقت ساری چیزوں کو روندتا ہوا
بہت آگے جا چکا ہوتا ہے
گاڑی بہت دور نکل چکی ہوتی ہے (شعری مجموعہ 'تکلم' صفحہ ۱۲۲)

الفاظ اور افکار کے کتنے دریا آپس میں مدغم ہو کر سمندروں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔غزلوں کے یہ اشعار جو مجھے بے حد پسند ہیں:

مجھ میں خود میری عدم موجودگی شامل رہی
ورنہ اس ماحول میں جینا بہت دشوار تھا
یقیں کی کترنیں جیبوں میں چھانٹ کر بھر لیں
قدم قدم پہ اک اندھا سراب تھا آگے
بہت دنوں سے بہت خالی خالی رہتے ہیں

باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ کیجیے

عتیق اللہ شناسی

عمر فرحت
(راجوری)

ایک قاری کی حیثیت سے ہمارا پہلا سروکار تخلیقی متن سے ہوتا ہے۔ لیکن تخلیقی متن سے آنکھیں چار کرنے سے پہلے زندگی کے جن تجربوں سے گزر کر آرہے ہیں وہ اتنے متنوع ہوتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کس نے ہمارے ذہن ووجدان یا ہماری سائیکی پر کتنا گہرا اثر ڈالا۔ کیا سیاست کے اثرات سے ہم بچ کر نکل سکتے ہیں؟ کیا سماجی اور بعض نام نہاد مذہبی قدروں کا دباؤ نفسیاتی تشنج کا باعث نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے نظام زندگی میں اس قدر تضادات اور طبقاتی کشمکش کی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں کہ ان کے اثرات سے کوئی فرد کوئی شعبہ حیات محفوظ نہیں ہے۔ یہی ہمارے دور کے آتش گیر حقائق ہیں، جو ہمیں جھلسا رہے ہیں اور مایوسی کے گہرے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ تخلیقی متون میں بھی ان کا بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ قاری اور متن ساز دونوں کے اردگرد کا یہ تناظر ہے۔ بقول شخصے ''شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بھی خالص ہیئتی نقاد نہیں ہیں، میر کی تفہیم کے دوران وہ زندگی کو اس کی کلیت میں دیکھتے ہیں اور میر کو دریافت کرنے کے لیے میر ہی سے بعض آلات اخذ کرتے ہیں۔ بار بار میر کی زندگی اور ان کے عہد کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یعنی شاعر بھی دوسرے انسانوں کی طرح زندگی کی جنگ میں مصروف ہے۔'' لیکن فاروقی صاحب ایسے اختلافِ نظر سے بلند وبالا اور لازوال مقام پر پہنچ چکے ہیں، بلکہ عام ناقدین کی سمجھ سے مافوق ہیں۔ خیر! میں اپنے مضمون پر آتا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے فاروقی صاحب کی پہلی تنقیدی کتاب 'لفظ ومعنیٰ' میں ''ہندوستان میں نئی غزل'' کے عنوان سے ایک مضمون تھا جس میں انھوں نے وسطِ ہند کے تین شعرا کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے ان کی غزل میں جو کھردرا پن ہے اسے وہاں کے جغرافیائی ماحول کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان تین شعرا میں پروفیسر عتیق اللہ کا بھی حوالہ ہے۔ عتیق اللہ کی غزل شروع ہی سے غزل کی قدیم روایت سے انحراف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

وسطِ ہند 'پہاڑوں اور ہرے بھرے گنجان جنگلوں سے معمور علاقہ ہے۔ خصوصاً شہر اجین (جہاں عتیق اللہ کا جنم ہوا) کو مالوے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، مالوے کی مٹی، کالی اور بھربھری ہوتی ہے، جو گیہوں اور افیم کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔ اجین ایک قدیم تاریخی شہر ہے، وکرمادتیہ کا شہر، وکرم اور بیتال کا شہر، کالیداس اور بھرترہری کا شہر، مذہبی اعتبار سے ہندوستان کے چار مقدس ترین شہروں میں سے ایک جسے مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اردو شعر و ادب کی کسی مضبوط روایت کا یہاں پتہ نہیں چلتا لیکن دور دراز کے علاقوں سے شعرا یہاں آتے رہے، بیسویں کے نصف اوّل میں 'آفتاب مالوہ' نام کا مجلّہ بھی شائع ہوتا رہا۔ جمیل جالبی نے میر تقی میر کے زمانے کے ایک مثنوی نگار شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے مالوے میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مہاراجہ سندھیا کے زمانے میں گوالیار سے اجین تک تقریباً ہر شہر میں کئی اردو میڈیم سرکاری اسکول تھے، لیکن تعلیم نسواں، خصوصاً مسلم بچیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، مسلمان اپنی بچیوں کو ہندی یا انگریزی اسکولوں میں داخلہ نہیں دلاتے تھے، 1910ء میں انوری بیگم عرف آپا بی (عتیق اللہ کی خالہ) اور حنیفہ بیگم عرف کنّا بی (عتیق اللہ کی والدہ مرحومہ) نے یہ جرأتمندانہ قدم اٹھایا۔ یہ خاندان بھوپال میں درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھا۔ ایک مشن کو لے کر یہ خواتین بھوپال کو خیرباد کہہ کر اجین منتقل ہوگئیں۔ اجین کے جس گھر میں رہائش تھی وہی اسکول تھا۔

عتیق اللہ کا دادا یہال تو تقسیم وطن سے قبل ہی سے سوات ضلع ناواگئی (موجودہ پاکستان) میں رہائش پذیر تھا۔ ان کے والد حافظ عبدالقادر نے یہیں 13 برس کی عمر تک فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ذریعۂ تعلیم فارسی تھا، پشتو مادری زبان تھی۔ عتیق اللہ کہتے ہیں کہ والد صاحب جن سے دینی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ وہ بہت سخت تھے (جیسا کہ عموماً مولوی حضرات ہوا کرتے ہیں) ان کی جلالی طبیعت اور سخت گیر رویے سے تنگ آکر انھوں نے ایک دن مولوی صاحب کے مکتب کو خیرباد کہہ دیا، بستی کے باہر ایک درخت کے نیچے گڑھا کھودا اور اس میں تمام دینی کتابیں دفنا دیں۔ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچے، مختلف مساجد میں شب گزاری کی، محمد احتشام نام کے ایک موذن سے دوستی ہوگئی۔ موذن صاحب نے ان سے فقہ کا درس لیا۔ عتیق اللہ کے والد مرحوم کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ انھیں کچھ پارے ازبر تھے اور کچھ احادیث بھی ترجمے کے ساتھ یاد تھیں۔ ابھی خود بھی 14-13 برس کے بچے تھے اور بچوں کو گھروں گھر جاکر پڑھانے لگے۔ کچھ ماہ بعد لاہور سے بھی دل اچاٹ ہوگیا اور دہلی ہوتے ہوئے بھوپال کی راہ لی اور یہیں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ بھوپال سے یہ کاروانِ تعلیم اجین منتقل ہوگیا۔

عتیق اللہ کے بھانجے اقبال حیدری شاعر اور مترجم تھے۔ تقسیم وطن کے دوران ان کی بعض آزاد نظمیں ساقی اور دیگر رسائل میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد Economic Review نام کے رسالے کا انھوں نے اجرا کیا تھا۔ 'جام نو' نام کے ایک ادبی ماہنامے کے بھی وہ مدیر تھے۔ اقبال حیدری کا ذہن جدید تھا وہ شروع ہی سے تجربہ پسند تھے۔ وہ 1954 میں ہندوستان آئے تو ان کی شخصیت اور ان کے طرزِ زندگی سے عتیق اللہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی شاعری سمجھ سے باہر تھی۔ پھر بھی 14-13 برس کی عمر میں وہ ان کا پابندی کے ساتھ ورد کرتے رہتے۔ کھلونا، غنچہ، پھلواری جیسے رسائل کی طرف رغبت بڑھی، پھر لائبریری کا چسکا لگ گیا۔ جہاں ماہنامہ 'نگار' پابندی سے آتا تھا۔ 17-16 برس کی عمر میں نگار کی ادق زبان کو سمجھنا ناممکن تھا، 'نگار' کی تحریروں کے وہ اس قدر دلدادہ تھے کہ اس کے بیشتر مضامین نقل کرلیا کرتے تھے۔ شاعری تو پہلا عشق تھا۔ نگار نے تنقیدی طور پر سمجھنے کی طرف رغبت دلائی، اسی کے ساتھ ابنِ صفی

کے ناولوں نے انھیں اپنا اسیر بنالیا۔ کہتے ہیں نگار نے بہت ادق بنانے کی کوشش کی، لیکن ابنِ صفی کے اسلوب کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ گھر کی زبان اردو اور پشتو تھی، والد مرحوم بہت مشکل اردو بولتے تھے جس میں عربی، فارسی اور پشتو کی آمیزش ہوا کرتی تھی۔ دوسری طرف نگار اور ابنِ صفی کے اسلوبِ نثر کا اثر تھا۔ والدہ کی زبان ٹھیٹھ بھوپالی اردو تھی۔ عتیق اللہ کی زبان کی تشکیل میں والد اور والدہ دونوں کی زبانوں نے حصہ لیا۔

عتیق اللہ نے پندرہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اجمین ہی میں ایم۔اے انگریزی ادبیات (1968) کیا، پھر اردو میں ایم۔ اے اور بعدازاں مولانا آزاد کالج اورنگ آباد میں (1971) اردو پڑھانے کے دوران پی۔ایچ۔ڈی (1976) کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'ایک سو غزلیں' پیکر حیدرآباد نے 1971 میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں 1965 سے 1970 تک کی غزلوں کا انتخاب شامل ہے۔ اس دوران 'شب خون' نے تہلکہ مچایا ہوا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس کے مدیر تھے۔ فاروقی صاحب جب میدان ادب میں اترے، اس وقت تک اردو میں جدیدیت کا تصور قائم ہو چکا تھا، فاروقی نے اپنے مضامین اور شب خون کے ذریعے جدیدیت کے تصور کو تحریک میں بدل دیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد انسانیت کا ڈھانچہ تتر بتر ہو گیا تھا۔ مایوسی، افسردگی جدید شعرا کی پہچان بن گئی۔ رشتوں کا تقدس ختم ہو گیا، شہروں کے رقبے پھیلتے چلے گئے۔ عقائد ٹوٹ پھوٹ گئے اور انسان انسان ہی سے نہیں خدا سے بھی دور ہو گیا، اور تنہائی اس کے وجود کا ایک جزو بن گئی۔ اسی لیے جدید شعرا وجودیت کے فلسفے سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جدید شعرا کی پہلی نسل میں شہریار، محمد علوی، عادل منصوری، کمار پاشی، وزیر آغا، ندا فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج کومل، قاضی سلیم، زبیر رضوی، عمیق حنفی، وحید اختر، ساجدہ زیدی، منیب الرحمٰن وغیرہ تھے۔ عتیق اللہ کا تعلق اس کے بعد پروان چڑھنے والی نسل سے ہے۔ بانی، عتیق اللہ سے عمر میں بڑے تھے لیکن ان کی طرف کسی نقاد کی توجہ نہیں تھی۔ بانی کی غزل پر سب سے پہلے عتیق اللہ اور محمود ہاشمی نے لکھا، بانی نے غزل کو ایک نئی صوفیانہ فضا سے آشنا کیا تھا۔ ان کے لہجے میں دھیما پن اور زبان کے استعمال میں انوکھا پن تھا۔ انھوں نے زبان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی، شائستگی کا ایک معیار قائم رکھا۔ عتیق اللہ بھی اسی دور میں غزلیں کہہ رہے تھے لیکن ان کے یہاں غم و غصے کی فراوانی ہے۔ اپنی روحانی بے چینی کو انھوں نے جس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے اس میں شدت، تلخی، اکتاہٹ کا پہلو زیادہ حاوی ہے۔ ان کی 80 فیصد غزلیں عتیق تابش کے نام سے 'شب خون' میں پہلے ہی شائع ہو چکی تھی۔ 'شب خون' کے اشاریے سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ان برسوں میں شب خون میں وہ سب سے زیادہ چھپنے والے شاعر تھے۔ عتیق اللہ کی غزلیں اتنی نامانوس تھیں اور زبان بھی اتنی اکھڑی اکھڑی تھی کہ اُسے غزل کے باقاعدہ قاری کے لیے برداشت کرنا مشکل تھا۔ تجربہ اس غزل کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ نوجوانوں کے اندر جو اضطراب، مایوسی اور اضمحلال پایا جاتا ہے اس کا باعث معاصر بے رحم اور دوغلی سیاست ہے۔ عتیق اللہ تقسیم وطن کے بعد پروان چڑھنے والی اور شعور کی منزلیں طے کرنے والی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے داخلی اور روحانی کرب کے خارجی محرکات کو سمجھنا اتنا مشکل بھی نہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہماری نسلوں کی بدبختی یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک ایسی زبان کو زندہ گاڑھا جا رہا تھا جس کی ایک عظیم، طویل اور بلند کوش روایت تھی۔ ہماری تہذیبی علامتوں کے جنازے نکالے جا رہے تھے۔ میر، انیس، غالب اور اقبال کو ایک ایسی زبان کا شاعر کہا جانے لگا تھا جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ اقلیتی فرد کا مسئلہ روزگار رہا، نہ تحقیق و دریافت نہ کسب علم، نہ صاف شفاف ہوا اور پانی۔ ایسی پناہ گاہیں اس کا مقدر بنتی جا رہی تھیں جہاں گھٹن ہی گھٹن غلاظت ہی غلاظت ہے۔ دوسرے ہم وطنوں کی آرام و آسائش اور ہر طرح کی سہولت بخش زندگی سے عاری۔ معصوم اور بے گناہ نوجوان ہی نشانے پر رہے، انھیں جیلوں میں ٹھونسا گیا، اذیتیں دی گئیں، ان کی داڑھیاں نوچی گئیں، کسی کو دس کسی کو بارہ کسی کو اٹھارہ برس جیلوں کی اندھی کوٹھریوں میں غدارانِ وطن کے طور پر ڈالے رکھا۔ عدالت نے جب انھیں بے گناہ قرار دے کر رہا کیا تب وہ بوڑھے اور ناکارہ ہو چکے تھے۔ عتیق اللہ کی غزلیں اسی بے بسی کا استعارہ ہیں۔

'ایک سو غزلیں' کے بعد کی شاعری میں بھی وطن میں بے وطنی اور ہجرت در ہجرت کے اشارے ملتے ہیں جن میں انھوں نے خود پر زیادہ وار کیے ہیں۔ ایک ایسی اقلیت سے وہ وابستہ ہیں جسے قانونی تحفظ حاصل ہے نہ جس کا وجود قابل برداشت ہے۔ عتیق اللہ کی غزلوں میں غصہ وری کا جو عنصر ہے، اس کے محرکات کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ ان اشعار کو اس عہد کے تناظر میں دیکھنے کے علاوہ جدید غزل کے ایک ایسے رنگ و آہنگ کے طور پر بھی دیکھنے کی ضرورت تھی اور ہے جو سب سے مختلف اور منفرد ہے۔ اس آواز میں کسی اور کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ جدید غزل پر جن حضرات نے کام کیا ہے، انھوں نے بھی عتیق اللہ کو کہیں حوالہ نہیں بنایا ہے۔ حالانکہ یہ حضرات اتنے نااہل اور کوتاہ نظر بھی نہ تھے۔ زیادہ تر حضرات نے دوسروں کے بھی وہی اشعار شامل کیے ہیں جنھیں اکثر ہمارے مبتدی یا کہنہ مشق نقاد دہراتے رہے ہیں۔ ہمارے مقالہ نگار خود تو تلاش و جستجو سے کام نہیں لیتے دوسروں کے مضامین ہی سے اخذ کرنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ عتیق اللہ کے ان اشعار کے ذکر کے بغیر جدید غزل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا:

کون کہہ سکتا ہے کچھ دیر میں کیا ہو جائے
کوئی جاتا ہے ذرا دیر مجھے ٹھہرا کر

اینٹیں جانے کب حرکت میں آجائیں
جانے کس دن چُن لے یہ دیوار مجھے

میں آہی جاؤں گا اور تو بھی مل ہی جائے گا
اس اعتماد سے اب میرا انتظار نہ کر

خوف آتا ہے قدم رکھتے ہوئے پانی میں
اتنا پیاسا نہ ہو پی جائے یہ دریا مجھ کو

میں بار بار لگاتا ہوں جست اس کی طرف
وہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتا ہے
آنکھ کا پتھر ایک الاؤ رکھتا تھا
کیسے اس تنور کے اوپر فصل اُگی
تو جب آیا ہے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
غار کے منھ سے جو یہ سنگ ہٹیں تو دیکھوں
میں ایک کانچ کا پر تولتا پرندہ تھا
اڑان بھر نہ سکا اور چھن سے ٹوٹ گیا
بچ کے بھاگا ہی تھا اک دوزخ سے میں
دوسرے دوزخ میں آکر پھنس گیا
لمس کی شدتیں محفوظ کہاں رہتی ہیں
وہ جب آتا ہے کئی فاصلے کرجاتا ہے
کچھ تیرا درد چاٹ گیا ہے میرا بدن
کچھ زندگی نے پی لیا اندر تلک مجھے
یہ اتفاق تھا میں اس طرف نکل آیا
وہ منتظر تھا مگر میرا انتظار نہ تھا
کبھی تو توڑ مری ایک سی انا کا بھرم
کبھی تو ریڑھ کی ہڈی میں قہر بن کر آ
سبھی کے ہاتھ کٹے ہیں، بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا
زمیں پہ آگ لگی ہے میں الٹا لٹکا ہوں
کوئی درخت سے مجھ کو اُتارتا بھی نہیں

'ایک سوغزلیں' کے ان اشعار سے میں نے دانستہ گریز کیا ہے جن میں کھردراپن ہے اور ذاتی ردِعمل میں بیزاری اور اکتاہٹ زیادہ ہے۔ ایک سو غزلیں کے بعد کی غزلوں اور نظموں میں بھی جذباتی اور ذہنی تناؤ میں کمی تو نہیں آئی ہے لیکن لسانی سطح پر توڑ پھوڑ میں کمی آ گئی ہے۔ 'ایک سوغزلیں' کے دوران عتیق اللہ صرف شاعر تھے انھوں نے تنقید میں اپنا کھاتا نہیں کھولا تھا۔ وہ جب 1976 میں دہلی منتقل ہوئے تو تنقید ان کے پیشے کی ایک ضرورت تھی۔ قدر شناسی اور تنقید کا محاورہ محض اسی ضرورت کی پیداوار ہیں۔

'قدر شناسی' (1976) ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ غالباً یہ مضامین بہت عجلت میں لکھے گئے ہیں۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ آج کے عتیق اللہ کی کتاب ہے۔ ان میں کوئی گہرائی ہے نہ سنجیدگی۔ ن۔م۔ راشد پر لکھے گئے مضمون میں کچھ کام کی باتیں ضرور مل جاتی ہیں۔ 'تنقید کا نیا محاورہ' (1982) ان کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں البتہ مارکسی جمالیات اور بیدی کے افسانوں پر لکھا ہوا مضمون توجہ کے لائق ہے۔ بیدی والے مضمون کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ اپنے انداز کا قابل قدر مضمون ہے۔ اس میں عتیق اللہ نے اپنا اسلوب پالیا ہے۔ میں انھیں صاحب طرز کہتا ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر کہتا ہوں، ان کی تحریر میں جس طرح وہ دلیلیں قائم کرتے ہیں ان میں اور پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت میں بھی تازگی اور خلاقیت ہوتی ہے۔ قدر شناسی میں علم کی چمک بہت مدھم تھی، 'تنقید کا محاورہ' میں علم ہی نہیں علم و تجربے سے پیدا ہونے والی نظر بھی ہے۔ تنقیدی مطالعہ اگر 'نظر' (وژن) سے عاری ہے تو اس میں وسعت بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ بیدی کے مضمون کا آغاز جس عبارت سے ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''افسانہ کا دائرۂ اختیار اتنا ہی وسیع ہے جتنی کہ ہماری یہ فضائے بسیط، یہ رنگارنگ زندگی سے معمور تناظرات، کائنات کا یہ اسرار آگیں منظر و پس منظر، وہ سب کچھ جو تخیل کی حدود میں ہے اور وہ بھی جو تخیل کی دراز دستی سے پرے اور پرے ہے۔ حیات جتنی پیچیدہ اور لحہ بہ لحہ تغیر پذیر ہے اسے سمیٹنے اور سمونے کے لیے افسانہ کا دامن اتنا ہی کشادہ اتنا ہی بیکراں ہے۔ افسانہ اس وقت بھی آفاق گیر تھا۔ جب افسانہ گو کا جغرافیائی گراف محدود تھا۔ اب جبکہ افسانے کا اندر اور باہر کئی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے۔ اس کے سراپا نے اپنے آبا سے علاحدہ اور مختلف شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کے کنارے پہلے سے زیادہ وسیع ہوئے ہیں۔ انسان کے بنیادی جذبے اور کیفیتیں اس کے باہر کے تنازعے اور اس کے بطون کی جدلی سرگرمیاں، اس کے خوف، اس کے شکوک، اس کے لالچ، اس کے قہر، سارے سچ، سارے جھوٹ افسانے کے ضمیر میں رچے بسے ہیں۔ افسانہ اس طور پر ان تمام نیکیوں اور بدیوں، رسائیوں اور نارسائیوں کی فرہنگ ہے جو اپنی ہر سطح اور ہر حالت میں انسانی اور خالص انسانی ہیں۔'' (تنقید کا نیا محاورہ: عتیق اللہ، ص 53-52)

''بیدی نے پریم چند کی خلقت کی تربیت نہیں دی ہے بس انھیں ایک دوسرے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ اس جہنم کے مسائل پریم چند کے جہنم سے مختلف اور پیچیدہ ہیں۔ پریم چند کے افراد نے صعوبت پائی تھی تعذیب نہیں۔ انھوں نے جسمانی عذاب جھیلے تھے۔ ذہنی اور نفسیاتی زلزلوں سے ان کا گزر کم ہی ہوا تھا۔ بیدی کے یہاں رشتوں کی ساری منطق ہی بدل گئی ہے۔ متوسط اور نیم متوسط درجے کے خاندان ان کی اقتصادی بدحالی، ان کی جذباتی کشاکشیں، ان کے شیطانی مگر فطری ہیجانات، وقت و حالات کی ستم ظریفیوں کے مابین اپنی انفرادیت کی جستجو، خارج کے ایک مختلف دباؤ اور اس کے سامنے باطن کی اپنی آواز، متداول اخلاقی قدروں سے ذہن و ضمیر کی ناوابستگی، واہمے کا تانڈو ناچ، اتفاقات کی ہمیشہ یک طرفہ عمل داری، یہ ہیں بیدی کے افسانوی فینومینا کے چند پہلو نیز یہ کہ حقیقت کے المناک پہلو انھیں کبھی نہیں بھولتے۔'' (ایضاً، ص 56-55)

''بیدی اپنی پہلی سطح پر ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے میں شامل افراد کی بستیاں آباد کرتے ہیں۔ انھیں خوابوں کا حوصلہ دیتے ہیں یقین کی چمک دکھاتے ہیں حتیٰ کہ ان کے سینے دھڑکنے لگتے ہیں۔ ان کے مساموں سے آنچ آنے لگتی ہے۔ وہ اپنی زندگی جینے کے درپے نظر آتے ہیں اور پھر دوسرے ہی مرحلے پر بیدی کی وہ جانبدارانہ فطرت بیدار ہوجاتی ہے جسے زندگی کی نامانوس علاحدگیاں رقم کرنے میں لطف آتا ہے۔ زخموں کے کھرنڈ چھیلنے میں جسے تسکین ملتی ہے آن کی

آن میں تقدیر کا دھارا اپنا رخ موڑ لیتا ہے۔ اختیار دھرے رہ جاتے ہیں اور بیدی کی نگاہ انسان کی کوتاہیوں، مجبوریوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً، ص 56)

''بیدی نے اپنے کرداروں کے مابین جہاں ایک ناآہنگی سی قائم رکھی ہے۔ اس کی بنا کراروں کا اپنا تخلیق کردہ طریق رسائی بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی فطرت کی کوئی خامی بھی، باہمی غلط فہمی یا دوسرے کی ذات پر مکمل اعتقاد و اعتماد بھی۔ کہیں اپنے طور پر جینے کا عمل انسان کو ایک ساتھ کئی رشتوں سے کاٹ دیتا ہے اور وہ کمزور محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہیں آگہی کی ایک روشن لکیر اس طور پر نمودار ہوتی ہے کہ انسان کو ایک نئی راہ لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ بیدی نے علاحدگیوں کے المیے بیان نہیں کیے ہیں بلکہ اپنی پوری رفتار کے ساتھ اس تناؤ کو پیش کیا ہے جو انسانی رشتوں اور رفاقتوں کے مابین آپ ہی آپ اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور ایک نقطۂ آہستہ آہستہ پھیل کر پوری انسانی سائیکی اور رابطوں پر محیط ہو جاتا ہے۔'' (ایضاً، ص 58-57)

پورا مضمون اس طرح کی عبارتوں سے بھرا ہوا ہے۔ بیدی کی انسان فہمی کو اتنے بہت سے نام کسی اور نے نہیں دیے تھے۔ تجزیے کا جو عمل اس مضمون سے عیاں ہے بعد کے مضامین میں اسی کی توسیع ہے۔ عتیق اللہ کا تخیل بہت حساس ہے۔ وہ دوسروں کے دلائل کو بنیاد بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ جس طرح ان کے اسلوب میں خلاقیت کا جوہر ایک ایک جملے سے ظاہر ہوتا ہے اسی طرح ان کی فکر میں بھی تخلیقیت کی چمک کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عتیق اللہ نے 'افسانے کی داخلی ساخت' میں افسانے کے فن پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ پریم چند، بیدی، کرشن چندر، منٹو وغیرہ کے افسانوں کے علاوہ احمد علی، غلام عباس، قرۃ العین، جوگندر پال، انور عظیم وغیرہ کے فنی عمل کی باریکیوں سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ کہانی، پلاٹ، تکنیک، افسانے کی بیرونی اور گہری ساخت کے ایک دوسرے سے روابط کی نوعیت پر بھی انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

''افسانہ نگار جب افسانے کو بیرونی ساخت کے حوالے کر کے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر چلتا ہے اور تنظیم کے حق میں باریک سے باریک درز اور معمولی سے معمولی صدمہ بھی گوارا نہیں کرتا تو الٹا افسانہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ہر موڑ نپا تلا، ہر کردار ڈھلا ڈھلایا، ہر تاثر مرتب اور ہر مظہر تواتر کے مطابق — گویا افسانہ نگار کوئی افسانہ نہیں تاج محل کھڑا کرنے جا رہا ہے۔'' (تنقید کا نیا محاورہ: عتیق اللہ، ص 82)

انتظار حسین کے نقادوں نے عموماً ان کا ایک اسطور تو بنا دیا ہے، لیکن ان کی تازہ کاری، بہت جلد بے کیفی پیدا کرنے والے معمول میں بدل گئی۔ تخلیقیت کے حق میں تکرار خود ایک بڑا عیب ہے اس پر کسی نے گرفت نہیں کی۔ عتیق اللہ نے 1980 میں یہ بات کہی تھی لیکن چاروں طرف کی داد و تحسین کی گونج میں ان الفاظ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی:

''انتظار حسین ذہنی توہمات اور مفروضات کو پوری قوت کے ساتھ افسانے میں رچانے بسانے کا ہنر جانتا ہے لیکن افسانے کا فن شیشہ گری کا فن ہے۔ اس کی نازک اور کومل بافت پر داخلی تجزیوں کی مسلسل دخل اندازی خود افسانہ نگار کی کم اعتمادی کی غماز ہے۔ آخری آدمی میں فرمودات، ملفوظات اور جا بجا اسما کے حوالے افسانے میں کئی جگہ درزیں پیدا کر دیتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 84)

''ایک اچھا افسانہ تخیل و بصیرت کا کرشمہ، تجربے کی تجسیم اور انسانی باہمی شرکتوں کا ماجرا ہوتا ہے۔ اس میں اگر کوئی داخلی ضبط نہیں ہے اور اس ضبط کو قائم نہ رکھ سکنے کا یہ جواز اور عذر پیش کیا جائے کہ زندگی بذاتہٖ ایک غیر منظم چیز ہے تو پھر ہماری ساری تہذیبی جستجوئیں غلط، سارے فنون بے مصرف، سارے تناظرات و مظاہرات کے تحت میں جدلی سرگرمیاں بے معنی ہیں۔'' (ایضاً، ص 87)

'مادھو — منٹو کا ایک کردار' میں عتیق اللہ نے مادھو کو منفی کے بجائے ایک مثبت کردار کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو اور خصوصاً سوگندھی کے کسی بھی تجزیہ کار نے مادھو کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ عتیق اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ مادھو، سوگندھی کے لیے کیونکر ضروری تھا۔ ادھوا گر درمیان میں نہیں ہوتا تو سوگندھی خودکشی کر سکتی تھی، پاگل بھی ہو سکتی تھی۔ ذرا اس عبارت پر غور فرمائیں:

''جب سوگندھی ایک ہولناک جذباتی کشاکش میں گرفتار تھی اور اس کے اندر آتش گیر مادّہ پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اس کے سامنے تزکیۂ نفس کی کوئی مناسب اور بروقت راہ نہ تھی۔ ایسے لمحوں میں سوگندھی کے فاسد مادّے کا اخراج ضروری تھا ورنہ اس کے لیے دو ہی راستے تھے: یا تو وہ خودکشی کر لے یا پاگل ہو جائے — مگر نہ تو اس نے خودکشی کی اور نہ پاگل ہوئی کیونکہ مادھو بہر حال ایک ایسا میڈیم ثابت ہوا جس کا اخراج سوگندھی نے بالآخر وصول کر ہی لیا۔

مادھو ریاکار ہے، جھوٹا ہے، ناعاقبت اندیش ہے لیکن منافق نہیں ہے۔'' (تنقید کا نیا محاورہ: عتیق اللہ، ص 97)

عتیق اللہ تنقید کے ساتھ تخلیق کی طرف بھی مائل رہے۔ 'بین کرتا ہوا شہر' کے بعد 'تکلم' (2017) میں وہ ایک نظم گو شاعر کے طور پر بھی اپنا تعارف کراتے ہیں جس طرح غزلوں میں وہ لیک سے ہٹ کر نظر آتے ہیں، اسی طرح ان کی نظموں میں بھی انھوں نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ ان مجموعوں میں آزاد نظموں کے علاوہ نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔ وہ ایک بات ہی کہتے ہیں کہ آزاد نظم کہنا پابند نظم سے زیادہ مشکل ہے اور نثری نظم کہنا آزاد نظم سے زیادہ مشکل ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ نثری نظم کی تعریف آپ کے نزدیک کیا ممکن ہے تو انھوں نے فوراً جواب دیا 'جس کی نثر نہ کی جا سکے' یعنی اگر اس کے مصرعوں کو نثر میں جملوں اور عبارتوں کی طرح لکھیں تو وہ نثر کا عیب معلوم ہوں۔ ان کی یہ نظم جن کا عنوان 'اب' ہے مثال کے طور پر دی جا سکتی ہے:

''اب میرے اور تمہارے درمیان/ ایک باریک سی لکیر کا وہم بھی نہیں ہے/ آگے کوئی گہرا کھڈ ہے/ نہ — پیچھے کسی دشمن کا خوف میں نے/ اپنی چوڑی چکلی ہتھیلیوں پر/ کرچ کرچ زمین چن لی ہے/ تم،/ اپنے گُل نار پاؤں/ ان ہتھیلیوں پر رکھو/ دیکھو —!/ میری بساط میں تمام پیش و پس ہے/ تمام امکانات میری رَو میں ہیں/ اور میں،/ تمہاری زد میں ہوں/ یہ مہین ترین لمحہ/ جسے تم نے/ اپنے پلّو میں باندھ رکھا ہے/ کتنا بے پایاں/ کتنا بے کراں ہے تمہارے مساموں

سے روشنیاں چھوٹ رہی ہیں/اس نواح میں/ میں نے/ اپنے ذہن سے/ ابتدا کی ہول ناک دھند کو چھانٹ دیا ہے/ اور/ پوری طرح/تمہارے پاؤں تلے زمین کی/ بھربھری مٹی میں جذب ہوگیا ہوں (تکلم: عتیق اللہ، ص83-82)

چوڑی چکلی ہتھیلیوں پر کرچ کرچ زمین چننا، کسی کے گلنار پاؤں کو ہتھیلیوں پر رکھنا، مہین ترین لمحے کا پلو میں بندھا ہونا، مساموں سے روشنیوں کا چھوٹنا، کسی کے پاؤں تلے کی بھربھری مٹی میں جذب ہوجانا وغیرہ فقرے اور زمرے شعری حسیت سے معمور ہیں۔ یہاں زبان بھی ناراست اور تخلیقی ہے جو قواعد کے اصولوں کو رد کرتی ہے۔ فکشن میں بھی بعض ادیبوں نے قواعدی اصولوں کو توڑا ہے اور تخلیقی زبان کا استعمال کیا ہے، لیکن فکشن نگار کا بنیادی مسئلہ بیانیہ ہے، بیانیہ کی تنظیم ہے، کرداروں کی ساخت ہے، اسے افسانہ یا ناول کے مجموعی اسٹرکچر کے ان عناصر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے جو بیانیہ کو زیادہ سے زیادہ معنی خیز بناتے ہیں۔ جو فکشن نگار انشاپردازی کے جوہر دکھانے پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر شاعر ہوتے ہیں اور بیانیہ کے بنیادی تقاضوں کا خیال رکھنے کے بجائے زبان کے محکوم ہوجاتے ہیں۔

عتیق اللہ 'غزل کے شاعر تھے، وزن و آہنگ کا انھیں گہرا شعور ہے۔ 'تکلم' میں کئی نظمیں بحر و وزن میں ہیں، لیکن نثری نظم کو وہ مستقبل کی شاعری کہتے ہیں جس کے تقاضوں کو سمجھے بغیر نثری نظم نہیں لکھی جاسکتی۔ عتیق اللہ کی نثری نظم ہو کہ آزاد یا موزوں نظم یا غزل، ان میں بے حد یگانگت ہے۔ ذہنی اور جذباتی تجربوں اور ان کے ادا کرنے والی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ عتیق اللہ کی شاعری کی شناخت آپ کے نزدیک کیا ہے تو میرا ایک ہی جواب ہوگا کہ وہ ''نامانوس ہے وہ پچاس ساٹھ برس پہلے بھی جتنے نامانوس تھے آج بھی اتنے ہی نامانوس ہیں۔'' 'ایک سو غزلیں' کے بعد کے اشعار دیکھیں۔ انھیں آپ کیا نام دینا چاہیں گے:

نہ ایک رات ہی ایسی نہ ایک دن ایسا
مگر میں رات کو دن سے ملانے والا تھا
غریب شہر کا سر ہوگیا قلم آخر
کہاں کی چیز، کہاں پر لٹانے والا تھا
یہ صَرف وحاصل گزیدہ دنیا، نہ دن ہی میرے نہ میری راتیں
کہاں تلک دیکھتا ہی جاؤں، سماعتیں کچھ نظر میں رکھ دے
میں آگیا تھا خود اپنے ہی پاؤں کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر
سمجھ سکے تو اُسے جا کے خود ہی بتلاؤں
کہ آج سوکھے ہوئے دھڑ میں پھر ہوئی سَرسَر
کشادہ دست ہی میرے، نہ پُرشکم میرا
اے میرے شہر کے پندار مجھ فقیر سے ڈر
کتنے برسوں کے بعد آنکھ کھلی
اور اسی روز مجھ کو مرنا تھا
تمام پیش و پسِ قلب گاہ روشن ہے
اگرچہ سر کو بدن سے جدا سا پاتا ہوں
فلک پہ اپنا بسیرا تھا اور ہم اکثر
فلک کے آخری کونے پہ جا نکلتے تھے
ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ
تھا سرِ جسم اِک چراغاں سا
روشنی میں نظر نہ آیا دکھ

میں ایک شب کتنی راتیں جاگا، وہ ماہ بیتے کہ سال گزرے
پہاڑ سا وقت کاٹتا ہوں، شمار کرتا ہوں ساعتوں میں
مکان ولامکاں خالی پڑے تھے
ہم اپنی آخری حد تک گئے تھے
ہم برہنہ سروں پہ رکھ بھی دے
اک ہتھیلی کہ آسماں جیسی
گلاب سب اس نے آنسوؤں میں ڈبو دیے تھے
میں اس کے نزدیک سر جھکائے کھڑا ہوا تھا
اب ایسی شب کہ سیاہی کا رزق میرا نصیب
اب ایسے دن ہیں تو ان پر گزارا کرنا ہے
اک اندھیرا ہوں سر سے پاؤں تک
پھر یہ پہلو میں کیا چمکتا ہے
وہ دشمنوں کی طرح مجھ پہ وار کرتا ہے
مگر گروہ میں اپنے شمار کرتا ہے
اِدھر اُدھر سے بچاتا ہے وقت میرے لیے
کبھی کبھی ہی سہی انتظار کرتا ہے
پانی تھا مگر اپنے ہی دریا سے جدا تھا
چڑھتے ہوئے دیکھا نہ اُترتے ہوئے دیکھا
یاد اس کے وہ گلنار سراپے نہیں آتے
اِس زخم کو اُس زخم سے بھرتے ہوئے دیکھا
آسماں کی یہ جگہ جو خالی ہے
یہیں کہیں ہمارا بھی ٹھکانہ تھا
آنسوؤں کی روشنی بھی کم نہ تھی
وہ افق اگر بہت سیاہ تھا
ترے فلک ہی سے ٹوٹنے والی روشنی کے ہیں عکس سارے
کہیں کہیں جو چمک رہے ہیں، حروف میری عبارتوں میں
زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں

کہ ایک شخص اِدھر سے اُدھر نہیں جاتا
وہ چاند تارِ گریباں میں جا کے اٹکا ہے
تمام آسماں دامن میں بھر نہیں جاتا
ہم سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب ہم نے قدم رکھا یہ خاکداں ویراں تھا
شعارِ زیست ہنر تھا سو ہم نہ جان سکے
جو کام ہم نے کیا دوسرا نہ کرتا تھا
کوئی زمین تو ہوگی تری زمینوں پر
ہمارے جیسا کوئی نقشِ پا نہیں ہوگا
توڑ لے اپنے سبھی لمس کے رشتے مجھ سے
تاکہ محسوس نہ ہو عمر بہت لمبی ہے
مجھ میں خود میری عدم موجودگی شامل رہی
ورنہ اس ماحول میں جینا بہت دشوار تھا
کون اس دشتِ تحیر میں ہے روشن روشن
کس نے یہ سوچ لیا ہے کہ جلا کرنا ہے
یہ درمیان میں کس کا سراپا آتا ہے
اگر یہ حد ہے تو حد سے گزر کے دیکھا جائے

کہاں تک میں انتخاب کروں۔ جس غزل پر نظر جاتی ہے ٹھہر جاتی ہے، بہت مشکل سے میں نے اپنا قلم روکا ہے اور نظر کو ہٹایا ہے۔ عتیق اللہ کی غزل اپنے زبان و بیان اور فضا کے اعتبار ہی سے 'تازہ کار' نہیں ہے۔ خیال و فکر کے اعتبار سے بھی یہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی تنقید کی زبان کی چھاپ ان پر نہیں پڑی کیونکہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے تنقید ان کی شاعری کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ جس طرح ان کی شاعری کا ایک اسلوب خاص ہے اسی طرح ان کی تنقید میں بھی ان کا ایک طرز خاص ہے۔ جس طرح ان کی شاعری کو پڑھ کر ہم فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کسی اور کی تخلیق نہیں، اس کا رنگ ڈھنگ بتا رہا ہے کہ یہ عتیق اللہ کا طرزِ اظہار ہے۔ اسی طرح ان کی تنقید بھی دلائل کا انبار لگا دیتی ہے، تنقید کی زبان بھی تخلیقی اور غیر رسمی ہوتی ہے، ایک ایک عبارت، ایک ایک جملے کی ساخت یہ پتہ دیتی ہے کہ یہ عتیق اللہ کی تحریر ہے۔ انھوں نے 'اسالیب' کی پیش روی میں اپنا موقف بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ:

''میں جسے پسند کرتا ہوں اسی پر لکھتا ہوں۔ ہمارے دور میں ہر دور کی طرح اچھا کم اور بے مصرف زیادہ لکھا جا رہا ہے۔ بے مصرف ادب بھی ہر دور کی ضرورت ہوتا ہے۔ ادب میں ساری چہل پہل اسی بے مصرف ادب کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔ ممکن ہے ہم جسے بے مصرف سمجھ رہے ہیں وہ ہمارے سمجھ کی کوتاہی ہو۔ ممکن ہے کچھ وقتوں کے بعد ہم جسے بے مصرف ادب خیال کر رہے ہیں اسی میں سے کچھ کارآمد یا زندہ ادب کی کونپلیں پھوٹتی ہوئی نظر آئیں۔ ادب میں اس طرح کی صورتیں ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس یہ بھی ہوتا ہے جس کا غلغلہ ایک خاص عہد میں بہت بلند تھا اور جس کے لیے ہر طرف سے داد کی ڈونگرے برسائے جا رہے تھے، پتہ چلا وہ ہمیں دھوکہ دے رہا تھا اور ہم بھی اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے تھے۔ وقت کی گرد ذرا سی ہٹی اور اسے کچل کر دوسرے آگے نکل گئے۔ اس کے ایک معنی یہ بھی برآمد ہوتے ہیں کہ تنقید میں حتمی رائے اور فیصلہ نام کی چیز محض ایک بھرم ہوتا ہے۔ ہر عہد ماضی کا از سرِ نو محاسبہ کرتا ہے اور اپنے طور پر اسے کوئی معنی مہیا کرتا ہے۔ ہم کچھ قبول کرتے ہیں کچھ رد۔ قبول کرنے کے بھی اپنے کچھ معیار ہوتے ہیں اور رد کے بھی اپنے کچھ جواز۔ 'سچائی' ہمیشہ بین بین ہوتی ہے۔ 'سچ' کو دریافت کرنے کے عمل میں ہمیں بہت سے جھوٹ سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہی جھوٹ جو کبھی سچ مانے جاتے تھے۔ جس طرح سچ خود ایک بھرم کا نام ہے جھوٹ بھی ایک بھرم ہی ہوتا ہے۔ کل کا سچ، آج کا جھوٹ ہو سکتا ہے اور آج کے جھوٹ کو ممکن ہے کل سچ کے طور پر دیکھا جائے۔ گویا سچ اور جھوٹ دونوں ہمیشہ تعلیق میں ہوتے ہیں۔ ہمیں تنقید میں محاکے کے عمل کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔''

(اسالیب: عتیق اللہ، ص viii)

عتیق اللہ کا یہ کہنا ہے کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی حاوی رجحان ضرور ہوتا ہے جسے ہم اس کے ہمہ گیر اثرات سے پہچانتے ہیں۔ تنقید اسے پروان چڑھاتی ہے۔ اس حاوی رجحان کے تحت جو ادب لکھا جا رہا ہے، تنقید نگار اس کی پذیرائی بھی خوب کرتے ہیں۔ ناقدین کرام کی داد و دہش کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے۔ تخلیقی فن کار کو اور کیا چاہیے تنقید نگار کی تحسین اس کے لیے ایک سند درجہ رکھتی ہے۔ یہی کچھ ترقی پسندوں کے عہد میں ہوا اور یہی کچھ جدیدیت کے عہد میں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ نقادوں کو برا بھلا کہنے والوں کے دلوں میں بھی یہی چور ہوتا ہے کہ کاش کوئی قابل ذکر نقاد کی نگاہِ التفات ان پر بھی پڑ جائے لیکن وقت گزرنے کے بعد ان اسناد کی بھی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ عتیق اللہ کہتے ہیں کہ وقت کو دھوکا دینے والے ادیب ہمیشہ متبادل ہوتے ہیں۔ وہ عموماً اپنے دور کے حاوی رجحان یا رجحانات سے بچ کر اپنی راہ نکالتے ہیں، اسی لیے اس دور کے نامور نقادان کا نام لینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ''دراصل ادبی تاریخ میں ایک بڑی روایت کے بنیادگزار بھی وہی فنکار ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی تنقید کے حاوی رجحانات سے ہمیشہ فاصلے کی ایک حد مقرر کر چکے ہیں۔ جو اس فریم میں چست بیٹھتے ہیں نہ اس فریم میں۔'' (عتیق اللہ)

خود تخلیقی فنکار بھی کبھی کبھی اپنا صحیح تجزیہ نہیں کر پاتے۔ جیسے انیسویں صدی کے ربعِ اوّل کے 'غالب' اپنے عہد سے بہت آگے تھے۔ اس دور کے اکثر کلام کو انھوں نے 'منسوخ' قرار دے دیا تھا۔ 'نسخۂ حمیدیہ' کی دریافت کے بعد کا غالب حالی کے دور کے غالبا کو اور زیادہ جلا بخشتا ہے۔ غالب کے مکتوبات ہوں کہ غالب کا قصیدہ یا غزل ہر صیغے میں وہ ایک متبادل شاعر کے طور پر ہمیں اپنا تعارف کراتے ہیں، عتیق اللہ کہتے ہیں۔ اقبال، میراجی، منٹو، بیدی، احمد علی، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، مجید امجد، شفیق فاطمہ شعریٰ، انتظار حسین وغیرہ متبادل فن کار ہیں۔ خود فیض اگر عام ترقی پسندوں کی آواز میں آواز ملا کر بات کرنے پر قانع

ہوجاتے تو ان کا قد کوتاہ کا کوتاہ ہی رہ جاتا۔ تنقید میں میراجی، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، وارث علوی، سلیم احمد، مظفر علی سید، انیس ناگی وغیرہ کی تنقید جس کشادگی فکر ونظر کا احساس دلاتی ہے۔ وہ اپنے ادوار کے حاوی رجحان یا رجحانات کے تحت لکھی جانے والی تنقید میں ناپید ہے۔ ان حضرات کی تنقید پوری طرح نابستہ بھی نہیں ہے لیکن کسی ایک رجحان سے وابستگی کا انھوں نے دم بھی نہیں بھرا۔ عتیق اللہ کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی تنقید ان کے ذہن وفکر کی نمائندہ ہو۔ مختلف علوم اور زندگی کے گوناگوں تجربات سے آدمی کا جو وژن بنتا ہے، اس وژن کی خاص اہمیت ہے۔ عتیق اللہ کسی ایک نظریے اور کسی ایک فلسفے یا کسی ایک علم کے حق میں کسی دوسرے نظریے، فلسفے یا علم کو غیر مفید یا کوتاہ قرار نہیں دیتے۔ تخلیق کا اپنا بھی کوئی تقاضہ ہوسکتا ہے۔ اس تقاضے کے ہم کتنا ہی قائل نہ ہوں لیکن اس پر غور کرنا لازمی ہے۔ عتیق اللہ نے جدید و مابعد جدید تھیوری پر کئی اہم مضامین لکھے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ وہ علم کے حدود متعین کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہر نیا علم انسانی تجربے کی زمین ہی سے پھوٹتا ہے اور ہماری فکر کو از سر نو مرتب کرتا ہے اس سلسلے میں عتیق اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ:

''ممکن ہے کبھی یہ سننے میں آئے کہ تاریخ، فلسفے، عمرانیات، نفسیات وغیرہ علوم کو ادب کے کسی حوالے کی ضرورت نہیں رہی، لیکن ادب کو ہمیشہ ان علوم کی ضرورت رہے گی۔ ادب کی فہم کو زندگی کے علاوہ ان علوم کی آگاہیوں سے اعتبار اور توانائی ملتی ہے۔ تنقید ذہنی بلوغت اور ایک خاص نہج پر ذہنی تربیت کا تقاضہ کرتی ہے جو ایک جواب دہی کا عمل بھی ہے۔ تخلیق کار کو جو آزادیاں میسر ہیں، وہ نقاد کو نہیں کیونکہ اس کا معاملہ تخلیق سے ہوتا ہے اور تخلیق زیرِ لب کلام کا نام ہے۔ وہ کھل کر کم ہی بات کرتی ہے۔ نقاد اس کے منہ میں زبان رکھتا ہے جب کہیں کلام، مکالمے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ تخلیق، نقاد کو اپنے حدود میں پابند بھی رکھتی ہے اور نقاد ان پابندیوں سے ورا بھی نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک اچھا نقاد کبھی اس تصور کو نہیں مانتا کہ جو کچھ ہے تخلیق کے اندر ہے۔ گویا باہر کے پیش وپس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ تخلیق کار کی آئیڈیولوجی کی جڑیں بھی اسی پیش وپس میں ہوتی ہیں اور نقاد کی بھی اپنی کچھ ذہنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ دراصل کشمکش یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ تخلیق کار تو تخلیق کے عمل کے بعد بری الذمہ ہوجاتا ہے۔ نقاد کی ذمہ داری کے آغاز کا مرحلہ اس کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ تخلیق سے وہ کلام ہی نہیں کرتا متصادم بھی ہوتا ہے۔ وہ تخلیق سے لطف اندوز ہوتا ہے، جو جھتا ہے، اس سے مختلف قسم کے تاثرات کسب کرتا ہے، ان کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ کوئی تخلیقی شہ پارہ اگر فنی عیوب سے پاک ہے تو صرف یہی چیز اس کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ تخلیق بنیادی طور پر ایک لسانی شہ پارہ ہوتا ہے لیکن نہ تو محض نظام بلاغت کی اصولی ترجیحات کے ساتھ مربوط کرکے اس کے مطالعے کو کوئی اعتبار انگیز نام دیا جاسکتا ہے اور نہ محض علم اللسان کے آلات کی بنیاد پر جانچنے کی کوئی کسوٹی محاکے کا حق ادا کرسکتی ہے۔ تخلیقی شہ پارہ مختلف اجزا وعناصر کا ایک مرکب ہوتا ہے، جو راست وناراست ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے یا اپنے مربوط ہونے کا ہمیں فریب دیتے ہیں۔ کوئی تخلیق اگر ہمیں فریب نہ دے تو ہم اس حیرت خیزی کے تاثر سے محروم رہیں گے جسے ہم تخلیقی ادب کا بنیادی تقاضہ کہتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ توقع شکنی کا باب ہمیشہ کھلا رہے گا۔ ادب یکساں طور پر توقع شکن ہوتا ہے اور فریب کار بھی— تنقید، تخلیقی شہ پارے کے تمام رُخوں کو دیکھنے کے در پے ہوتی ہے لیکن یہ مہم کبھی مکمل طور پر سر نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو فریب ہے۔ ایک پَل کے لیے پکڑ میں آتی ہے اور پھسل جاتی ہے، کوئی سرا ہاتھ لگتا ہے اور دوسرا الجھ جاتا ہے۔ اگر تمام سرے پکڑ میں آجائیں اور تخلیق فریب دینے سے قاصر ہو تو ہم اپنی زندگی میں کتنی بیش بہا لطافتوں سے محروم ہوسکتے ہیں۔ میدانِ ادب کے علاوہ لطافتوں کے یہ چشمے کسی اور اقلیم میں نہیں پھوٹتے۔ نقاد نام کا قاری ان لطافتوں سے محظوظ ہوتا۔ انھیں کوئی نیا معنی دیتا اور اپنے ادراکات میں دوسروں کو شریک کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔''

(غالب اور اطراف غالب: عتیق اللہ، ص 10-9 (پیش روی)

عتیق اللہ اپنے عہد کے تنقیدی منظرنامے سے بھی خاصے شاکی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ باتیں انھوں نے تیرہ چودہ برس پہلے کہی تھیں لیکن صورتِ حال میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ عتیق اللہ یوں بھی نڈر لکھنے والوں میں سے ہیں۔ وہ احترام سب کا کرتے ہیں لیکن غلام بننا کسی کا گوارہ نہیں۔ خلیق انجم مرحوم نے ایک بار ان سے سوال کیا تھا کہ وہ کس (؟) کے ساتھ ہیں تو معاً عتیق اللہ نے جواب دیا تھا ''کسی کے ساتھ نہیں اور سب کے ساتھ'' اس جواب پر خلیق مرحوم اپنے خاص انداز میں ہنسے اور کہا ''برخوردار تو پھر اس دور میں غیر جانبدار ہونے کے معنی کنوئیں کے مینڈک بننے کے ہیں آپ کو اس کنوئیں سے کوئی باہر نہیں نکالے گا۔ گویا نقصان ہی آپ کے مقسوم میں ہیں'' خلیق مرحوم نے غلط نہیں کہا تھا اور عتیق اللہ بھی اپنی جگہ درست ہیں۔ سارا معاملہ 'ضمیر' کا ہے۔ عتیق اللہ نے اپنے ضمیر صاحب کو سلامت رکھا۔ حلقہ سازوں کے بیچ میں اجنبی بنے رہے۔ تحریریں ان کے ذکر سے عموماً خالی نظر آتی ہیں تو بھی ان کا کیا بگڑا۔ ان کے لکھنے کی طاقت اور لکھنے کے شوق کو تو کوئی چھین نہیں سکا۔ کہتے ہیں پڑھنے کی لت نے مجھے صحت مند رکھا ہے اور لکھنے کی لت میں میری درازیِ عمر کا راز بھی مضمر ہے۔ میں ان کی کتاب 'تعصّبات' پڑھ رہا تھا تو اس پیراگراف پر آکر رک گیا۔ ان حقائق سے ہم سب واقف ہیں لیکن انھیں عام طور پر زبان پر لانے سے گریز کیا جاتا ہے:

''اس اشتہار بازی کے دور میں یہ پتہ لگانا بڑا مشکل ہے کہ کس ادیب یا اس کی تخلیق یا تصنیف کے بارے میں کس نقاد کی رائے یا تنقیدی رائے صائب، صحیح اور کم از کم عصبیت سے پاک ہے اور کس کے تنقیدی فیصلوں کے بین السطور رفاقت نوازی، ادارت نویزی، یا مرتبہ نوازی جیسی اور بہت سی نوازیاں کام کررہی ہیں۔ تنقید اگر ایک کے حق میں ٹھنڈی ہوا کا نرم ونازک سا جھونکا ہے تو دوسرے کے حق میں ہوائے تند وبلا خیز، ایک نقاد کی فریم میں زید انتہائی چست و درست ہے تو دوسرے نقاد کے شکنجے میں پھنسا ہوا طائرِ نیم جان۔ نقاد کا قلم کسی کے حق میں مشعل ہے تو کسی کے حق میں عصا، کہیں وہ برسرِ منبر ہے اور اپنی پوری آواز

کی بلندی کے ساتھ مخاطب ہے تو کہیں اس نے اپنے آپ کو اپنے اوپر اس قدر مسلط کر رکھا ہے کہ اس کی بصارتیں مخصوص اور سماعتیں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر بھی اس کے فرمان کو مستند ماننے والے جاہل اور اختلاف کرنے والے غافل ٹھہرتے ہیں۔'' (تعصّبات: عتیق اللہ، ص 14-13)

دوسری جگہ وہ ایک دوسری تکلیف دہ صورت حال سے پردہ اٹھاتے ہیں:

''تنقید ہے ہی ایسی کارگاہ، جس میں ہر قسم کے مطلوب اوزار و ہتھیار ڈھالے جا سکتے ہیں۔ خوب کو زشت ثابت کرنا اور زشت کو خوب، معمولی کو غیر معمولی قرار دینا اور غیر معمولی کو معمولی، نقاد کا حسنِ کرشمہ ساز ہے اور بس۔ تنقید عتاب ہی نہیں عذاب بھی بن جاتی ہے ان کے لیے جن کے بارے میں نقاد پہلے ایک منفی نقطۂ نظر قائم کر لیتا ہے وہ بڑے کمال احتیاط کے ساتھ اسے اس طرح جانچتا ہے کہ فال بہر صورت نقاد کے حق میں نکلتی ہے اور ایک چٹکی میں ادیب کی ساری محنت و صلاحیت کا ثمرہ خاک دھول میں مل جاتا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے ایسے دلائل کا تسلسل باندھتا ہے کہ قاری کو اپنی فہم کی کمتری اور نقاد کی برتری کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ جب وہی محترم نقاد کے کیڑے نکالنے کے بجائے یہ طے کر لے کہ زیرِ نظر مصنف یا تصانیف کے سر پر بہر حال دستارِ فضیلت باندھنا ہے تو پھر اس کے پاس ان دلائل کی بھی کمی نہیں ہوگی جو اسے ہر قیمت پر اعلیٰ اور افضل ثابت کر سکتی ہے۔'' (ایضاً، ص 14)

عتیق اللہ یہ بھی مانتے ہیں کہ کوئی بھی تنقید، تعصب سے خالی نہیں ہوتی، ہر نقاد کے پاس اپنی ترجیحات کا ایک نقشہ ہوتا ہے۔ ان ترجیحات سے بچ کر نکلنے کی کوشش کے باوجود نقاد کی کوشش بہت کم کامیاب ہوتی ہے۔ پھر بھی ان کا یہی کہنا ہے کہ نقاد کو یہ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ ترجیح و تعصب میں بقول ان کے سخت گیری اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب نقاد کسی ایک نظریے کا تحکم قبول کر لیتا ہے۔ نظریے سے روشنی اخذ کرنا ایک الگ بات ہے اور اس کا محکوم ہونا دوسری بات۔ تکثیریت کے اس دور میں نظریات میں بھی کثرت ہے۔ اسی لیے بعض نقاد انتخابیت کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض بین النظریاتی ہیں گویا ہر ادبی تحریر دوسری ادبی تحریر سے ایک مختلف تقاضہ کرتی ہے۔ عتیق اللہ کا اصرار بین العلومیت پر ہے۔ یعنی ادبی نظریات اور مختلف علوم ہماری آگہی کو ثروت مند کرتے ہیں اور ہمارے وژن کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''ایک علم یا کسی ایک مکتبِ فکر یا کسی ایک نظریے کو جب بھی تفہیم کی اساس کے طور پر اخذ کیا گیا ہے ادب فہمی کے حق میں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا۔ فلسفیانہ فکر کے معنی فلسفہ بطور علم یا فلسفیانہ خیالات کے نہیں بلکہ سوچنے کا وہ طریق ہے جو چیزوں کو ان کے وسیع تر سیاق میں دیکھنے اور سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے اور معنی کے ان قریب و بعید متعلقات کو کسب کرنے کی سعی کرتا ہے جو بظاہر اوجھل ہیں لیکن متن کے باطن یا تحت المتن میں کہیں واقع ہیں۔ چیزیں جو بظاہر دکھائی نہیں دیتیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتیں۔ اسی طرح کی چیزوں سے اکثر غیر متوقع طور پر تفہیم کے عمل میں سابقہ پڑتا ہے۔ اس بات کا لحاظ بھی ضرور ہے کہ اکثر فلسفیانہ خیالات کی فراوانی اچھی بھلی تنقید میں دانش ورانہ جھوٹی برتری کی موجب بن جاتی ہے۔ تنقیدی مخاطبہ کو تنقید ہی ہونا چاہیے فلسفیانہ مخاطبہ نہیں۔'' (بین العلومیت: عتیق اللہ، ص 25)

ان (عتیق اللہ) کا یہ بھی کہنا ہے اور کم از کم نظریے کے سلسلے میں ان کے اس خیال کو ہمیں اپنے ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے کہ ہر نظریے کی اپنی قدر و قیمت ہے۔ کسی وقت میں وہ پورے عہد کی شناخت بن جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ معدوم ہونے لگتا ہے۔ اس کا وہی حصہ باقی رہ جاتا ہے، جس میں جدل کی طاقت ہوتی ہے اور جو معنی خیز ہوتا ہے:

''کسی عہد میں کوئی نظریہ یا تھیوری معاصر بصیرتوں کی خاص پہچان بن جاتی ہے۔ کسی دوسرے عہد میں کوئی دوسرا نظریہ اس کے وسیع تر تاثر کو مٹا دیتا ہے اور اس طرح نئے کے مقابلے پر پرانا از کار رفتہ نظر آنے لگتا ہے۔ تاریخ کبھی ایک ہی صورت میں اپنے آپ کو نہیں دہراتی بلکہ دہرانے کے عمل کے معنی ہیں بہت سی چھوٹی بڑی تبدیلیوں کے بعد کسی ایک صورت کی بحالی اور بحالی میں ہمیشہ یکساں روی کا عنصر جلی عنوان کا حکم نہیں رکھتا بلکہ زمان و مکان کی تبدیلی یا طویل و خفیف وقفے کے بعد ہر پرانی صورت کسی نہ کسی سطح پر نئی ہی ہوتی ہے۔ نئی اس لیے کہ اس میں یقیناً بہت سے محسوس و غیر محسوس طور پر نئے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں بلکہ ہوتے رہتے ہیں، کوئی تنقید کبھی حتمی یا آخری نہیں ہوتی وہ آخری ہو بھی نہیں سکتی۔ کیوں کہ اس کے سلسلۂ عمل کا راست تعلق تاریخ کے عمل سے ہے باوجود اس کے کبھی کبھی بعض ایسی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہتی ہیں جن کے اسباب اکثر منکشف ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ تنقید اسی معنی میں ایک مسلسل حرکت ہے اور جو حقائق و اوصاف نیز تخصیصات کو مناسب اسمائے صفات سے نوازتی رہتی ہے۔'' (ایضاً، ص 13)

اسی معنی میں عتیق اللہ کی تنقید کو پڑھتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے فکر و نظر کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے دلائل اپنے ہوتے ہیں۔ دوسروں کے خیالات کو دہرانے سے عام طور پر گریز کرتے ہیں۔ خوشامد اور چاپلوسی اور حلقہ سازی کی بیماری سے ہمارا ادبی معاشرہ ہلکان ہے۔ عتیق اللہ جسے پسند کرتے ہیں اور جس کی خدمات سے وہ متاثر ہیں، ان کی تحسین و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ بزرگوں میں بھی جو بڑے حلقہ ساز ہیں ان کی حلقہ سازی سے مطلب رکھے بغیر ان کی گراں قدر خدمات کو وہ سراہتے رہتے ہیں۔ نقاد میں اگر اتنی معروضیت ہے اور اپنے تاثرات کو پیش کرنے میں وہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتا تو میرے نزدیک یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ عتیق اللہ نے مابعد جدید تھیوری کو اپنے کئی مضامین میں موضوع بحث بنایا ہے۔ انھوں نے کسی بھی فن میں لسانی ساخت کو اہمیت دینے کے باوجود اس 'کلیے' کو تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو کچھ ہے 'متن کے اندر' ہے۔ گوپی چند نارنگ نے بھی صرف انھیں تصورات کو ترجیح کا منصب عطا کیا ہے جو معنی پر لفظ کو فوقیت دیتے ہیں۔ فاروقی بھی یہی کہتے آئے ہیں اور عربی و فارسی علمائے ادب کی ترجیح بھی لفظ پر زیادہ ہے لیکن وقت کے ساتھ ترجیحات بھی بدلتی آئی

ہیں۔ادب فہمی کی راہ اب اتنی سہل نہیں رہی۔زندگی بھی اتنی سہل نہیں رہی ہے۔ فنکار کے تخلیقی عمل پر محسوس وغیر محسوس طور پر اب اتنی چیزیں اثر انداز ہو رہی ہیں کہ وہ محض لفظوں کو جھولا بنا کر ان میں نہیں جھول سکتا۔گوپی چند نارنگ نے ساختیات اور پس ساختیات کے موضوع پر تو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے لیکن وہ تصورات جو محض ہیئتی/لسانی ساخت کو ترجیح دینے سے انکاری ہیں،ان کو لائق توجہ نہیں سمجھا یا۔بہت بعد میں بڑے تحفظات کے ساتھ ان کو اپنی گفتگو میں شامل کیا ہے۔عتیق اللہ نے سب سے پہلے نوتاریخیت، تہذیبی مادیت، ماحولیاتی مطالعہ، تہذیبی شعریات، تانیثیت، نومارکسیت جیسے ان چھوئے تصورات ومباحث پر تفصیل کے ساتھ لکھا۔ نارنگ نے گولڈمن، پیٹر ماشیرے، آلتھیو سے، ٹیری ایگلٹن اور فریڈرک جیمسن جیسے نومارکسیوں پر بڑی عمدہ بحث کی ہے کیونکہ ان کی فکر میں کسی نہ کسی سطح پر ساختیات وپس ساختیات کے اثرات کارفرما ہیں۔لیکن عتیق اللہ کا کہنا ہے کہ:

''ان کی فکر میں کسی نہ کسی سطح پر ساختیات اور پس ساختیات کے اثرات بھی کارفرما ہیں۔ان مفکرین کے علاوہ وہ بین جمن، ٹی۔ڈبلیو اڈورنو، ہربرٹ مارکیوزے، بلوخ اور ایرخ فروم وغیرہ جیسے ان اہم نومارکسیوں پر بحث کرنے سے گریز کرتے ہیں جن کا قصد بالخصوص اس ادارہ جاتی مارکسیت کے رو سے عبارت ہے جو لینن ازم، ماؤازم اور ٹیٹوازم پر مشتمل ہے۔ادارہ جاتی مارکسیت آدمی کو ایک اجتماعی تاریخی نوع کے طور پر اخذ کرتی ہے جبکہ بیش تر نو مارکسی آدمی کی یوٹوپیائی اور جمالیاتی آرزومندیوں کو بھی خاص اہمیت دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے آلتھیو سے کے مقابلے میں اڈورنو زیادہ ساختیاتی مارکسی ہے جو آلتھیو سے سے قبل انفرادی فرد کو اجتماعی فرد پر فوقیت دیتا ہے۔'' (اسالیب:عتیق اللہ،ص 230-29)

عتیق اللہ نے متن اور قاری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ 'قاری ہر حال میں قاری ہے، اس کا مرتبہ بھی یقیناً بلند ہے مگر اسے متن پر فوقیت دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم متن کی اپنی وجودیات اور حرکیات ہی سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔' آگے چل کر وہ اپنی گفتگو کو اس دلیل پر ختم کرتے ہیں کہ:

''فعال متن ایک مجہول اور کم آگاہ قاری کے نزدیک اتنا بامعنی نہیں ہوگا جتنا کہ ایک آگاہ اور فعال قاری کے لیے۔اسی کے پہلو بہ پہلو ایک فعال اور آگاہ قاری ایک مجہول متن کو اپنی تمام تر تاویلات کے باوجود فعال نہیں بنا سکتا اس طرح ہر متن نہ تو ہر قاری کے لیے ہوتا ہے اور نہ ہر قاری ہر متن کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔'' (ترجیحات:عتیق اللہ،ص 147)

عتیق اللہ نے قرۃ العین، اقبال متین، شمس الرحمٰن فاروقی، خالد جاوید، انیس اشفاق اور عبدالصمد کے افسانوی متن کے علاوہ داستان، ناول اور افسانے کے تشکیلی مضمرات پر بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ان مضامین میں بھی انھوں نے وہی لکھا ہے جو ان کی اپنی قرأت کا تجربہ ہے۔تجزیہ وتحلیل ان کی متن شناسی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ادبی متن کو ڈھلا ڈھلایا، شروع سے آخر تک تراشیدہ، حدوں میں محصور، قائم ودائم نہیں سمجھتے، ہر متن اندر سے بے حد منتشر اور کئی جزوں میں منقسم ہوتا ہے۔اسی لیے تخلیقی متن کا تقاضہ ہی یہ ہوتا ہے کہ (بقول ان کے) ہم اس سے دو دو ہاتھ کریں، اس سے جوجھیں، تخلیقی کار متن نہیں ایک میدانِ کارزار کے باب ہمارے سامنے کھول دیتا ہے۔عتیق اللہ نے غالب کو بھی اسی طرح deconstruct کرنے کی کوشش کی ہے:

''غالب کا یہ بھی ایک طرز خاص ہے کہ وہ کبھی پوری آواز میں بات نہیں کرتے اور نہ ہی ہم ان سے اور نہ ہی وہ ہم سے پوری طرح متفق ہوتے ہیں۔یہی عدم اتفاق ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ کرید کا باعث بنا رہتا ہے۔'' (غالب اور اطراف غالب:عتیق اللہ،ص 27)

''غالب کا ذہن معمول اور توقع کو رد کرنے میں زیادہ رغبت رکھتا ہے۔ عموماً استعاراتی مشابہتوں میں بھی ایسے الفاظ اور لفظوں کے ایسے خوشوں سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے جو نامانوس ہی نہیں ہوتے بلکہ جن کی معنوی سمت اندر کی طرف ہوتی ہے۔ان کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ کن تصور نہیں قائم کر سکتے۔'' (ایضاً،ص 29)

غالب کے تمام نفسی تجربوں کو ان کے اس وژن کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جسے انہوں نے ایک لامحدود رقبے پر پھیلے ہوئے انفس وآفاق کے ذہنی اور مابعد الطبیعیاتی تجربوں سے کشید کیا ہے۔اس وسعت میں مکان کی تحدید بالخصوص تہس نہس ہو جاتی ہے اور زمان سے ورا ان زمانوں کی للک دل کی گہرائیوں میں جگہ بنا لیتی ہے جو اُن دیکھے ہیں لیکن غالب کا قیاس اور احتمال ان کا سراغ لگا لیتا ہے۔(ایضاً،ص 31)

زبان لاشعوری طور پر عمل آوری کا تاثر نہ دلائے تو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی کسی بھی اظہار کی منزل کو بغیر لکنت اور تعلیق کے سر ہی نہیں کر سکتے۔ غالب کے شعر کا بناؤ اس قدر چست وپیوست نیز تہ بہ تہ کسا ہوا اور گٹھا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں لفظ اور لفظ کے درمیان معنی خیز سکوتیے یا silences یا وقفے pauses یا محذوفات کی صورتیں تو تواتر کے ساتھ واقع ہوتی ہیں لیکن مصرعوں کے لسانی جماؤ میں لکنت کہیں حائل نہیں ہوتی۔(ایضاً،ص 36)

غالباً حیات وکائنات کی محدودیت کا احساس ضد کے طور پر ان میں لامحدودیت کے مقصود اور آرزو کو جنم دیتا ہے۔کبھی کبھی وہ حسرت تعمیر پر اکتفا ضرور کر لیتے ہیں لیکن اس قسم کا اکتفا محض شاعرانہ ہے ورنہ فضائے بسیط space اور اس کی لامحدودیت نیز دوری distance غالب کی اصل ذہنی اور وجدانی پناہ گاہ ہے۔فضائے بسیط اور دوری دونوں احساس کی سطح پر ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔ فضائے بسیط مکان ہی میں دوری اور دوری ہی میں فضائے بسیط کا تصور بھی پنہاں ہے۔'' (ایضاً،ص 39-38)

عتیق اللہ نے غالب کے محاکموں میں ایک نئے غالب کو کھوج نکالنے کی کوشش کی ہے۔یہی صورت میر وسودا یا نظیر اکبرآبادی پر لکھے ہوئے مضامین میں موجود ہے۔عتیق اللہ نے اپنی شاعری اور تنقید دونوں میدانوں میں جو شناخت بنائی ہے وہ دوسروں سے مختلف ہے اور متبادل بھی۔علم وبصیرت کے ایک پورے پس منظر نے ان کی اس انفرادی شناخت کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔

نئی غزل کا ایک نام

معید رشیدی
(علی گڑھ)

عتیق اللہ صاحب عتیق برائے نام ہیں۔ان کی پوری ادبی کارگزاری جدید رویوں کی مرہون منت ہے۔ان کی شاعری ہو یا تنقید، دونوں پر لکھنا مشکل ہے ۔اکثر لوگ ان کی تنقید کو دشوار اور زبان کو اس سے بھی زیادہ سخت بتاتے ہیں۔یہ ذاتی مسئلہ ہے۔ہمیں تو ان کے تنقیدی اسلوب میں نیا پن محسوس ہوتا ہے۔نئی اصطلاحات اور سیاق وضع کرنا ان کا خاصہ ہے۔اردو میں اکثر ادیبوں نے تنقید کے ساتھ تخلیق پر بھی توجہ دی ہے، لیکن معدودے چند دونوں میں کامیاب ہوسکے ہیں ۔ ہمارے یہاں مفروضہ عام ہے کہ عروضی اچھا شاعر نہیں ہوسکتا ۔اچھا شاعر عروضی نہیں ہوسکتا۔اچھا نقاد منفرد شاعر نہیں ہوسکتا۔یعنی تنقید تخلیق کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔عتیق اللہ کی شاعری ایسے مفروضات کو رد کرتی ہے۔کچھ لوگوں کے نزدیک وہ ناقد اچھے ہیں۔کچھ لوگ انھیں شاعر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ہمیں ان کے دونوں پہلوؤں میں دلچسپی ہے۔وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ان کی روح نامانوس کائنات کی متلاشی ہے۔سوچ سفر کے سلسلے میں خود کو شامل کرنے کا یہ اظہار توجہ طلب ہے:

کوئی ایسے برت رہا ہے مجھے
سلسلہ بنتا جا رہا ہوں میں

'کوئی' ان کا تخلیقی شعور ہے جو انھیں نئے جہانوں کی دریافت کی جانب مائل کرتا ہے۔شعری اظہار میں یہ مانوس کو نامانوس بنانے کا پہلا قدم ہے۔یہ وہ سائکی ہے جو تخلیق کے اسرار کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور شعور سے شعریات تک کے تمام مراحل میں آنکھیں کھلی رکھتی ہے۔سلسلہ بنتے رہنے کا عمل اور اس کا ادراک، تخلیق کی وسعت و گہرائی سے عبارت ہے۔اس شعر کے وسیلے سے عتیق اللہ کی شاعری کی بے کرانی میں داخل ہونا آسان ہو جاتا ہے۔قاری ہر شعر کی قرأت میں خود کو اس سلسلے میں شریک پاتا ہے اور اس کا حصہ بنتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ بہ ظاہر یہ زمانی سلسلہ ہے، نہ مکانی، لیکن اس میں زمان و مکان کی حدیں تحلیل ہو کر لامتناہیت کے اس درجے پر پہنچ گئی ہیں جہاں ذات اپنے تمام تر روحانی مسائل کے ہمراہ یہ اعلان کرتی ہے کہ اسے قرائن میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک جملے میں عتیق اللہ کی شاعری پر رائے قائم کی جائے تو اسے 'خود اذیتی'، 'شکست ذات' اور 'انا کے بحران' میں انسانی رشتوں کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ان کے یہاں ذات مختلف منطقوں میں بٹ کر بھی اپنے محور اور سلسلے کا حصہ رہتی ہے:

جب بھی تنہائی کے احساس سے گھبراتا ہوں
میں ہر اک چیز میں تحلیل سا ہو جاتا ہوں
رات جو کچھ مجھے دیتی ہے سحر سے پہلے
وقت کے گہرے سمندر میں اتار آتا ہوں
ایک نشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں خود سے
اپنے نزدیک بھی مشکل سے نظر آتا ہوں

تنہائی کے احساس سے گھبرا کر ہر اک شے میں تحلیل ہو جانا واقعہ ہے تو اس واقعے کے بطن سے کئی پہلو سر اٹھاتے ہیں۔تنہائی کا فلسفہ انتہائی پیچیدہ ہے۔یہ احساس ازلی اور ذات کا ناقابل تقسیم حصہ ہے۔چونکہ انسانی ذہن تغیر پذیر اور تنوع پسند واقع ہوا ہے، اس لیے اس میں قلانچیں بھرنے کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔اس میں کسی ایک پہلو پر اصرار ہے، نہ ایک مقام پر ٹھہراؤ۔ذہنی کیفیات میں ہلچل ہوتی رہتی ہے۔غالب نے کہا تھا؛ ''ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال''۔

ایسے میں تنہائی کیا ہے اور اس سے نجات کے کیا معنی ہیں؟ اس جملے کا کیا مفہوم ہے کہ تنہائی انسان کا ذہنی مقدر ہے؟ تنہائی کی دو سطحیں ہیں؛ خارجی اور داخلی۔غالب کے محشر خیال میں داخلی تنہائی موجود ہے۔عتیق اللہ کے شعر میں احساس تنہائی کی جو گھبراہٹ ہے ، اس کی بنیاد داخلی ہے جس میں احساسِ زیاں، خود اذیتی اور خوف کی جمالیات نے شعر کو بڑے کینوس میں اتار دیا ہے۔ تنہائی اپنی پیچیدگی میں تو ایک ہے لیکن ہر اک شے میں تحلیل ہو رہی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک بڑی تنہائی کا جنم ہو رہا ہے۔عتیق اللہ کے شعر میں 'رات' زندگی اور 'سحر' موت کا استعارہ ہے۔ پیدائش سے موت تک کے سفر کا جو حاصل ہے، اسے وقت کے گہرے سمندر میں اتار 'آنے' کا تجربہ متکلم کے تصور کائنات کو ہویدا کرتے ہوئے لازوال 'سلسلہ'/Cycle تعمیر کرتا ہے۔ یہ پہلو اس خیال کی تائید ہے کہ موت آنے پر آدمی مرتا نہیں، بلکہ ایک قطرے کی مانند سمندر میں اتر جاتا ہے۔تصوف کے مطابق اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔زندگی اگر ایک نشہ ہے تو نشہ ٹوٹنے کے بعد [موت کے بعد] صورت واقعہ کچھ اور ہوتی ہے اور خود کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

جس کو ہم عرف عام میں کہتے ہیں زندگی
یہ نشہ اپنے وقت سے پہلے اتر نہ جائے

عتیق اللہ کی شاعری میں نارسائیوں کا کرب شدت کے ساتھ موجود ہے۔ بڑی حقیقتوں کو ہم جتنا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اتنی ہی الجھتی جاتی ہیں۔ عتیق اللہ کا شعری کردار بار بار معاملات کی تہہ میں اترتا ہے۔وہ ذات و کائنات کے گہرے تصورات سے مبارزت طلب ہے۔تحیر کی جمالیات نے اس کے تجربات کو فنتاسی سے ہم آہنگ کر کے لفظ کو مانوس اور معانی کو [وسیع تر کرنے میں] نامانوس حوالوں سے گزارا ہے۔انھوں نے پانے سے زیادہ کھونے کے احساس میں قنوطی رنگ بھرا ہے تو کہیں اپنی ذات پر ضرب کاری کے توسط سے مادی قوتوں کو طشت از بام کیا ہے۔ان کا شعری کردار اس معنی میں مجنوں ہرگز نہیں کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ ہو۔یہ شاعری کسی مجہول شخصیت کی فکر کا نتیجہ نہیں۔ جذبے کی متانت اور تخیل کی پرواز ذہن کی تیزی اور حساسیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ فکرِ رسا میں نارسائی کے رومان نے اگر بھٹکایا ہے تو احساس کی نئی زمینوں اور معانی کے نئے آسمانوں کی سیر بھی کرائی ہے۔یقین پر گمان کی چادر ڈال دی گئی

ہے یا پھر گمان نے ابہام کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔اس لیے ان کی شاعری میں یقین سے زیادہ گمان اور گمان سے زیادہ ابہام کا دخل ہے۔ ماضی کے کرب نے جسم کو چھلنی کردینے کی خواہش کو جنم دیا ہے۔ حال سے نبرد آزمائی نے درد کا وہ طوفان اٹھایا ہے جس کی سنسناہٹ اور کاٹ ہڈیاں چھید کر کے داخل ہوجاتی ہیں۔ مستقبل کے خوابوں نے جینے کی سبیل نکال دی ہے۔ سکوت کے شور اور شور کے سکوت نے ہر موسم میں جو زہر اتارا ہے وہ لفظوں کے پور پور میں اتنی دور تک سرایت کیے ہوئے ہے کہ جہاں تک اور جس قدر احساس کی جڑیں کٹتی جاتی ہیں، درد تازہ وہرا ہوتا جاتا ہے۔ وصال کی تڑپ اور ہجر زدگی نے جذبات کو مختلف خانوں میں تقسیم کردیا ہے۔ خود انتقامی انا کے بحران کا نتیجہ ہے۔ مابعد الطبیعیاتی استواری، زمینی وابستگی کا اٹوٹ رشتہ اور اپنی جڑوں سے کٹ جانے کا احساس، زندگی کو ان عناصر سے وابستہ کرتا ہے جس کا محور نا سٹلجیا ہے۔ خود فریبی کی وہ سطح جہاں فرد مجبور ہوجاتا ہے، عتیق اللہ کی فکر خود شناسی کی منزل پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا ذہنی رویہ مروجہ نظام اقدار کی مخالف سمت میں سفر کرتا ہے۔ ان کی شعری محتویات میں نئی زمینوں کی دریافت اور نئے خواب بننے کا جتن نمایاں ہے:

میری بھی کوئی ذات ہے، یہ کوئی کائنات ہے
اپنی حدوں پہ بار ہوں، اپنی حدوں کے درمیاں

مگر پہلے یہ کب تھی خوں کی بارش
مگر پہلے یہ سناٹا کہاں تھا

پانی تھا مگر اپنے ہی دریا سے جدا تھا
چڑھتے ہوئے دیکھا نہ اترتے ہوئے دیکھا

یہ ویرانہ نہ تھا ویران اتنا
یہ صحرا اس قدر صحرا نہیں تھا
مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے
بہت دن ہوگئے رویا نہیں تھا

ایک آنسو بھی کم نہیں ہوتا
ہم چراغوں میں بھر کے لائے تھے

عتیق اللہ کے یہاں ذات کی دبازت اور شخص میں شخصیات کا تنوع ہے۔ وہ شخصیت کے ہر رنگ میں انفراد کی اتنی گنجائشیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر رنگ دوسرے سے فاصلہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ رنگا رنگی کے باوجود عضویاتی کل متاثر نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں شاندار ماضی کا نوحہ نہیں تو عظمت کے چھن جانے کا احساس ضرور ہے۔ اور یہ احساس لطیف پیرایوں میں بار بار شکلیں بدل کر وارد ہوتا ہے۔ ایک طرف بے مائیگی کا احساس اور دوسری طرف 'اپنی حدوں کے درمیان، اپنی حدوں پہ بار' ہونے کا خیال کچوکے لگاتا ہے۔ پانی کا اپنے ہی دریا سے جدا ہونے کے ساتھ صحرا و ویرانے کے احساس کے شدید ہوجانے کا اظہار انفعالی لہجے کا غماز ہے جس میں ماضی اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ حال سے نبرد آزما ہے۔ آنسو چراغوں میں بھر کے لانے کا واقعہ خیال کے اسی تسلسل کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ ان کے یہاں بے بسی کی مابعد الطبیعیات علامت کو انتہائی گہرائی میں اتارتی ہے جہاں نارسائیوں کی حد کا اس طرح سامنا ہوتا ہے کہ فرد خود کو سامنے پاکر بھی نہیں پہچان پاتا۔ یہ بے نیازی نہیں، بلکہ خود فراموشی کی وہ سطح ہے جس کی راہ خود شناسی سے ملتی ہے۔ ان کی شاعری کہیں کہیں علامتوں کے غار میں متھ بھی خلق کرتی ہے۔ استفہامیہ لہجے نے ذہن کو متحرک و متفکر اور اسلوب کو داخلی سطح تک پہنچایا ہے جہاں مکالمہ تو قائم ہوتا ہے، خود کلامی کی بھی ایک سطح بنتی ہے جس میں ذات کی انا پذیری نظر آتی ہے اور گم شدگی کی کیفیت بھی۔ تخئیل نئے واقعات سے گزارتے ہوئے قاری کو تجربے کے نئے پہلوؤں اور معانی کی نئی طرفوں سے روشناس کراتی ہے۔ نتیجے میں تجریدیت در آتی ہے اور معنی خیزی کو قوت حاصل ہوجاتی ہے۔ الفاظ کی زرخیزی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اجنبی مضامین بھی مانوس معلوم پڑنے لگتے ہیں۔ مجاز کی ایسی صورتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں جہاں سے منطق کا گزر نہیں ہوتا۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

سبھی کے ہاتھ کٹے ہیں، بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا

کیا اس شعر کا کوئی منطقی حوالہ ممکن ہے؟ کیا یہ رونما ہونے والا ماضی کا کوئی واقعہ ہے؟ تاریخ اس واقعے کی صداقت کی اگر شہادت نہیں دیتی تو اس کا جواز کیا ہے؟ [شاعری کو منطقی حوالے کی ضرورت ہے نہ تاریخی صداقت و کرداری شہادت کی۔] یہ قوت متخیلہ کی بے لگامی ہے یا پھر ایک داخلی تصور؟ یہ داستانوں میں تو ممکن ہے، حقیقی یا خارجی دنیا میں ایسا واقعہ مشاہدے میں نہیں آتا۔ کیا یہ شعر حقیقی نہیں؟ کیا اس کا ہماری زندگی کے کسی پہلو سے کوئی رشتہ نہیں؟ یہ شعر اتنا ہی حقیقی ہے جتنا خواب۔ خواب ہمارے زندہ ذہن کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ تجربہ خواب میں رونما ہوا ہے تو بھی اس کی کڑیاں ہماری زندگی کے انتشار سے ملتی ہیں۔ بعض امور پر زبان، بے زبان اور فکر کی گویائی بے باک ہوجاتی ہے۔ اقتدار میں دستور زباں بندی عام واقعہ ہے۔ نظام اقتدار کی غلط کاریوں اور کمیوں پر انگلی رکھنا آسان نہیں۔ ظلم کی انتہائی صورت کو چیلنج کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ لولھے، لنگڑے اور اندھے نظام کے خلاف احتجاج اردو شاعری کے مزاج میں رہا ہے۔ ہاتھ کا کٹنا اور بریدہ سری اس نظام کا احتجاجیہ ہیں۔ یہاں مجبوری کی وہ سطح پیدا ہوگئی ہے جہاں وجود اپنے عدم وجود کے ساتھ گرم سفر ہے:

مجھ میں خود میری عدم موجودگی شامل رہی
ورنہ اس ماحول میں جینا بہت دشوار تھا

جو لوگ محض سانس لے کر زندہ ہیں، یہ ان کی بات نہیں۔ یہ بات تو ان کی ہے جو ذہن اور ضمیر سے زندہ ہیں۔ جن پر بے حسی قابض ہونے میں ناکام ہے۔ ہست و نیست کی منزل سے گزرنا آسان نہیں۔ بیک وقت ہونے اور نہ ہونے کا احساس، اس کرب سے گزارتا ہے جس میں آدمی تماشے کا حصہ بنتا ہے اور اس کی انا مجروح ہوتی رہتی

ہے۔حساس ذہن کے لوگوں کے لیے یہ عام واقعہ ہے۔آج طوفاں نفس نفس اور قیامت قدم قدم ہے۔جو صاحب اختیار ہیں، ایسا لگتا ہے زندگی انھی کی ہے۔زمانہ انھی کا ہے اور وہی سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔جس شخص کے پاس آگہی کا نور ہے۔جس کی ذات دوسروں کی تکلیف سے مچل اٹھتی ہے۔جو ظلم دیکھ سکتا ہے، نہ اس کا حصہ بن سکتا ہے ۔[یہی سبب ہے کہ اس کے پاس کوئی سیاسی ایجنڈہ ہے، نہ مفاد۔]اس کے لیے ایسے میں ہوش کے عذاب کی تاب لانا مشکل ہے۔ایسے سخت حالات میں بے خودی اور عدم موجودگی کا حوالہ فکر کو فن کے اس مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں لفظ محض لفظ نہیں رہ جاتا، استعارہ بن جاتا ہے۔فکر محض فکر نہیں رہتی، فلسفہ بن جاتی ہے۔تصور محض تصور نہیں رہتا، نظریہ بن جاتا ہے۔زندگی کو سمجھنے، اسے برتنے اور اس کا سامنا کرنے کے لیے ایک وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے اور بصیرت چھوٹی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔اس لیے کہ بقول اقبال اسے یہ معلوم پڑ جاتا ہے کہ خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں۔خود کو مختلف خانوں میں تقسیم ہوتا ہوا دیکھنا، اور اپنی ذات کی گہرائی میں اتر کر مشاہدہ کرنا، بالغ نظری کا مقدر ہے:

میری نارسائیوں کی حد ہے یہ
اپنے سامنے سے آرہا ہوں میں

کچھ تیرا درد چاٹ گیا ہے مرا بدن
کچھ زندگی نے پی لیا اندر تلک مجھے

خوف اک دیو کی صورت ہے مسلط دن رات
کون سی سمت کہاں بھاگ کے جائے کوئی

عتیق اللہ کے یہاں ذات و کائنات کے حوالے سے ایک مابعد الطبیعیاتی سلسلہ قائم ہوتا ہے۔یہ پہلو ان کی متعدد غزلوں کے اشعار میں موجود ہے۔زمین اور آسمان دو گہرے، پرانے اور وسیع استعارے ہیں۔یہ مختلف معانی میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔جتنا قدیم عرش و فرش کا وجود ہے، عتیق اللہ کے یہاں دونوں میں اتنا ہی گہرا اور قدیم رشتہ ہے۔ان تصورات کی تہہ میں کہیں متھ ہے تو کہیں ان کے پردے میں اپنے اطراف کی جھلک۔کہیں مذہبی حوالہ ہے تو کہیں بغاوت کی چنگاری۔کہیں ایک امید، جو آدمیت کے لیے بحران میں آخری سہارا ہے۔کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا جسد خاکی زمین کا حصہ ہے اور روح آسمان کی ملکیت ہے۔دونوں دو الگ منطقے ہیں، لیکن دونوں کا اٹوٹ اور ماورائی تعلق ہے جو فاصلے میں قرب کا احساس پیدا کرتا ہے:

ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ
کہاں پہنچ کہ حدیں سب تمام ہوتی ہیں
اِس آسمان سے نیچے اتر کے دیکھا جائے

ہم اپنے آسمانوں میں کہیں تھے
ہمارے پیچھے کوئی آرہا تھا

نقش ہے کون آسمانوں میں
ان زمینوں میں کس کا چہرہ ہے

ہم برہنہ سروں پہ رکھ بھی دے
اک ہتھیلی کہ آسماں جیسی

عتیق اللہ کے کچھ شعروں میں لسانی تجربہ ہے۔چند شعروں میں نیا پن لانے کے لیے اظہار کی سطح پر تجربے سے کام لیا گیا ہے۔بعض شعروں میں ان الفاظ کو برتنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی معنوی ساخت مجاز کو کم قبول کرتی ہے یعنی ان کا خارجی پہلو غالب رہتا ہے۔ایسے شعر طنزیہ سروکاروں پر مبنی ہیں اور کم ہیں۔ان کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ داخلی سطح پر اتر کر کلام کرتے ہیں۔یعنی لفظ در لفظ اور معنی در معنی کا سفر انھیں راس آتا ہے۔وہ بعض اوقات لفظوں کے پھیر بدل سے شوخی پیدا کر لیتے ہیں جس میں کوئی تشبیہ ہوتی ہے، نہ استعارہ، کوئی تمثیل ہوتی ہے، نہ علامت۔فقرے بھی لطف دیتے ہیں۔سادہ گوئی میں سلیقہ ہو تو بات بن جاتی ہے۔عتیق اللہ شعری اظہار کے وسائل سے واقف ہیں۔انھوں نے نئی تراکیب، نئے استعارے اور جذبات و احساسات کی سطح پر حظ کے مختلف پہلوؤں سے قاری کو متاثر کیا ہے۔'شب کی سیاہی کا رزق' اور 'سیاہ فام آفتیں' جیسی تراکیب اپنے اندر جہان معنی کے ساتھ جدت کی صفت بھی رکھتی ہیں:

آئینہ آئینہ تیرتا کوئی عکس
اور ہر خواب میں دوسرا خواب ہے

وہ بات تھی تو کئی دوسرے سبب بھی تھے
یہ بات ہے تو سبب دوسرا نہیں ہوگا

کس کے پیروں کے نقش ہیں مجھ میں
میرے اندر یہ کون چلتا تھا

اب ایسی شب کی سیاہی کا رزق میرا نصیب
اب ایسے دن ہیں تو ان پر گزارا کرنا ہے

یہ سنسنی سی جو محسوس کر رہا ہوں میں
ہر ایک چیز سے بے دخل کر نہ دے مجھ کو

میں تھا اور سینکڑوں سیاہ فام آفتیں
بھاگ جانے کا کہیں کوئی راستہ نہ تھا

عتیق اللہ نئی غزل کا وہ نام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان کے اندر کا ناقد ان کے اندر کے شاعر کا ہم سفر ہے، حریف نہیں۔یہاں یہ کلیہ رد ہو جاتا ہے کہ اچھا ناقد کامیاب شاعر نہیں ہو سکتا۔ان کی شاعری اپنی تخلیقی توانائی کے سبب تابندہ ہے۔اس پر جس طرح اور جتنی گفتگو ہونی چاہیے، نہیں ہو سکی۔ان کا اسلوب قاری کے ذہن کو گرفت میں لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ان کی پوری شاعری لہجے کی متانت سے 'عبارت' ہے۔

(پروفیسر عتیق اللہ صاحب کے نظمیہ کلام سے بصد انکسار)

خواب برقرار ہے

عطیہ سکندر علی (سکھر)

بڑی نظم کا کفّارہ

بہت دنوں سے
میں ایک بڑی نظم لکھنا چاہتا ہوں
بڑی نظم کیسی ہوتی ہے
میں نہیں جانتا
وہ کہاں ہوتی ہے
ہوتی بھی ہے
یا محض میرا دھوکہ ہے
نظم تو ہوتی ہے
جیسے یہی نظم،
جسے میں لکھ رہا ہوں
اور جو میرے بعد آپ کی ہو جائے گی
مگر میرا المیہ یہ ہے کہ
جب بھی بڑی نظم کے ارادے سے لکھنا شروع کرتا ہوں
بالآخر وہ چھوٹی ہی نکلتی ہے
لیکن
بڑی نظم لکھنے کا میرا خواب اب بھی برقرار ہے
میں ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتا ہوں
حالاں کہ
میں نے اُسے کبھی دیکھا نہیں ہے
کہ وہ تو محض ایک خیال ہوتی ہے
جسے میں نے بڑے چاؤ سے اپنا خواب بنا لیا ہے
اور سچ پوچھا جائے تو
دُنیا کے اِن بے ہنگم بکھیڑوں میں
ہمارا ہوتا ہی کیا ہے
نہ تو ہماری بیوی ہماری ہوتی ہے
نہ بچے نہ دوست
کہ وہ بھی سب کے سب
اپنے اپنے خوابوں میں مست رہتے ہیں
وہ اتنے غلط بھی نہیں ہیں
کیوں کہ
سب کو اپنی زندگی آپ جینا پڑتی ہے
اپنے حصے کے غم
— آپ ہی اُٹھانے پڑتے ہیں
لے دے کر بس ایک خواب ہی بچ رہتا ہے
جسے ہم اپنا کہہ سکتے ہیں

تو اے میرے قارئین اکرام!
میرا خطاب آپ سے ہے
کہ میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت چُرایا ہے
اور آپ نے ہمیشہ
میری ہلکی پھلکی، آدھی ادھوری
—— نظمیں ہی پڑھی ہیں
اور ہر بار آپ نے
نظم پڑھنے سے پہلے نظم کے اوپر میرا نام دیکھا ہوگا
پھر اس امید سے نظم پڑھنا شروع کی ہوگی
کہ یہ شاید کوئی معرکے کی چیز ہوگی

تو اے میرے قارئین اکرام!
وہ چیز تو ہوتی ہے
معرکہ وعرکہ کچھ نہیں ہوتا
آپ کو بڑا دُکھ ہوا ہوگا

جب اپنے آخری شمار میں
نظم، گونگی، بہری نکلی ہوگی
ننھی منّی سی، چھوئی موئی گڑیا جیسی
نظم تو بڑی ہوتی ہے
اپنے شور سے
اپنے ٹھاٹ باٹ سے
اپنی حیرت ناکیوں سے
اپنی گمبھیرتا سے
آسمانوں کی طرح بے کراں، وسیع، لامحدود
جو کہیں سے پکڑ میں نہ آئے
ہر بار دماغ سے پھسل جائے
جو بڑی بے وفا ہوتی ہے
کسی ایک کی ہو کر نہیں رہتی
شریر، چلبلی، بددماغ
ایسی ہی ایک نظم
میں بھی لکھنا چاہتا ہوں

ہر بڑا شاعر
زندگی میں بس ایک ہی نظم لکھ کر بڑا ہوتا ہے
اس کی جیب میں بس ایک ہی نظم ہوتی ہے
جس کی وہ زندگی بھر جگالی کرتا رہتا ہے
اُسے توڑتا، مروڑتا، گھسیٹتا، پچھیٹتا رہتا ہے
تاکہ اُس کی شکلیں بدلتی رہیں
اور پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہ ہو
کہ وہ اپنے کو بس دُہرائے جا رہا ہے
حالاں کہ
وہ دُہراتا ہی ہے
مگر بڑی چالاکی کے ساتھ
وہ چالاکی مجھے نہیں آتی
اور جو چیز جس کے پاس ہوتی ہے
——— بس اُسی کی ہوتی ہے
جو میری نہیں ہے سو نہیں ہے
چالاکی مجھے نہیں آتی
تو مجھ سے بڑی نظم بھی نہیں ہوتی

میں آپ کے سامنے اِس کا اعتراف کرتا ہوں
اور افسوس بھی
چوں کہ بڑی نظم بڑی چالاکی سے ہوتی ہے
اور چالاکی کا فن مجھے نہیں آتا
تو قارئین اکرام!
مجھ سے بڑی نظم بھی نہیں ہوتی
معذرت کے ساتھ آپ سے گذارش ہے
کہ آپ میری بڑی نظم کی
——— پہلے کی طرح راہ دیکھتے رہیں
اِن دنوں میں چالاکی کا فن سیکھ رہا ہوں
اگر اِس بچی کھچی عمر میں
میں نے وہ سیکھ لیا
تو یقیناً آپ کو ایک بڑی نظم کا کفارہ دے سکوں گا
ورنہ میں نہ سہی اور سہی
ایسے لوگوں کا قحط نہیں ہے
اور ایسے لوگ آئندہ بھی آتے رہیں گے
جو بڑی نظم لکھنے اور بنانے کے ماہر ہوں گے
اور جو ہمیشہ
آپ کی خدمت میں بڑی نظم پیش کرتے رہیں گے
اور ترس کھاتے رہیں گے مجھ پر
کہ وہ بھی کیا شخص تھا
جو اتنی بڑی عمر میں
ایک بڑی نظم بھی نہیں لکھ سکا!

ایک دُعا کے ننھے ذرّے میں

میرے دل کے طاق میں اُس کی یادیں اُجلی اُجلی
رہ رہ کر بجتی رہتی ہے میری اِک اِک پسلی
رات کے بدلے دِن لیتا ہوں دن کے بدلے رات
اس کے آگے اپنے کردہ اور ناکردہ
سارے گناہوں کا لیکھا جوکھا رکھ دیتا ہوں
اُس کے لفظوں کے معنی میں خود کو ڈھونڈا کرتا ہوں
اُس کی نیندوں میں چلتا ہوں
اُس کے خوابوں کے آنگن میں پہروں دوڑا کرتا ہوں
اُس کے شعلوں میں جلتا ہوں
اُس کی شبنم میں کھلتا ہوں
اُس کی سانسوں پہ سر رکھ کر گہری نیندیں سوتا ہوں
اپنی ساری درزوں کو اس کے نور سے بھر دیتا ہوں
ایک دُعا کے ننّھے ذرّے میں
ساری عمر کھپا دیتا ہوں

○

تمہارے عقب میں

مجھے تمہارے عقب میں
اپنی ماں کی شفقت بھری گود یاد آ رہی ہے
کیا تم بھی
مجھے اپنے جسم سے جھٹک کر دُور پھینک دو گی

تمہارا لمس کچھ بول رہا ہے
جیسے ایک نئی زبان کی تخلیق ہو رہی ہے
یا ہونے والی ہے
آنکھ سے تتلاتے ہوئے لفظ پھوٹ رہے ہیں

تو کیا پھر وہی
کھردرے تنوں والے کھجور کے پیڑ
ہاتھ اُٹھائے ہوئے میرے راستے میں کھڑے ہوں گے

تو کیا پھر وہی وحشی بھینسے
نتھنے پھلائے ہوئے
مجھے دردی سے اُچھالتے ہوئے آگے نکل جائیں گے

تو کیا پھر اُسی طرح
چقماق کے پرزوں سے لَوئیں پھوٹیں گی
اور میرے جسم کو جگہ جگہ سے جھلس دیں گی
یا
میں، پھر چھلنی چھلنی کر دیا جاؤں گا

○

بس یہی ہوتا ہے

جب بھی سامانِ سفر باندھتا ہوں
کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے
کبھی کچھ صرف 'کچھ' ہوتا ہے
کبھی کچھ 'بہت کچھ' ہوتا ہے
جیسے جوتے رکھ لیے اور تسمے رکھنا بھول گئے
پیسے رکھ لیے ٹکٹ رکھنا بھول گئے
بہت کچھ وہاں ہوتا ہے
جب یہ بھی یاد نہیں آتا
کہ کہاں جانا ہے
اور کس کام کے لیے جانا ہے
گھر اور اسٹیشن کے بیچ 'بہت کچھ' یاد آجاتا ہے
اور ایک منٹ کی دیری کے بغیر
واپس گھر لوٹتے ہیں
اور یاد کر کر کے ہر چیز رکھ لیتے ہیں
مگر اتنی دیر میں
وقت ساری چیزوں کو روندتا ہوا
بہت آگے جا چکا ہوتا ہے
گاڑی بہت دور نکل چکی ہوتی ہے

○

میں کہ تم پہ باز ہوں

جہاں کہیں سے
تم نے اپنے فاصلے اُٹھا لیے
وہیں سے میری ابتدا ہوئی
سینکڑوں نحیف اور نزار ہاتھ
آسمان کی طرف اُٹھے
اور ایک ساتھ اُٹھ کے میرے چاروں سمت
کئی صفوں میں تن گئے
میں تمہارے واسطے
تمہارے نام سے
ایک ایسے باب کے دہانے پر کھڑا ہوں
جو ہزار سمتوں کو رجوع ہے
میں کہ تم پہ باز ہوں
خدا کی سب خدائی تم پہ باز ہے
تم مری طرف جھکی رہو
جھکی رہو — کہ اس کے بعد میرے اور تمہارے جسم کی
بامراد شرکتوں سے ایک تن درست شہر کی امید ہے

○

بین العلومی تنقید کے بنیاد ساز

پروفیسر عتیق اللہ

بجنوری نئی تعلیم یافتہ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی ادب وفنون اور فلسفے سے آگاہ تھے۔ غالب سے وہ متاثر ہی نہیں مرعوب بھی تھے۔ 'محاسن کلام غالب' کا پہلا جملہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: مقدّس وید اور دیوانِ غالب'' یہ ایک تاثراتی قسم کا دعویٰ ہے لیکن اس دعوے کی بنیاد بھی انھیں غالب کے کلام ہی سے ملی تھی۔ بجنوری کے علاوہ نواب اعظم الدولہ سے لے کر خورشید الاسلام تک مختلف نقادوں نے غالب کی شاعری کو الہامی قرار دیا ہے۔

بجنوری نے مولوی عبدالحق کی تجویز پر یہ مقدمہ تیار کیا تھا۔ عبدالحق غالب کے شایانِ شان 'دیوانِ غالب' ترتیب دینا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک لائحۂ عمل بھی تیار کیا تھا جس کے مطابق غالب کی شخصیت، سوانح، اور ان کے فکر وفن کا جائزہ لینا مقصود تھا۔ بجنوری نے یہ مقدمہ 1916 میں مکمل کرلیا تھا لیکن اس کی اشاعت 1921 میں عمل میں آئی، جس کا نام 'محاسنِ کلام غالب' رکھا گیا۔

دراصل غالب فہمی کی جو اینٹ حالی نے رکھی تھی اور اس پر 'یادگارِ غالب' کے نام سے ایک بلند و بالا عمارت کھڑی کی تھی، وہ اتنی بلند کوش اور مرعوب کن تھی کہ اس کے بعد غالب کی شخصیت، شاعری اور ان کے ذہنی پس منظر کی طرف بہت کم توجہ کی گئی جیسے حالی کے بعد حالی جیسا کام اب امرِ محال ہے۔ امداد امام اثر کی غالب شناسی ایک نکتہ چیں کے تبصرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ انھیں غالب کا کلام 'لطفِ غزلیت' سے خالی نظر آتا ہے۔ لیکن وہ غالب کے منتخب کلام کے اُس حصے کو مستحسن بھی قرار دیتے ہیں جس میں استعاروں اور اضافتوں کی بھرمار نہیں ہے پھر ان کی نظر میں جو سوز و گداز، خستگی، نشتریت، بلند پروازی، نازک خیالی، جلالت، تہذیب، شوخی غالب کے کلام میں ہے بہ استثنائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں نہیں پائی جاتی ہے۔'' اس قسم کے تاثراتی اسمائے صفات سے ذہن میں غالب کی کوئی تصویر نہیں بن پاتی۔ ان تمام خوبیوں کی طرف شیفتہ سے لے کر نواب اعظم الدولہ سرور اور محمد حسین آزاد تک سب ہی نے وقتاً فوقتاً اشارے کیے ہیں۔ استدلال کے وزن سے سب ہی عاری ہیں۔ امداد امام اثر کا مسئلہ یہ ہے کہ انیس کے آگے انھیں اردو ہی نہیں دوسری عالمی زبانوں میں بھی ان کا کوئی ہم سر دکھائی نہیں دیتا۔

بجنوری سے پہلے صلاح الدین خدا بخش غالب کو آفاقی شاعر اور عبدالماجد دریابادی فلسفی شاعر قرار دے چکے تھے۔ بجنوری نے محاسن کلام غالب میں بین العلومی اور بین الفنونی حوالے سے غالب کو ایک اسطور بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی لیے ان کے خیالات میں علم و آگہی کے رنگ و آہنگ کے ساتھ جذباتیت کی لے خاصی اونچی نظر آتی ہے۔ باوجود اس کے اکثر، مقامات پر انھوں نے استدلال کے وزن و وقار کو قائم رکھنے کی بھی سعی کی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے محاسن کلام غالب کے پیش لفظ میں بجنوری کے تبصرے کو ایک نئے ڈھنگ اور جدید انداز فکر کا پہلا نمونہ بتاتے ہوئے لکھا ہے ''جس طرح اردو زبان کے شعر و ادب میں غالب کا مقام مخصوص ہے اسی طرح غالب کے بے شمار مداحوں میں عبدالرحمٰن بجنوری اپنا ایک خصوصی مقام رکھتے تھے۔ جس طرح غالب نے شعر و سخن کے میدان میں اپنے لیے ایک الگ اور نئی راہ پیدا کی عبدالرحمٰن بجنوری نے بھی کلام غالب پر اپنے تبصرے کا ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ مشرقی اور مغربی ادب اور خصوصاً عربی اور جرمن شاعری کے گہرے مطالعے کے بعد مرحوم اپنے زمانے تک کی نوجوان نسل کے لیے فکر و نظر کے جدید اور ترقی پسند زاویے لے کر آئے تھے۔ غالب پر اُن کا یہ مختصر 'مطالعہ' مرحوم کے جدید انداز فکر کا پہلا نمونہ تھا اور اگر وہ زندہ رہتے تو نا معلوم فکر و نظر کی کتنی بڑی دولت وہ اردو ادب کے خزانوں میں جمع کر دیتے۔'' (محاسن کلام غالب، ص 1)

مولوی عبدالحق نے بجنوری کو دعوت دی تھی کہ وہ 'دیوانِ غالب' پر ایک مقدمہ لکھیں جس کے لیے انھوں نے ایک تبویب بھی تیار کی تھی جو حسب ذیل ہے:

(الف) غالب کے طرزِ بیان کی جدّت

(ب) غالب کی شاعری میں فارسیّت اور فارسی شعرا کے اثرات

(ج) ایک فلسفی شاعر کے طور پر مغربی شعرا سے تقابل

(د) اردو شاعری پر غالب کے اثرات

مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو سے وابستہ تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۴ میں دیوانِ غالب کی اشاعت کا ایک بلند کوش منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے لیے شبلی اور اقبال کے علاوہ اور دوسرے اکابرین کو غالب کی شخصیت، سوانح اور فن شاعری پر مضامین لکھنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا ذہن نیا تھا۔ وہ اردو کے علاوہ عالمی ادب اور مختلف علوم وفنون کے رمز شناس بھی تھے۔ زبان و بیان کی نزاکتوں اور فن کی لطافتوں کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کا درجہ ان کے نزدیک بہت بلند تھا اور بلندی کا وہ تصور جسے انھوں نے غالب کے ساتھ وابستہ کیا تھا، اس میں انھیں کسی اور کی شرکت گوارہ نہ تھی۔ پورا کا پورا غالب ان کے لیے بے میل اور بے عیب تھا جس میں شاعری کے تمام محاسن یک جا ہوگئے ہیں۔ زندگی اور فن ایک دوسرے میں اس طرح حل ہوگئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی فن ہے اور فن ہی زندگی ہے۔ غالب بجنوری کے لیے چیلنج نہیں تھے کیونکہ وہ غالب، اقبال اور حالی پر پہلے ہی بڑے عمدہ مضامین لکھ چکے تھے۔ ذہنی فضا پہلے سے تیار تھی۔

بجنوری نے 1916 میں عبدالحق کے منصوبے کے تحت مقدمہ لکھنا شروع کردیا تھا اور بہت جلد اسے مکمل بھی کرلیا، 1918 میں وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے لیکن ان کا مقدمہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکا۔ پہلی بار انجمن کے سہ ماہی رسالے 'اردو' بابت جنوری 1921 میں یہ شائع ہوا اور اسی سال کتابی شکل میں اس کی اشاعت بھی ہوئی۔ بجنوری نے مولوی عبدالحق کے درج بالا خاکے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شاعری کے فن میں غالب کی دست گاہی نیز غالب کی

شاعری میں فلسفیانہ ومتصوفانہ عناصر پر عالمانہ طرز کی بحث کی۔ اس کے علاوہ بجنوری نے غالب کے طرزِ اظہار کی جدّت وانفرادیت، ان کی مشکل پسندی، ان کے لفظوں کے استعمال کا طریقہ، فنی تدابیر کی بلاغت، اور پیکر آفرینی کے تعلق سے بھی مثالوں کے ذریعے استدلال قایم کرنے کی کوشش کی۔ بجنوری کی تصنیف ایک نئے طرزِ نقد کی حامل تھی اس لیے جہاں وہ مرعوب ومتاثر کرتے ہیں وہیں ان کا اسلوب بہتوں کے لیے نامانوس بھی تھا۔ عموماً ان کے تحسینی ومدحیہ اندازِ نظر کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ محاسنِ کلام غالب کا آغاز ہی اس بلند بانگ دعوے سے ہوتا ہے کہ: ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدّس وید اور دیوان غالب'' یہ محض ایک چونکانے والا تاثراتی قول ہے لیکن اس تاثر کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ آسکر وائلڈ نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ کسی کو اُس فن سے نفرت دلانا ہے تو اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ آپ عقلی سطح پر اس کی تعریف کریں۔ محاسنِ کلام غالب کے پیش لفظ میں قاضی عبدالغفار نے اس نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''محاسنِ کلام غالب کے متعلق عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اُس سے اگر بعض نقادانِ فن اختلاف بھی کریں تب بھی وہ بجنوری کی وسعتِ نظر اور عالمانہ اندازِ تنقید کا وزن ضرور محسوس کریں گے۔''

حالی نے 'پیرویِ مغربی' کی جو طرح ڈالی تھی۔ بعدازاں اس کی توسیع امدادامام اثر اور بجنوری کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ دونوں ہی مغربیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے مشرقی روایات کے پیشِ نظر اچھی مثال قرار نہیں دیتے۔ محاسنِ کلام کے ابتدائی حصّے میں بجنوری اپنا موقف اِن لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''تنازع البقا میں مغلوب ہوکر ایشیائی ایسے مرعوب ہوگئے ہیں کہ اپنے ہر فعل وخیال کا موازنہ مغربی اقوال وآرا سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ خرابی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیئر (Shakespeare) اور ورڈزورتھ (Wordsworth)، ٹینی سن (Tennyson) سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہے۔'' (محاسنِ کلام غالب، ص 8-7)

عملاً بعدازاں خود بجنوری اپنے اس تصور پر قائم نہیں رہے۔ بجنوری سے قبل صلاح الدین خدا بخش نے انگریزی میں غالب کی سرگذشتِ عمر لکھی تھی، جس کے دیباچے کا ترجمہ 'صلائے عام' دہلی کے مارچ 1910ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا۔ The Appreciation of Ghalib کے عنوان سے انگریزی میں ایک اور مضمون جو ان کی تصنیف موسوم بہ Essays Indian and Islamic میں شامل ہے، غالب سے ان کی ذہنی رغبت کا مظہر ہے۔ حالی کے بعد غالب فہمی اور غالب شناسی کی رفتار میں جو تیزی آنا چاہیے تھی نہیں آسکی۔ نظم طباطبائی نے اپنی شرح میں کئی نکات ورموزِ غالب پر سے پردے اٹھائے تھے جو یقیناً ایک معرکے کی کوشش تھی۔ لیکن تنقیدِ غالب کی سرد مہری کو توڑنے کے لیے صلاح الدین خدا بخش کی تحریروں (جس میں ان کا مضمون ہائنے اور غالب بھی شامل ہے) نے مناسب فضا سازی کا کام کیا۔ امدادامام اثر سے زیادہ بہتر طور پر انھوں نے غالب کو سمجھا اور مغرب کے ایک اہم شاعر سے ان کا تقابل کیا۔ بجنوری کی نظر میں غالب کا ہائنے سے مقابلے کا کوئی خاطر خواہ جواز نہیں ہے۔ بجائے اس کے گیٹے کو وہ غالب کے مقابل ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں: دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، فطرت گوئی، زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو' یہاں اس مسئلے پر بحث نہیں کہ ہائنے یا گوئٹے میں سے کون غالب سے تقابل کے لایق ہے یا ان میں کوئی نہیں ہے۔ دراصل یہ حوالہ کلمۂ معترضہ کے طور پر اس لیے درمیان میں واقع ہوا کہ بجنوری نے جس یورپ زدگی کو مذموم ٹھہرایا تھا۔ صلاح الدین پر بحث کے بعد وہ خود اس راہ پر نکل گئے اور ایسے نکلے کہ پھر انھیں مقابلہ آرائی کے لیے مغرب کے علاوہ اور کوئی کم ہی دکھائی دیا۔

صلاح الدین نے غالب کے اختراعی کمال، جذبات کی پاکیزگی، متانت ورفعت اور بلند پروازی کے علاوہ انھیں الہامی شاعر قرار دیا تھا۔ ان کے یہاں بھی بجنوری سے قبل اس طرح کے جملے ملتے ہیں جن میں تاثر کی رمق گہری ہے۔ مثلاً ''وہ (غالب) ذہنی دیوتاؤں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں دنیا لافانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔'' اس کے اردو اور فارسی دیوان ادبی جواہرات ہیں۔ دودھیا پتھر، یاقوتِ رمّانی اور نیلم سب ایک مرکّب کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔'' صلاح الدین کے بعد عبدالماجد دریابادی کا ذکر ضروری ہے کہ عبدالماجد نے فلسفے پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور فلسفے کے تحت غالب کو سمجھنے کی یہ پہلی کوشش تھی جس کی دوسری صورت بجنوری کے یہاں نظر آتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی نے پہلی بار غالب کے کلام میں تشکیک کے پہلو کی نشاندہی کی۔ غالب کے تصورِ حیات وکائنات اور ان کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے انھیں اس یونانی مکتبِ فکر کی جھلک ان میں نظر آتی ہے۔ جو Epicurianism (اپی غوریت) سے منسوب ہے۔ اس تصور کا بنیادگذار اپی غورس (تیسری صدی ق م) تھا۔ اس کے خیال کے مطابق خیرِ اعلیٰ ذاتی مسرّت کا نام ہے جسے دوسرے لفظوں میں لذائذِ جسمانی کی دلدادہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بجنوری نے یہاں غالب کو سمجھنے میں زیادتی کی ہے کیونکہ غالب جاگیردارانہ اور خاندانی رکھ رکھاؤ اور طرزِ زندگی کے قائل تھے۔ اسی روایت کو قایم رکھنے کے لیے انھوں نے پینشن کے لیے دوڑ دھوپ کی، خوشامد اور چاپلوسی کا سہارا لیا، قمار بازی کی، مقروض ہوئے۔ بادہ نوشی کی بنیاد پر انھیں لذت پسند اور عیش پسند کہا جائے یہ صریحاً زیادتی ہے۔ بجنوری کا برعکس کے اُس تصور کا غالب کو ہم نوا بتانا درست ہے کہ 'عالمِ مادّی کوئی قایم بالذّات شئے نہیں، مستقل ہستی صرف ذہن کی ہے۔'' عبدالماجد دریابادی، اسپنوزا کے تصورِ وحدت الوجود سے بھی غالب کی فکر کو ربط دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ روش ہے جس کی توسیع بجنوری کرتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ بجنوری جابجا تقابل کے عمل میں اپنے جذبات کی تکمیل کو ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس صورت میں بہت سی قیمتی چیزیں ہمارے ہاتھ لگ جاتی ہیں اور بہت سی چیزوں کا کوئی صَرف نظر نہیں آتا۔

عبدالرحمٰن بجنوری کا دور رومانویت کا دور تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کی نسل نئے جوش وجذبے کے ساتھ میدانِ ادب میں اتری تھی۔ ان ادیبوں کو مغربی علم وادب سے راست اور گہری واقفیت تھی۔ یہ نسل کسی ایسے نئے تصور سے متعارف کرانا چاہتی تھی جس سے اردو ادب کا کینوس وسیع ہو اور ادب کے قاری کو نئے ادبی تقاضوں کا علم ہو۔ مغرب میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں جس جمالیاتی تحریک کو فروغ حاصل ہوا وہ دراصل حقیقت پسندی اور فطرت پرستی کے علاوہ سائنس وتکنالوجی کی اندھادُھند ترقّی کا ردِّعمل تھی۔ سرسید اور حالی اپنا مشن پورا کر چکے تھے۔ اب اردو ادب کو ایک نیا رنگ وآہنگ دینا وقت کا تقاضہ تھا۔ بجنوری اور یلدرم نے مغربی تاثراتی / جمالیاتی تحریک سے استفادہ کیا اور محسوس کیا کہ اردو میں اظہار و بیان کی حدتک نئے اسالیب کی اشد ضرورت ہے۔ اس نسل کا طرزِ احساس نیا تھا، انشا پردازی کی طرف اس کی رغبت تھی، حسن پرستی اس کا شعار تھا۔ اس دور کی شاعری اور افسانوی ادب میں ماضی کی پیش رو روایت سے محض مضامین وموضوعات کی سطح ہی پر نہیں بلکہ زبان کے طریقِ استعمال اور ہیئت کی سطح پر بھی انحراف کیا گیا۔ رومانویت، روایتی اخلاقیات سے انکار اور ہر اُس تصور کو قبول کرنے کا نام ہے جس میں بغاوت کا رنگ شامل ہے اور جو انفرادیت کی تلاش پر مبنی ہے۔ عشق، ذہن وضمیر کی آزادی اور جذبات ومحسوسات کے بے محابا اظہار کی طرف میلان رومانوی فن کاروں کے باغیانہ شعور کا مظہر ہے۔ اسلوب کی پرستاری اس میلان کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ رومانوی فن کار ایسے استعارے اور پیکر خلق کرتا ہے جو بڑی حدتک نامانوس مگر بے انتہا کشش آور ہوتے اور جو تخیل و وجدان کی کرشمہ سازی پر منتج ہوتے ہیں۔ اُسے اپنی تخلیقی قوت کو بروئے کار لانے اور ایسی دنیائیں خلق کرنے میں زیادہ دلچسپی اور زیادہ طمانیت ہوتی ہے جنھیں متبادل کہا جاتا ہے۔ جو زیادہ اجنبیت اور بعید از حقیقت کا تاثر فراہم کرتی ہیں۔ اسلوب احمد انصاری بجا طور پر رومانوی تحریک کو احساس کی نشاۃ الثانیہ کہتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے شاعروں اور ادیبوں نے احساس اور وجدان پر عقل، فطرت، نقالی، روایت پسندی اور اساتذۂ سلف کے اقتدار کے اتنے پہرے بٹھا دیے تھے کہ خیال اور جذبے کی رعنائی، عفّت اور تازگی داغدار ہوگئی تھی۔'

اگر اس خیال اور ان کے بین العلومی واسطے کے تحت بجنوری کے تنقیدی طریق کار کا جائزہ لیں تو ان کے تخیل کے عمل، ان کی نثر کے اعجاز اور کم سے کم بساط میں زیادہ سے زیادہ خیالات کو ڈھال دینے کے عمل میں رومانوی اور بین العلومی شعور کا عمل ہی تہ بہ تہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جو روایت سے کم اخذ کرتا ہے اسے مہیا زیادہ کرنا چاہتا ہے۔ غالب کو غالب کے اندر سے ایک نئے غالب کے طور پر حالی نکال کر باہر لائے تھے۔ دوسرا غالب بجنوری نے خلق کیا جو پہلے سے زیادہ پیچیدہ، فلسفیانہ، معنی خیز اور درّاک ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بجنوری میں غالب حلول کر گئے ہیں یا غالب نے بجنوری کو اپنی روح میں اتار لیا ہے۔ اس سطح پر پہنچ کر تنقید ایک معجزہ بن جاتی ہے۔

انصاری صاحب کے یہ کلمات توجہ طلب ہیں کہ ''عالم استغراق کے اُس لمحۂ تنویری میں جب ہم اُن (دانتے اور غالب) کی روحوں پر سے حجابات اٹھانے کی ایک حقیر سی سعی کرتے ہیں تو ایک قلیل وقفے کے لیے اپنی انفرادیت کو ان کی وسیع ترین انفرادیت میں مدغم کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، انصاری صاحب نے یہ کہہ کر ایک ساتھ کئی گہرے اور فکر انگیز نکتے بیان کردیے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کو اپنی فہم کا حصہ ہی نہیں بنایا ہے بلکہ غالب کی انفرادیت کی جستجو میں اتنے غرق ہوگئے کہ ان کے یہاں غالب ایک نئے وجود ایک نئی ہستی کے طور پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری مختلف اشعار کی شرح کرنے کے بعد فطرت کے مظاہرات سے غالب کے ذہنی اور جذباتی رشتے کی نوعیت پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو وہ انھیں فطرت کا پرستار ثابت نہیں کرتے بلکہ فطرت پسند رومانوی، شہری تمدّن کی بناوٹی زندگی کے مقابلے میں بدویانہ، آزاد اور بے لوث زندگی کا والہ وشیدا بتاتے ہیں۔ جبکہ غالب بظاہر ایک پُرتکلّف اور مقطّع ومسجّع بود وباش کے عادی تھے۔ دہلی اس دور میں بھی ایک بڑا شہر اور تجارتی مرکز تھا۔ ابھی سائنسی اور تکنیکی سہولتیں اُسے میسّر نہیں آئی تھیں۔ دلّی کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اتنی بار اُلٹ پلٹ ہوئی، اتنی بار اس پر قیامتیں ٹوٹیں، اتنی بار برباد اور پھر آباد ہوئی کہ عوام الناس کے لیے موت ہی زندگی کا وقفہ ٹھہری۔ جس نے زندگی کے اندر ہمیشہ موت کو مرتعش یا جلوہ آرا دیکھا ہو۔ اس کے لیے ساری چیزیں آسان ہیں۔ غالب کی دلّی ایسے ہی عوام الناس کا جنگل تھا۔ غالب نے اسے اپنے نظامِ احساس کا حصہّ بنالیا تھا، جس کے بناؤ کی ایک شان تھی، جس کے بگاڑ کا ایک وقار تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کو 'کشتۂ شہر دلّی' کے طور پر دیکھا ہے۔ محاسن کلامِ غالب میں تہذیبی نقطۂ نظر سے تجزیے کا یہ عمل ان کے بین العلومی رغبتوں ہی کا مظہر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مرزا کا جی لبِ دریا، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے۔ جہاں زندگی شعاعِ منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلّی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی، خوش وقتی یا افسردگی، شورش یا خاموشی خود ان کے اپنے احتساسات کی خارجی تصویریں ہیں۔ جو صورتیں اِدھر اُدھر رواں دواں نظر آتی ہیں وہ مرزا کے نزدیک اُن کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ ان کو القا کے لیے سرو دو چنار، شب ماہ، لب آب، صحبت یار میں بادہ وساغر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر کسی بنتی ہوئی عمارت پر نصب شدہ جرِّثقیل کا آہنی حلقہ بھی رسی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرغ اپنا چنگل آسمان سے تارے توڑنے کے لیے دراز کررہا ہے جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو ان کو عام خیال کرکے اُن پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ ان کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے۔'' (محاسنِ کلام غالب، ص 30)

بجنوری یہ نہیں کہتے کہ دلّی کی گلیاں، وہاں کی رونقیں یا ویرانی، چہل پہل، افسردگی وغیرہ وہ خارجی تناظر ہے جس سے غالب کے وژن کی تشکیل ہوئی ہے یا وہی ان کے لیے زندگی کا ساز ہے۔ بجنوری ایک دوسرا ہی غیر متوقع خیال

قایم کرتے ہیں کہ یہ سب ان کے اپنے احتساسات کی خارجی تصویریں ہیں جنھیں ہم محسوساتی ساختوں Feeling structures اور سانچوں کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ بجنوری نے کوئی دلیل قایم نہیں کی ہے اور نہ ایسا کوئی تصور قایم کیا ہے جس کی بنیاد میں تعقل کارفرما ہے۔ بلکہ یہ خیال ان کے ذہن کی تخلیقی جہت کے ساتھ مشروط ہے اور جسے بڑی آسانی سے تخلیقی تنقید کے تصور سے بھی وابستہ کر سکتے ہیں۔

بجنوری کا تخلیقی شعور بہت دقیق تھا۔ باریک چیزوں اور گہری محسوس کیفیتوں کو اجاگر کرنے اور بصارتی تجربوں کو بصیرت آمیز بنانے میں انھیں گہرا درک تھا۔ کسی معنی کو تفصیل دینے میں اکثر تفصیل بے لطفی کا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ بجنوری کی تاثراتی تفصیلات فکرِ محسوس کے تجربے سے گزارتی ہیں اور جیسے جیسے وہ چیزوں پر سے حجاب الٹتے جاتے ہیں سارا دائیں بائیں سارا پیش و پس سارا تناظر زندگی کے ہزار رنگوں سے معمور ہو جاتا ہے۔ غالب کا شعر ہے:

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرۂ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

شعر ہذا کے مختصراً ایک معنی یہ نکلتے ہیں کہ ہماری فطرت میں انکسار اور عاجزی کا خاص دخل تھا اس وطیرے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دل جیسی قیمتی چیز ایک دن محض ایک خون کی بوند میں سمٹ گئی اور بوند کی کیا بساط وہ اب ٹپکا تب ٹپکا۔ بجنوری رنگا رنگ تلازموں کا ایک سلسلہ سا قائم کر دیتے ہیں جس میں ان کی بصارت و بصیرت کے تجربے اور ان کی نفسیاتی بینش بھی شامل ہے اور دوسرے ایسے دلائل بھی جن کا تعلق ان کی دوسری آگاہیوں سے ہے۔ تنقید نگار کے وجدان کی سرگرمی کے بغیر علم نہ تو محسوس تجربے میں بدل سکتا ہے اور نہ مشاہداتی حقائق نئے حقائق کا احساس دلا سکتے ہیں۔ بجنوری اس شعر کے تحت النفس تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''کہنہ اور زوال رسیدہ عمارات میں آب و ہوا کے عام اور پیہم اثر سے سنگ سفید اور سنگ موسیٰ کے ریختہ مربعات پر کائی جم جاتی ہے اور بعض اوقات پانی رِسنے لگتا ہے۔ سیاہ و سفید شکستہ مرمر کی بالائی خشت سے قطرہ قطرہ آب گرتا رہتا ہے۔ قطرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے آتے ہیں اور جو سب سے آگے ہوتا ہے وہ مقام مقررہ پر پہنچ کر چشم زدن کے توقف کے بعد گر پڑتا ہے۔ جو چیز قطرے کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہے وہ پانی کے سالمات کا باہم ملحق ہونا ہے لیکن کہاں ایک قطرے کی قوت قرار، کہاں تمام کرۂ ارض کی کششِ ثقل قطرہ کیا تاب لا سکتا ہے۔ مرزا غالب اپنے دل کا ٹپکتے ہوئے قطرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ انسان کے دل کو اطبائے فرنگ نے ناشپاتی سے تشبیہ دی ہے لیکن درخت میں آویزاں ناشپاتی کا بالائی حصہ خُرد اور زیریں کلاں ہوتا ہے اور دل کی حالت اس کے خلاف ہے۔ دل کی کوئی تشبیہ خون کے ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں دل کی لاچاری اور عاجزی کی کیا تصویر ہے۔''

(محاسنِ کلام غالب، ص 33-34)

بجنوری نے اکادمیاتی شارحین کے برخلاف اپنے بصری تجربے کو تخیلی آب و رنگ دینے کی سعی کی ہے۔ یہ تشریح اسکرین پلے کا تاثر فراہم کر رہی ہے۔ مُجرسی کی یہ صورت بجنوری کے اُس ذہن کی مظہر ہے جو تحت المتن سے غیر متوقع معانی و مضامین کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

اسلوب صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ ''وہ (بجنوری) ادبی کارنامے سے صرف لذت حاصل کرنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور اپنی مسرّت اور بصیرت میں دوسروں کو شریک کرنے کے کم روادار ہیں'' دراصل رومانوی ادیب ہو یا نقاد جذبات و محسوسات اس کا خاص سرمایہ ہوتے ہیں۔ جہاں جذباتی شدت ہوگی وہاں بے ساختگی ہوگی اور جہاں بے ساختگی ہوگی وہاں بے تکلفی اور اپنائیت جیسے تاثر کا پیدا ہونا فطری ہے۔ بجنوری اور دوسرے رومانویوں اور جمالیت پسندوں کی تحریریں قرآت نواز Readable ہی نہیں تھیں بلکہ ان کا بنیادی قصد اپنے قاری کی شرکت کو یقینی بنانے پر بھی تھا۔ کیونکہ جذبہ ان کی سب سے بڑی کم زوری اور سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جذبات کے وفور کے باعث ان میں تجربے کی شدت اور تجربے کی سچائی کو محسوس کرنا مشکل نہیں ہے۔ بین العلومی نقاد محض رومانوی یا کلاسیکی و نو کلاسیکی، محض تہذیبی و نفسیاتی، محض عمرانی یا جمالیاتی و تاثراتی نہیں ہوتا بلکہ ان سب کے امتزاج سے اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ جذبہ، احساس اور وجدان یا تعقل و استدلال کے مابین بھی وہ کوئی امتیاز قائم نہیں کرتا۔ محض تخلیق کا تقاضہ اس کے لیے خاص معنی رکھتا ہے۔

بجنوری غالب کے بیشتر کلام کو فلسفیانہ کہتے ہیں اور جہاں فلسفیانہ فکر ہوگی وہاں ابہام کا واقعی ہونا لازمی ہے یا جہاں زیادہ سے زیادہ علم کی کثرت ہوگی وہاں علم خود ایک حجاب بن جاتا ہے۔ عربی کا مقولہ ہے: 'العلمُ حجابُ الاکبر' یعنی علم ایک بڑا پردہ ہے جس قدر جس شے کا علم زیادہ ہوتا ہے اُتنا ہی اس کے سمجھنے میں بُعد ہوتا ہے۔ یہی ابہام انھیں غالب کی طرح گوئٹے کے یہاں نظر آتا ہے۔ غالب کے یہاں نئے الفاظ اس لیے وارد ہوتے ہیں کہ بقول بجنوری جب مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لیے موزوں الفاظ کی تلاش کی تو اردو کے ذخیرۂ الفاظ کو بہت محدود پایا۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر بقول بجنوری وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔ جبکہ یہ دونوں باتیں غالب کے یہاں ملتی ہیں۔ باوجود اس کے یہ شاعری کا عیب بھی نہیں ہے۔

بجنوری کے وقتوں میں مغربی فلسفہ نئی تعلیم یافتہ نسلوں کے ذہن پر شدت سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ لیمارک، ڈارون، چارلس ویلیس کا نظریۂ ارتقا مغرب میں بھی موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ جہد البقا اور تنازع البقا، مادّہ، روح، فطرت کے انتخاب، ذہن و نفس کے اعمال، علم کے معروضات، عینیت اور شیئیت Thingism جیسے فلسفیانہ اور سائنسی تحقیقات و موضوعات کا اثر تخلیقی شعور پر بھی پڑ رہا تھا۔ بجنوری نے اسی اثر کے تحت غالب کے اکثر اشعار کا مطالعہ فلسفیانہ سطح پر کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''موجودہ زمانے کی سب سے تحقیقات کا مسئلہ ارتقا ہے اور مسلمانوں کی کتب ماضیہ میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے اور الفارابی، بوعلی سینا اور خصوصاً الحسن کے نام سے منسوب ہے اور بغداد کے کتب خانہ کی تباہی کے باوجود اخلاق ناصری، رسائل اخوان الصفا، نوز الاصغر، مثنوی معنوی وغیرہ میں اس کا ثبوت

موجود ہے لیکن واقعات کے لحاظ سے اس کا فخر زمانہ جدید ہی کو حاصل ہے۔ ڈارون اور مرزا غالب ہم عصر ہیں گو دونوں کو ایک دوسرے کا کچھ بھی علم نہ تھا۔''

(محاسنِ کلام غالب، ص 50)

بجنوری نے ڈارون اور اسپنسر کے برخلاف برگسان کے تصورِ ارتقا کا بھی ذکر کیا ہے جو تخلیقِ کون و مکاں اور ساری انسانیت کے پس پشت ایک داخلی قوت کے عمل سے ارتقا کے عمل کو جوڑتا ہے کہ زندگی مادّہ سے نکلی ہے اور ذہن زندگی سے برآمد ہوا ہے۔ نہ تو مادّے میں زندگی ہے نہ زندگی میں دماغ یا ذہن۔ بنیادی حقیقت محض پُر جوش قوت یعنی Elan Vital ہے۔ برگسان ارتقا کے اس تصور ہی کو رد کرتا ہے کہ تمام تبدیلیوں کے پیچھے ایک میکانکی عملیہ (پروسیس) کارفرما ہے۔ وہ فلسفۂ غایات (Teleology) کے اس تصور کو رد کرتا ہے کہ نظام فطرت میں مقصد کی کارفرمائی ہے۔ بجنوری کہتے ہیں کہ زمانہ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگسان Bergson اس (ارتقا کے عمل) کو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ حیات جو تمام عالم میں جاری وساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہے۔ دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

بجنوری عالمِ کون و مکاں کے بارے میں کہیں اپنشدوں سے حوالے مستعار لیتے ہیں کہیں مسئلہ ارتقا کے ضمن میں کئی مغربی و مشرقی مفکّرین کا نام لیتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہے۔'' آگے چل کر مثالاً یہ شعر پیش کرتے ہیں:

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

اس طرح بجنوری نے جابجا مختلف افکار و تصورات کے ساتھ مربوط کر کے غالب کے اشعار کی جو تعبیرات پیش کی ہیں۔ وہ ان کے علم، ذہانت، فلسفے اور سائنسی انکشافات سے ان کی غیر معمولی رغبت کی مظہر ہیں۔ موت اور زندگی کا مسئلہ ہو کہ غالب کی شوخی ا ورظریفانہ خوش خوئی کا، مشاہدۂ حق اور بادۂ وساغر کی گفتگو ہو کہ ''حسن خارج میں ہے کہ باطن میں'' جیسے سوال یا یہ سوال کہ عشقِ حقیقی میں ایک دائمی کیف کیونکر ہے اور وصالِ یار وہیں کیوں ہے جہاں عشق آرزوئے خام ہے اور اسیرِ آز ہے۔ بجنوری نے اکثر عینی نقطۂ نظر سے تخیل کاری کی ہے۔ انھیں اجمال و اختصار کے ساتھ اپنے خیالات کو باندھنا خوب آتا ہے۔ اسی لیے جہاں تاویل کا گمان ہوتا ہے وہاں بھی اس دورانیے کی مہلت بہت قلیل ہوتی ہے۔ اس لیے بجنوری کو پڑھنے والا اسے بھی گوارہ کر لیتا ہے۔ بجنوری کا یہ ایک خاص طریقِ نقد ہے اور اس طریقِ نقد کا اپنا ایک مقام ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری نے ادبی سفر کا آغاز تاثراتی اور انشائیہ نما مضامین سے کیا تھا۔ ان مضامین میں ایک خاص تخلیقی سلوب کو پانے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ یہ عہد ہی اسلوب کی پرستاری کا تھا۔ یلدرم کی تحریروں میں ذہانت آمیز زبان و بیان کا پہلو نمایاں ہے۔ مخزن اور دلگداز جیسے رسائل میں اس قسم کی تحریریں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ شرر کے مضامین میں گہرے، پیچیدہ اور فکر انگیز موضوعات کی تلاش بے سود ہے۔ ان کی ترجیح بھی لطافتِ خیال اور لطافتِ زبان پر تھی۔ سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، سجّاد انصاری، قاضی عبدالغفار کے علاوہ عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریروں میں اندازِ بیان کی جو رعنائی، حسن پرستی کا جو تصور، جذبات میں جو شدت اور خیالات میں جس بانکپن اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے اس کی ایک نفیس رمق شبلی نعمانی کے یہاں پہلے ہی آشکار ہو چکی تھی۔ اس رمق کو بعد کی نسل نے شعلوں میں بدل دیا۔ اس نسل کے لیے مغربی جمالیت پسند تحریک کے علاوہ شبلی بھی چشمۂ فیضان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وجدان و تخیل کی تیزی جہاں تخلیقیت کا آب و رنگ چڑھاتی ہے، اس سے قبل یا اس کے بعد کوئی نہ کوئی دلیل بھی وہ فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بجنوری کے اسلوب خاص میں انھیں دونوں چیزوں کا متوازن اشتراک اسے بڑی حد تک غیر رسمی اور قابل قبول بنا دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے دلائل فلسفے اور سائنسی انکشافات سے اخذ کیے ہیں اور بعض کا تعلق محض ان کے ذہنی اختراع سے ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جذباتی شدت جس طور پر تاثرات کے آزاد بہاؤ کو راہ دیتی ہے وہیں علم اس پر پہرے بھی باندھ دیتا ہے۔ بجنوری عام رومانویوں کی طرح جذبوں کی سرکشی کو اپنے شعور پر غالب کم ہی آنے دیتے ہیں۔ 'محاسن کلامِ غالب' کا جن لوگوں کا بہ ذاتِ خود غایر مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ انھیں بھی عام تاثراتی نقادوں میں سے ایک سمجھتے ہیں۔ ان کی فہم سے یہ بعید ہے کہ ان کے تاثرات محض جذبوں کا نچوڑ یا جذباتی تجربوں کا حاصل جمع نہیں ہیں بلکہ یہ اس شخص کے تاثرات ہیں جن کی بنیاد بین العلومی ذہنی تجربوں پر استوار ہے۔ ہمیں بہر حال معلوم ذہن اور کم معلوم یا لامعلوم ذہن کے درمیان فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ بجنوری غالب کے درج ذیل شعر کے بارے میں تشریح و تفسیر بیان نہیں کرتے بلکہ تعبیر سازی کرتے ہیں۔ شعر اور اس کی تعبیر میں راست رشتے کی تلاش بے سود ہوگی۔ یہاں عینیت (آئیڈیلزم)، متصوفانہ فکر اور مظہریت Phenomenology (یعنی وہ تصور جو شعور اور براہِ راست تجربے میں آنے والے مظاہر کے مطالعے پر زور دیتا ہے) ہم آمیز ہو گئے ہیں:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بجنوری نے اس کی تعبیر ان لفظوں میں بیان کی ہے:

''مادہ خود بے صورت ہے۔ مادّے میں نہ کوئی خوش صورتی ہے اور نہ بدہیئتی ہے، حسن خارج میں نہیں باطن میں ہے۔ حسن مادّے کے جسم میں نہیں بلکہ صاحب نظر کی نگاہ میں ہے۔ حسن بیں کا قلب شعلہ ہے۔ مادّہ صرف پردۂ فانوس ہے شاعر جو حسن کو دیکھ کر محو تماشا ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کو خوبصورتی میں فنا کر دیتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ عدم اور ازل میں جو صورت دیکھی ہے وہ شرار کے تبسم کی مثال نظر آتی ہے اور منھ چھپا لیتی ہے۔ نہال ثمرور میں یا عشق پیچاں میں پھولوں میں یا عطر میں، عورت میں خواہ دوشیزہ ہو یا نادوشیزہ کوئی حسن نہیں، حسن اس اشارے میں ہے جو جمال الٰہی ان کے ذریعے سے کرتا ہے۔'' (محاسن کلام غالب، ص 74)

عطا محمد شعلہ نے غالب کی اسی نوعیت کی تعبیرات کو تاویل کا نام دیا

اور گیان چند نے قصیدہ خوانی اور طبل نوازی جیسے تحقیر آمیز فقروں سے نوازا۔ انھوں نے بجنوری کے طریقِ نقد کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ حالی یا نظم طباطبائی کی شرحوں کا ضمیمہ پیش نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ شعر میں فکر و خیال کے جو الجھے ہوئے سرے ہیں انھیں صرف تحت المتن ہی سے برآمد کیا جاسکتا ہے اور سُلجھایا جاسکتا ہے۔ باوجود اس کے ضروری نہیں کہ تعلیقِ معنی کا سدِّ باب ہی ہو جائے۔

محولہ بالا شعر کے علاوہ درج ذیل شعر کی جو تعبیر پیش کی گئی ہے اس میں حقیقت آمیزی کا رنگ گہرا ہے اور جو اسلوب وضع کیا گیا ہے اس میں کسی طرح کی نام نہاد 'دوراز کار تاویلات کی نمائش' کا شائبہ تک نہیں ہے۔ شعر ہے:

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشہ خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

بجنوری نے شعر کی Paraphrasing یعنی متن و مضمون کو دوسرے الفاظ میں اعادہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ کہیں کہیں عام زندگی کے تجربے سے بھی اسے مربوط کیا ہے اور تخیل کی رنگ آمیزی بھی کی ہے۔ جیسے:

''جو شہر دریاؤں کے کنارے واقع ہوتے ہیں بعض اوقات شدتِ آب کی وجہ سے غرقِ سیلاب ہو جاتے ہیں۔ بلادِ حیدرآباد اور لکھنؤ کے واقعات سب کو یاد ہیں۔ جب آبِ دریا طغیانی کے ساتھ شارعات سے مکانات میں داخل ہوتا ہے تو جہاں سے راہ پاتا ہے در آتا چلا جاتا ہے۔ جہاں داخل ہونے میں مزاحمت ہوتی ہے پانی کف لے آتا ہے جب جوشِ دریا فرو ہو چکتا ہے تو سطحِ آب پھر نیچی ہو جاتی ہے اور پانی واپس دریا کی جانب روانہ ہو جاتا ہے لیکن کفِ سیلاب جس جس جوف اور سوراخ میں پیدا ہوا تھا وہ وہیں باقی رہ جاتا ہے اور تارِ عنکبوت کی طرح اس رخنہ کو بند کر دیتا ہے۔'' (محاسنِ کلامِ غالب، ص 32-31)

بجنوری کی تنقید میں خود بجنوری کی ذات اور شخصیت ایک پس منظر کا کام کرتی ہے۔ اسے تاثراتی کہیں جمالیاتی کہیں عالمانہ کہیں یا فلسفیانہ اس کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور یہ انفرادیت وہ ہے جس کی نقل و نمائندگی بہت مشکل ہے۔ بجنوری ایک ماہر فن اور ایک فلسفی کے طور پر غالب ہی کا نہیں خود کا بھی تعارف کراتے ہیں۔ تنقید کا اسے عیب کہہ سکتے ہیں لیکن اس عیب میں جو حسن پنہاں ہے اس کی لذت سے وہی سیر ہو سکتا ہے جو خود بھی احساسِ جمال اور فلسفیانہ درک رکھتا ہے۔ سید عبداللہ کے اس خیال سے متفق نہ ہونے کا کوئی جواز نہیں کہ:

''یہ (محاسنِ کلامِ غالب) تنقید سے زیادہ تخلیقی ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی طریقے پر تنقید کرنے کا ایک نادر نمونہ ہے کسی بڑے شاعر کے کلام پر کن کن زاویوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے؟ دوسرے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ادب کو کیونکر دیکھا جاسکتا ہے؟ علوم طبعی کی روشنی میں ادبی تخلیق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور شعر و ادب کی دنیا میں (قوم، زبان اور ملک کے ماورا) کس طرح ذہنی اور روحانی مماثلتیں پائی جاتی ہیں؟ تنقید کی یہ تقابلی صورت وسعت مطالعہ کی طلبگار ہے اور بجنوری کے مطالعہ کی وسعت سے کسی صورت انکار نہیں ہو سکتا۔ اپنی کمزوریوں کے باوجود، یہ مقدمہ بڑی اہمیت کا مالک ہے۔'' (اشاراتِ تنقید، ص 173)

یہ کہا جاسکتا ہے کہ مجموعی طور پر بجنوری کی تنقید تحسینی ہے یعنی غالب کے یہاں انھیں کچھ کھوٹ، کمی یا نقص نظر نہیں آتا۔ وہ انھیں ایک آگاہ اور مستقبل کا شاعر ثابت کرنے کی غرض سے ان کے کلام میں ہر فلسفے اور سائنسی انکشافات کا عکس دیکھ لیتے ہیں۔ بعض نقادوں کے نزدیک یہ محض تاویل ہے جس کی بنیاد مبالغے پر ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک ''غلامانہ خصلتوں پر غور کر کے..... غالب کا موازنہ خاص طور پر مغربی شعرا سے کیا گیا ہے۔ کسی نے یہ کہا کہ ''بجنوری مرحوم نے ایک طرف اس سوال کا جواب دیا کہ اردو شاعری میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے سوا کیا رکھا ہے اور دوسری جانب غالب کی قوتِ فکر کا تقابل مغربی ملکوں کے مشہور شعرا سے کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مشرقی دماغ کسی سے کم تر نہیں ہے۔'' ڈاکٹر عبداللطیف نے بجنوری کی تنقید کو نعرۂ مستانہ کہا۔

جہاں بجنوری نے غالب کی شاعری کو الہامی قرار دیا ہے خلیفہ عبدالحکیم کو ان کے کلام میں رحمانی وحی کے ساتھ شیطانی وحی کا بھی اچھا خاصا دخل ملتا ہے۔ عبداللطیف نے بجنوری کے تخیل کی بلند پروازی کو نعرہ مستانہ کہا اور گیان چند نے یہ کہہ کر بجنوری کے طرزِ نقد کو مذموم ٹھہرایا کہ ''جس طرح آریہ سماجی موجودہ دور کی تمام ایجادات کو ویدوں میں تلاش کر لیتے ہیں اس طرح بجنوری نے قدیم فلسفیوں کی حکمت کا نچوڑ اور جدید سائنس کے اہم انکشافات غالب کے کلام میں ڈھونڈ نکالے۔ یہ یقینی ہے کہ بجنوری اگر اپنی کتاب آج لکھتے تو غالب کے اشعار میں 'جوہر' کا لفظ دیکھ کر یہ ضرور ثابت کر دیتے کہ غالب کی نظروں کے سامنے جوہری توانائی اور ہائیڈروجن بم کے تمام اسرار و رموز کتاب کشودہ تھے۔ بجنوری نے تشریح کرتے وقت غالب کے اشعار میں وہ معانی بسا دیے کہ اگر غالب انھیں سنتا تو اسے اپنی شاعری کسی انگلستانی کی شاعری معلوم ہونے لگتی۔ وہ صرف یہی کہتا کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' یا عطا محمد شعلہ کے اس تبصرے کو خالی از تعصّب قرار نہیں دیا جاسکتا کہ:

''بجنوری کے یہاں مرغِ تخیّل کی پرواز کے لیے ایک وسیع و عریض فضا کا اہتمام کیا گیا ہے اور پھر اُس میں طائرِ تخیّل کو یوں چھوڑا گیا ہے کہ وہ واپس لوٹ کر زمین کی طرف آنے کا ارادہ ترک کرتا نظر آتا ہے۔ (شعلہ نے یہ خیال شیلی کی نظم Ode to the Skylark پر کیے گئے تبصروں سے لیا ہے) ایسی ایسی دوراز کار تاویلات کی نمایش لگائی گئی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ یہ کتاب فی الاصل کسی شیخ چلّی کی لاف زنی کے علاوہ کچھ نہیں۔''

گیان چند نے اشتہار، وکالت اور علم کی بھدّی نمائش کہا۔ عطا محمد شعلہ نے یہ ارشاد کیا کہ ''یہ کتاب فی الاصل کسی شیخ چلّی کی لاف زنی کے علاوہ کچھ نہیں'' اور کلیم الدین احمد نے 'غیر شعوری ستم ظریفی' سے تعبیر کیا۔ سید عبداللہ نے دوٹوک لفظوں میں کلیم الدین احمد کے اس ملامت آمیز فقرے کے جواب میں یہ کہا کہ ''یہ مقدمہ اس مذمت کا سزاوار نہیں۔۔۔ وہ ایسے زمانے کے مصنف ہیں جس میں شدتِ جذبات کے تحت افراط و مبالغہ کا رجحان عام تھا۔ مغرب سے مرعوبیت کے باوجود، مغرب کے مقابلے میں سر کشیدہ چلنے کا جذبہ یا میلان بجنوری کا وصفِ خاص ہے۔''

''حسنِ یقیں''

حمدِ باری تعالیٰ

سجدوں کی مہک آئے ہر اک راہ نما سے
چھوٹی سی دعا ہے فقط اپنے خدا سے

پوشیدہ خزانے ہیں ترے ارض و سما میں
ہو شکر ادا سب کو مری حمد و ثنا سے

میں عبد بنوں تیرا فقط تیرا ہی مولیٰ
شامل ہو رضا تیری ہر اک میری ادا سے

دستک ہو مری صرف تیرے در سے ہی منسوب
نعمت ہو عطا زیست میں، تیری عطا سے

فیضانِ نظر میری طرف عام ہوا ہے
ہر گام عنایات ہوئیں تیری رضا سے

عاصی ہوں مگر حسنِ یقیں دیکھ تو میرا
رحمت ہی بڑی تیری گناہوں سے خطا سے

قرآن کی آیات وہاں انکو ملی تھیں
نسبت ہے مجھے ایسے ہی تو غارِ حرا سے

بندہ ہوں رحمان کا، حق بات ہے لیکن
پہچان میری عام ہے آقا کے گدا سے

ہے رسم کہ شاہدؔ نہ لکھے حمد کے اشعار
وہ ذات مبّرہ ہے مگر حمد و ثنا سے

ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی شاہد (کینیڈا)

نعت بحضور سرورِ کائنات

کاش میں تیرے دور میں ہوتا
جالا بنتا، ثور میں ہوتا
سہلاتا میں تیرے عصا کو
تیرے ڈنگر ڈھور میں ہوتا
سوئے ادب تھا جو مجلس میں
دھیما میں اس شور میں ہوتا
نام غلامی کے لیے تیری
پرچہ زیرِ غور میں ہوتا
آوارہ کو منزل ملتی
تیرے ٹھکانے ٹھور میں ہوتا
کیف تری قربت کا ہر پل
ہر انگلی کی پور میں ہوتا
عکس ترا رہتا پتلی میں
لہریا سا بلور میں ہوتا
تیری آہٹ میں لو ہوتی
جلوہ چشمِ کور میں ہوتا
تو رکھتا تسبیح میں باندھے
دانہ دانہ ڈور میں ہوتا
اپنی قسمت پہلے کھلتی
طیبہ گر لاہور میں ہوتا
خوف نہ آتا زور آور سے
زور ترا بے زور میں ہوتا
گرد جو تیرے پاؤں سے جھڑتی
دفن میں اس کی گور میں ہوتا

خالد اقبال یاسر (اسلام آباد)

تاریخ کا پروفیسر

عارف نقوی
(ویانا، آسٹریا)

ایک ادھیڑ خوبرو پروفیسر، جس نے اپنے بال کالے کر رکھے تھے۔ چہرے سے رعب جھلکتا تھا۔ آواز میں نرمی اور دلکشی تھی بال کندھوں تک لٹک رہے تھے روز ایک آٹو میٹک پہیئے دار کرسی سے ہماری دُکان پر آتا جسے لوگ کباڑیئے کی دوکان کہتے ہیں، دیر تک طرح طرح کی کتابیں دیکھتا، انہیں کھول کر پنّے پلٹتا اور دام چکا کر انہیں اپنی وھیل چیئر سے لٹکے ہوئے بڑے سے جھولے میں ڈالتا اور میرا شکریہ ادا کر کے وھیل چیئر کے پہیئے گھماتا ہوا چلا جاتا۔ ایک دن میں نے دوکان کے مالک سے پوچھ ہی لیا: ''پیٹر یہ آدمی کون ہے۔ روز اس طرح آتا ہے۔ گھنٹوں کتابوں کو چھانٹتے، ان کو کھول کھول کر ان کے اندر جھانک جھانک کر وقت خراب کرتا ہے اور ہر کتاب کی قیمت جو صرف ایک ایرو ہے دے کر لے جاتا ہے۔ اتنی کتابیں پڑھنے کے لئے اسے وقت کب ملتا ہوگا؟ یہ کرتا کیا ہے ان کتابوں کا؟''

دُکان کا نوجوان مالک پیٹر رابے جو عمر میں میرے ہی برابر ہوگا، مسکرایا۔

''انہیں نہیں جانتے؟ یہ پروفیسر والٹر اشمتھ ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے مورخ۔ ابھی پچھلے ہفتے ان کی ۹۰ ویں سالگرہ پر بہت بڑا جشن منایا گیا ہے۔ بہت بڑا قومی ایوارڈ دیا گیا ہے۔'' پیٹر رابے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار تم دس برس سے جرمنی میں ہو۔ یہاں تعلیم حاصل کی ہے۔ تاریخ اور فلسفے کی۔ روز یہاں پرانی تاریخ کی کتابیں بیچتے ہو، ٹی وی پر اچھے پروگرام دیکھنا نہیں آیا۔ تم پروفیسر اشمتھ کو نہیں جانتے؟ معلوم ہوتا ہے تمہارے ملک میں لوگ ناچ گانے اور سیاست میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، تاریخ کم پڑھتے ہیں۔ حالانکہ تمہاری تاریخ دنیا کی سب سے پرانی تاریخوں میں ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پیٹر میرا ہم عمر تھا دوستوں کی طرح برتاؤ کرتا تھا۔ اچھی تنخواہ دیتا تھا، جتنی میرے جیسوں کو کہیں اور شاید نہ ملتی ہو، لیکن تھا تو میرا باس ہی۔ میں کھسیا کر ایک دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پروفیسر اشمتھ روز ہماری دوکان پر آتے اور ڈھیر سی کتابیں ڈھونڈھ کر لے جاتے۔ ان کا گھر ہماری دُکان سے دور نہیں تھا۔ وہ سامنے پارک کے پاس ایک بڑی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے۔ گھر کے سامنے ان کے فلور تک ایک طرف سے راستہ ایسا بنایا گیا تھا کہ ان کی پہیئے دار آٹو میٹک کرسی ان کے فلیٹ تک جا سکتی تھی۔ جہاں وہ گھنٹی بجاتے اور ایک خاتون جوان سے کم سے کم تیس برس چھوٹی ہوگی۔ دروازہ کھول کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیا کرتی تھی۔

ایک دن پروفیسر صاحب کے گھر کے سامنے پارک میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میرا باس پیٹر بھی تماشہ دیکھنے کے لئے وہاں چلا گیا تھا۔ پروفیسر اشمتھ نے تاریخ کی جتنی کتابیں ہماری دوکان سے خریدی تھیں، سب کو اپنی وھیل چیر سے پارک میں اس مقام پر لا کر جو گرِل پارٹیوں کے لئے مخصوص تھا ان میں آگ لگا دی تھی۔ اور زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

''جھوٹی ہیں ۔ سب کتابیں جھوٹی ہیں۔ سب مورخ نقلی ہیں، دھوکے باز ہیں، جھوٹے ہیں۔ ہاہاہا''

پارک کے سامنے سڑک پر فائر بریگیڈ ٹھٹنا رہا تھا۔ پولیس کی ایک کار کھڑی تھی۔ پروفیسر اشمتھ کو پکڑ لیا تھا۔ ان کی ساٹھ سالہ اہلیہ کھڑکی سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل دہل رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں پارک میں جا کر پروفیسر اشمتھ کو چھڑاؤں کہوں:

''یہ بہت نیک پروفیسر ہے۔ بڑا ایماندار، سچا، بہت پڑھا لکھا۔ اسے تو قومی اعزاز مل چکا ہے چھوڑ دو اسے!''

لیکن میں تو اس ملک میں دس سال رہنے کے باوجود بھی اجنبی ہوں، کم علم اور میرا باس بھی اس وقت نہیں ہے۔ میں دوکان چھوڑ کر نہیں جا سکتا ہوں۔

دوسرے دن شہر کے سارے اخبارات اسی خبر سے آراستہ تھے۔ ''قومی انعام یافتہ پروفیسر والٹر اشمتھ کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے اپنے گھر کے سامنے پارک میں اپنی ساری کتابیں جلا ڈالی ہیں۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ ان پر مقدمہ چلے گا۔''

وقت کے ساتھ انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ میں بھی اب پروفیسر اشمتھ کو بھول کر دوسرے گاہکوں میں مشغول ہو گیا تھا۔ البتہ اب کام بڑھ گیا تھا۔ انہیں تاریخی کتابوں کے بارے میں اور ان کی اہمیت کے بارے میں سمجھانا پڑتا تھا۔ پیٹر نے بتایا کہ اب پروفیسر اشمتھ پر ایک عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ مقدمے کی تفصیلی خبریں بھی اخبارات میں آ رہی تھیں۔ پروفیسر اشمتھ نے کوئی صفائی وکیل نہیں لیا تھا اپنے مقدمے کی خود پیروی کر رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون جج پریشان تھیں۔ پروفیسر اشمتھ ہر سوال کا الٹا جواب دے رہے تھے۔

''محترم پروفیسر صاحب، آپ نے یہ حرکت کیوں کی؟

''کونسی حرکت؟ میں نے تو حقیقت کو آشکار کیا ہے؟''

''لیکن یہ غلط ہے جو آپ نے کہا ہے؟ آپ کی باتوں سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ سب کے سامنے غلط دعوے کر رہے تھے۔ کتابوں کو جلا رہے تھے۔ تاریخ کی کتابوں کو۔ قیمتی کتابوں کو۔۔۔''

''کباڑیئے کی دوکان پر ایک یورو میں بکنے والی کتاب۔۔۔کو۔''

پروفیسر اشمتھ نے سرکاری وکیل کی بات کاٹ دی۔

''آپ میری بات کا جواب دیجئے!'' جج نے ٹوکا۔

''جج صاحبہ، یہ کتابیں جھوٹی ہیں۔ لکھائی گئی ہیں۔ تاریخ میں ہوں۔ میری عمر کے ۹۰ سال میں سے ۸۰ سال سچی تاریخ کے ہیں۔ تاریخ میں نے دیکھی ہے۔''

سرکاری وکیل نے کئی بار ٹوکنے کی کوشش کی، لیکن پروفیسر اشمتھ کی زبان جیسے چل پڑی تھی۔ اس میں بجلی لگ گئی تھی۔

''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا جو ہزاروں اور سیکڑوں برس پہلے آدم سے اب تک اس دنیا میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ میں بابل، چین، یونان، مصر،

ویدک، روم اور عثمان تہذیبوں کے عروج اور زوال کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہوں گا۔نہیں پوچھوں گا کہ ان کے زوال کے اسباب کیا تھے؟ میں یورپ میں تیس سالہ مذہبی جنگ اور جنون اور ایک ہی عیسائی عقیدے کو ماننے والوں کے بیچ قتل عام کی باتیں نہیں کروں گا۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ پیرس انقلاب کے بعد نپولین کیسے جنون میں مبتلاء ہوگیا کہ اس نے ماسکو تک پہنچ کر اس پر قبضہ کرلیا اور پھر وہاں کے جاڑوں سے پٹنے کے بعد لائپزگ میں ہار کھائی اور انجام کار برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچا۔ میں یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ کس طرح انگریزوں نے امریکہ کے لوگوں کو اور ہندوستان کے لوگوں کو غلام بنایا؟ اس سب کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہے، لیکن میں نے خود نہیں دیکھا ہے۔ میں نے تو پہلی عالمی جنگ کا آغاز بھی نہیں دیکھا تھا؟ سرایبو و میں آسٹرین کراؤن پرنس کو ایک دہشت پسند نے کیوں اور کس طرح گولی ماری تھی، جس پر ساری دنیا میں جنگِ عظیم شروع ہوگئی تھی اور لاکھوں انسان ہلاک ہوئے تھے۔ میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

''لیکن جب آپ نے کچھ دیکھا نہیں، کتابوں کو جھوٹا کہتے ہیں، تو خود کو تاریخ کا پروفیسر کیوں کہتے ہیں۔''

''میں کتابوں کو جھوٹا نہیں کہتا۔ آپ کی دوکانوں میں جو کتابوں کے ڈھیر ہیں میں انھیں جھوٹا اور ڈھونگی سمجھتا ہوں۔ سچی کتابیں تو جلا دی جاتی ہیں۔ جیسے ۱۹۳۹ء کی 'پروگوم' رات کو پھونکی گئی تھیں۔''

اچانک پروفیسر اشمتھ کو جوش آ گیا: ''جج صاحبہ میں دس، گیارہ برس کا تھا، جب میرے سامنے اسی شہر میں جہاں عظیم فلسفیوں اور دانشوروں نے محبت اور انسانیت کے پیغام دئے تھے، حیوانوں کی فوج مارچ کر رہی تھی۔ ۱۷ برس کا تھا جب میرے سامنے انسانیت اور امن کی پیغامبر کتابیں جلائی جا رہی تھیں اور پھر ہٹلر کی فوجیں پولینڈ، روس اور یورپ کے بہت سے ممالک کو تاراج کر رہی تھیں، میری آنکھوں کے سامنے۔ مجھے بھی زبردستی بندوق پکڑائی گئی تھی۔ اور پھر جب میں نے کچھ اور ہوش سنبھالا تو جرمنی کی تباہی اور اسے ٹکڑوں میں بٹتا دیکھا۔ پھر ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بموں سے لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور کیڑے مکوڑوں کی طرح ایٹمی تیزاب سے درگت دیکھی۔ جس کے منظر اخبارات میں بھرے تھے۔ آپ شاید اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے کوریا، ویت نام، فلسطین، نکاراگوا، چیلی، جنوبی افریقہ اور انگولا، عراق، افغانستان، لیبیا اور سیریا میں عورتوں بچوں کے قتل عام کے مناظر اور جھوٹے پروپاگنڈے اور اور فرضی تاریخی دعوے سنے ہیں اور ان کے تجزیے کئے ہیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی دیکھا ہے۔ اور دیکھ رہا ہوں۔ اور اب یمن، روس اور یوکرین۔۔۔ اور انسانوں کا قتل عام۔۔۔''

''پروفیسر اشمتھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کا گلا رندھ گیا۔

''جج صاحبہ، آپ کو معلوم ہے کل ہی سعودی عرب میں ۸۱ لوگوں کے سر قلم کئے گئے ہیں۔ مجھے سزا دینے کے ساتھ ان کے خلاف بھی فیصلہ سنا دیجئے گا۔''

پھر انہوں نے سرکاری وکیل کی طرف اپنا رخ کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان میں ایک لڑکی کو ریپ کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں لو میرج کے نام پر اور جہیز کے لئے جان سے مار دیا جاتا ہے۔ ان کے خلاف بھی مقدمہ دائر کر کے دیکھئے۔ وہاں بھی جو کچھ ہو رہا ہے وہ جھوٹی تاریخ کا سہارا لے کر، سچی تاریخ کا گلا گھونٹ کر ہے۔''

جج صاحبہ نے صبر و تحمل کے ساتھ پروفیسر اشمتھ کا اعتراف جرم سنا۔ سرکاری وکیل کی طویل دلیلیں سنیں، جس نے ان کے لئے سخت سزا کی درخواست کی تھی۔ پھر دس منٹ کے وقفے کا اعلان کیا اور واپس آ کر احترام اور محبت سے ان پر نظر ڈالی اور فیصلے کا اعلان کر دیا کہ

''پروفیسر اشمتھ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں نفسیاتی مریضوں کے ہسپتال میں بھیج دیا جائے۔''

لاش

ایک دفعہ ایدھی صاحب پرائیویٹ کار پر سکھر جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا، ایک مقام پر کچھ ڈاکو راستے میں آ گئے اور اُن کی گاڑی روڈ سے اتار کر کچے میں لے گئے وہاں پہلے سے کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں اور ڈاکو لوٹ مار میں مصروف تھے۔

تھوڑی دیر میں ایک ڈاکو اُن کیطرف آیا اور ایدھی صاحب کو باہر نکلنے کا کہا۔ ان کی تلاشی لی اور جیب خالی کرالی۔ اچانک اس ڈاکو کی نظر ایدھی صاحب پر پڑی اور غور سے ان کو دیکھنے کے بعد دوسرا ڈاکو کو جلدی سے ایک جانب کھڑی جیپ کی طرف گیا اور ایک شخص کے ساتھ فوراً واپس آ گیا۔

اس شخص نے ٹارچ کی روشنی ایدھی صاحب کے چہرے پر ڈالی اور پوچھا آپ عبدالستار ایدھی ہیں؟ جواب ہاں میں ملا تو ڈاکو کا سردار ایک دم پریشان ہوگیا۔

فوری حکم ہوا کہ تمام گاڑیاں جن سے لوٹ مار کی گئی ہے ان کو مال واپس کیا جائے۔

اس کے بعد وہ شخص ایدھی صاحب کے ہاتھ چوم کر معافی مانگنے لگا۔

مزید حیرت کی بات یہ ہوئی کہ جب وہ ڈاکو ایدھی صاحب کو رخصت کرنے لگا تو 20 لاکھ روپے بطور چندہ ایدھی صاحب کے حوالے کیا۔ ایدھی صاحب کے انکار پر بولا:

سر جب میرے جیسے گنہگار پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں تو ہمارا کوئی رشتے دار ہماری لاش تک نہیں وصول کرتا، ایدھی ہی ہماری لاش کو کفناتا ہے اور دفناتا ہے۔

آسیب زدہ کوٹھی

شہلانقوی
(نیویارک)

گھر کا دروازہ میرے پیچھے بند ہوا ہی تھا کہ ذکیہ خالہ مجھے سامنے بیٹھی نظر آئیں۔ وہ زمین پر بیٹھی تھیں، نیچے نہ دری نہ قالین، وہ نہ اکڑوں بیٹھی تھیں نہ آلتی پالتی مارے۔ ان کے گھٹنے دور دور کھڑے تھے اور انہوں نے اپنے بازوان پر ٹکائے ہوئے تھے۔ گورا رنگ کمہلایا ہوا تھا۔ چوٹی کے باوجود ان کے بال جھاڑوں اور کپڑے ملگجے تھے۔ میں نے کبھی ان کو اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

ایک متمول گھرانے میں چھوٹے بیٹے کی دوسری بیوی تھیں۔ گھر میں ساس کا راج تھا ان کے بعد جیٹھانی کی چلتی تھی اور ساس کے انتقال کے بعد تو وہی گدی نشین بن گئی تھیں لیکن ذکیہ خالہ کی حیثیت تو چھوٹے بھائی کی پہلی بیوی پروین خالہ سے بھی کم تھی۔

پروین خالہ ہماری امی کی سگی بڑی بہن تھیں۔ ہم انہیں پروین خالہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے، خالہ امی کہتے تھے اور ان کے شوہر کو خالو ابا۔ آج برسوں کے بعد وطن واپس آنے پر میں خالو ابا اور خالہ امّی دونوں کا پرسہ دینے اس گھر میں آئی تھی۔

خالہ امّی کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ خاندان کی لڑکی تھیں طلاق یافتہ تو نہیں ملی لیکن ماں کے اصرار پر خالو ابا نے شادی کے دس سال بعد ایک غریب خاندان کی گوری چٹی لڑکی سے دوسرا نکاح کر لیا۔ ساس رخصت کرا کر لائیں تو انہیں خالہ امّی کے کمرے میں لے گئیں جو اس وقت دوپٹہ سے منہ ڈھانپے کروٹ سے لیٹی تھیں لیکن ساس کے پکارنے پر سر پر دوپٹہ درست کرتی اٹھ بیٹھیں۔ ساس نے رسان سے کہا اس کو اپنی چھوٹی بہن سمجھو۔ اسی طرح سے وہ ہماری بھی خالہ کہلائی گئیں۔ دلہن نے نظریں جھکائے جھکائے ہاتھ ماتھے کو لگا کر سلام کیا اور اسی طرح نظریں جھکائے پانچ سال میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے گھر بھر دیا لیکن اس کے باوجود گھر میں ان کی حیثیت خالہ امّی کی خدمت گزار سے زیادہ نہ ہو سکی۔

سنتے ہیں کہ ادھیڑ عمر مرد جوان بیوی کا دیوانہ ہو جاتا ہے اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اس تصور کے برعکس خالو ابا تو دفتر سے آ کر خالہ امّی سے ہی ہنستے بولتے نظر آتے تھے۔ بڑوں کی کنسوئیاں لینے سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ دونوں بیویوں کے کمروں میں ان کی باری پر سوتے تھے لیکن اپنی تنخواہ خالہ امّی کے ہاتھ میں تھما دیتے تھے اور پھر ذکیہ خالہ کو ایک ایک پیسے کے لیے خالہ امّی سے سوال کرنا پڑتا تھا۔

ذکیہ خالہ کے بچوں نے بھی کم عمر میں ہی سیکھ لیا تھا کہ بڑی امّی شیر کی نگاہ دیکھتی ہیں لیکن سونے کا نوالہ بھی انہیں سے ملتا ہے اور وہ انہی کے پاس گھسے رہتے تھے۔ قلفی والے کو آواز پر ان سے ہی ضد کرتے تھے۔ اگر کبھی ذکیہ خالہ سے کہا بھی تو انہوں نے بہن سے کہہ دیا کہ جا کر اپنی بڑی امّی سے مانگو۔ اور یہ بھی نہیں کہ خالہ امّی کو ان بچوں سے محبت نہ ہوتی، جان چھڑکتی تھیں اپنے شوہر کی اولاد پر۔ ایک دفعہ ملیریا بخار میں ارحم کو مرگی کا سا دورہ پڑ گیا۔ ذکیہ خالہ تو گیلے تولیے سے بدن پونچھتی اور منہ کا جھاگ صاف کرتی رہیں اور خالہ امّی ننگے سر زیرِ آسمان، رحیم و کریم، شافی و کافی کا واسطے دیتی رہیں یہاں تک کہ دورہ ختم ہو گیا۔ ابا نے سالی کو اس بے قراری پر چھیڑا تھا تو انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا، تکلیف تو ہم چڑیا کے بچے کی بھی نہیں دیکھ سکتے۔

میں تو گھر سے ہی مرحومین کے بارے میں سوچتی اور آبدیدہ ہوتی آئی تھی لیکن یہ سارے خیال ذکیہ خالہ کو دیکھ کر اس مختصر دورانیے میں میرے ذہن میں کوند گئے جس کے بعد غیر متوقع طور پر ذکیہ خالہ نے سر اٹھا کر غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا اور دو غلیظ گالیاں کھنکار کر بلغم کی طرح تھوک دیں۔

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جتنی دیر میں ان کی بہو میرا بازو تھام کر مجھے برابر کے کمرے میں نہ لے گئی ان کے منہ سے مغلظات کی بدرو بہتی رہی۔ اور جب اس کا شوہر ارحم کا چھوٹا بھائی قاسم کمرے میں آ گیا تب چائے لینے گئی۔

قاسم نے کہا" چھوٹی آپا برا مت مانیے گا امّی کا دماغ الٹ گیا ہے بڑی امّی کے انتقال کے بعد سے، سارے وقت غصے میں گالیاں دیتی رہتی ہیں میں انہیں بستر میں لٹا آیا ہوں تھک گئی ہوں گی شاید سو ہی جائیں۔"

ارحم تو امارات میں کہیں رہتا تھا قاسم اور اس کی بیوی ہی تینوں بڈھوں کے پاس رہتے تھے۔ ہم برسوں بعد ملے تھے لیکن تھوڑی دیر میں ہی گفتگو بے تکلف ہو گئی۔ قاسم نے بتایا کہ خالو ابا کے انتقال کے بعد اس کی ماں نے کس طرح بڑی امّی کی آخری بیماری میں ان کی خدمت کی۔" آپ کو تو ان کا مزاج یاد ہو گا اور بعد میں تو درد کی وجہ سے اور بدلحاظ ہو گئی تھیں لیکن امّی نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ بس جس دن ان سے بڑی امّی کی سوئم کی تفصیلات کا پوچھا گیا انہوں نے گالیوں سے جواب دیا۔ اس دن سے یہی حال ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ شاید اسٹروک ہو گیا ہے۔"

میں نے چلتے ہوئے ذکیہ خالہ کو سلام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن قاسم نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے مجھے کار تک پہنچا دیا۔ میں اس دردناک ملاقات کا سوچتے ہوئے گھر پہنچی تو اور عزیز ملنے آئے ہوئے تھے۔ یہ سن کر کہ میں کہاں سے آ رہی تھی بجائے خیال بٹانے کے گفتگو میں بار بار اسی گھرانے کا ذکر آتا رہا۔

میرا ذہن اسٹروک کی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ دماغ خیالات و احساسات کا کاروبار سنبھالے ہر وہ کام کرتا ہے جس کا سہرا دل کو باندھا جاتا ہے۔ ذکیہ خالہ کے دل نے ان کی ازدواجی زندگی میں کیا کچھ نہ سہا ہوگا۔ غریب ماں باپ نے اچھا گھر دیکھ کر اپنی ذمہ داری کو پورا کر دیا لیکن کیا وہ اپنے سے اتنی بڑی

باقی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ کیجیے

تھیلے میں کشمیر

آغا گل
(کوئٹہ)

ہمارے ہاں تو بادل یا افسر آتے ہی نہیں۔ البتہ کسی کے ہاں شادی ہو تو وہ کوئٹہ کا دورہ بنا کر چمن لے جاتے۔ وہاں شاپنگ کرنے کے بعد حکم دیتے چونکہ گریزی کا مال ہے۔ ہم بھی اسلام آباد بجھوانے کا اہتمام کریں۔ ایسے میں ڈائریکٹر جنرل کا دورہ ایک تعجب تھا۔ سرکل نیا نیا بنا تھا ورنہ تو کراچی کا دم چھلّہ بنا جی رہا تھا۔ پرنس محی الدین جان ہمارے وزیر مواصلات تھے انہوں نے خصوصی طور پر افسروں کو تاکید کی تھی کہ خود بلوچستان جائیں۔ زمینی حقائق دیکھیں اور اس کے مطابق منصوبہ بندی کریں بجائے ائیر کنڈیشن دفاتر میں وہ فیلڈ میں آ کر دیکھیں۔ میں نیا نیا محکمے میں آیا تھا، جولیس فیوچک کہہ گزرا کہ بہادر مقابلہ کرتے ہیں کمزور صلح کر لیتے ہیں۔ بزدل بھاگ نکلتے ہیں۔ میں بھی کالجوں سے بھاگ نکلا تھا۔ محکمہ تعلیم نہایت منصوبہ بندی کے ساتھ جہالت پھیلائے جا رہا تھا لیکچرر سے ڈاک بابو بننا خاصہ دشوار تھا۔ ہمارے ڈائریکٹر جنرل خورشید احمد ایک دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، چونکہ انگریزی ادب سے تھے مجھ سے ہی گفتگو رہی۔ چونکہ اعلیٰ افسروں کا اغوا برائے تاوان ایک روایتی کاروبار تھا۔ انہیں مشورہ دیا گیا تھا کہ شہر اور ریسٹ ہاؤس رہیں۔ شام میں ہم تینوں افسر حاضر ہوتے ان کے ساتھ ڈنر میں شامل ہوتے۔ چونکہ ان کی گفتگو کے موضوعات ادبی تھے مخاطب بھی مجھ ہی سے رہتے۔

ان کا خیال تھا کہ کرسٹوفر مارلو قتل نہیں ہوا تھا۔ کہیں روپوش ہو لیا اور میکبتھ جیسے ڈرامے اسی نے شیکسپیئر کے نام سے لکھے۔ ورنہ شیکسپیئر میں اتنا دم کہاں۔ خورشید احمد میں افسرانہ شان و شوکت نہ تھی، نہ ہی وہ کوئی پروٹوکول مانگتے۔ کیزیول سمارٹ لباس میں رہتے، انہیں پشین، سراناں، گلستان کے دورے کرائے۔ باقی علاقوں میں افغان مجاہدوں کا قبضہ تھا۔ امریکی ڈالر اور سعودی ریال کے باوجود وہ مرد شاہین کی طرح مزید کمانے کے چکر میں رہتے۔ ان شکروں سے اپنا ڈی جی بچانا بھی ضروری تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ کسی کشمیری دلربا کی یاد میں شادی نہ کر پائے۔ انہیں یقین تھا کہ مقبوضہ کشمیر ایک دن ہم حاصل کر لیں گے اور وہ کالے دیو کے قلعہ سے اپنی شہزادی نکال لائیں گے۔ ہماری تو جرأت نہ ہوئی کہ ذاتی سوال کرتے۔ بس سنی سنائی باتوں پہ یقین کر لیا۔ ویسے کبھی کبھی کچھ کھوئے کھوئے اداس سے ہو جایا کرتے۔ لیکن بطور مجموعی زندہ دل ہنس مکھ اور کھل کر بولنے والے تھے۔ ان کے چند روزہ قیام نے مجھے بھی حوصلہ دیا کیونکہ تعارف بھی ہوا اور جاتے سمے وہ میرے نام کی تعریف بھی کرتے گئے۔ کشمیر سے انہیں خاص لگاؤ تھا جس قدر وجیہہ تھے یقین تھا کہ کشمیری ہی رہے ہوں گے۔ کشمیری یوں بھی کھلے دل کے ہوا کرتے ہیں۔ ہمارا ان داتا پی ایم جی تھا ہم اس طرح مراسلے بھجوایا کرتے۔ ڈی جی تو بہت ہی اوپر کے درجہ پہ تھا۔ ان کے جاتے ہی زندگی اپنے ڈھنگ پہ چلنے لگی۔ ان دنوں جہاز کی سیڑھیوں تک افسر خدا حافظ کہنے جایا کرتے، ہم نے بھی انہیں یوں ہی رخصت کیا۔

وقت تیزی سے بدل رہا تھا افغان جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر اس کے اثرات ظاہر ہوئے جاتے تھے۔ ہمارے وزیر مواصلات کو عجلت میں رخصت کیا گیا تو بلوچستان ایک بار پھر یتیم ہو گیا۔ تاہم وہ بلوچستان پوسٹل سرکل بنانے کے علاوہ بلوچستان کو سارے جہاں سے بذریعہ فون ملاتے گئے۔

ڈاک خانہ سرکاری محکموں کا سرکک ہے۔ انارکلی کا کبوتر ہے، مارشل لاء لگے یا کوڑے ڈاک خانہ کو کبھی کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ یا کہ مسوڑہ نیا لگوا رکھا ہے۔ نوے فیصد بجٹ تو اخراجات میں ہی اٹھ جاتا، اب دس فیصد سے کوئی کیا کمائے اور کھلائے۔ بلوچستان کا سٹاف بانٹیں تو دو ہزار مربع کلومیٹر کے لیے ایک پوسٹ مین بنتا تھا۔

ایک روز اچانک ہی کھلبلی مچ گئی فون دوڑنے لگے۔ مجھے حکم ہوا کہ فوراً ہی کوئٹہ جی پی او کے خزانے پہ قبضہ کر کے کشمیر کے نقشے والے ٹکٹ کی فروخت روکوں۔ میں بھی عجلت میں جا پہنچا۔ یہ ایک عام سا یادگاری ٹکٹ تھا۔ محدب عدسے سے بھی لگا کر دیکھا۔ اس میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ یونیورسل پوسٹل یونین کی جانب سے یوں تو ڈاک ٹکٹ پر نعرہ بازی کی ممانعت ہے مگر یہ جنرل ضیاء کے ٹھپہ مار ریفرنڈم پر جاری ہوا تھا۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۸۴ء کے جعلی ریفرنڈم کا ساٹھ پیسے والا ٹکٹ تھا۔ ملک بھر میں ہی اس کی فروخت کروا کر اسے واپس منگوا لیا گیا تھا۔

اگلے روز افواہوں کا دور چلا کہ جنرل ضیاء کو بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے فون کیا کہ نالے ماسی تے نالے چونڈیاں۔ ایک جانب تو ہم سے دوستی کا دم بھرتے ہو دوسری جانب کشمیر پہ حق بھی جتاتے ہو۔ کشمیر ہمارا ہے۔ اسی سینہ گزٹ سے پتہ چلا کہ جنرل ضیاء نے فوراً ہی پینترا بدلا کہ کشمیر آپ کو مبارک ہو۔ یہ کسی افسر کی غلطی ہے، اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ یادگاری ٹکٹ کی فروخت روک دی گئی ہے، اسے تلف کر دیا جائے گا۔ بہتر ہے کہ ہم منشی پریم چند کے افسانے دو بیل کی طرح ہیرہ اور موتی بن کر محبت سے رہیں۔ سینگ نہ الجھائیں۔ افواہ ساز کہتے ہیں کہ راجیو مان گیا۔ کیونکہ پنڈت نہرو نے بہت زمانہ پہلے کہا تھا کہ وہ خود کشمیری ہوتے ہوئے کشمیر کیسے دے آئے۔ خورشید احمد بھی کشمیری تھے۔ اعلیٰ حکام نے طلب کیا اور استفسار کیا ٹکٹ چھاپنے سے پہلے اجازت کیوں نہ لی۔ کشمیر کو متنازعہ کیوں دکھایا لکیر لگا کر۔ اسے ملک سے کیوں جوڑا؟ خورشید احمد بولے کہ وہ خود کشمیری ہیں۔ پالیسی بھی حکومتی یہی ہے کہ کشمیر ہمارا ہے۔ اور وہ گیت بھی یاد دلایا ''کشمیر پہ لہرانا ہے جھنڈا اچھال کے'' اور رجز کا شعر ''لینا ابھی کشمیر ہے یہ بات نہ بھولو'' لیکن حکام ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ''وزارت خارجہ سے یہ ڈیزائن کیوں منظور نہ کروایا؟'' اس کا بھی جواب دیا کہ محکمہ ڈاک اپنے یادگاری ٹکٹ خود ہی ڈیزائن کرتا ہے۔ برٹش پوسٹل سروس کا بھی

یہی قانون ہے۔خورشید احمد بدستور مصر رہے کہ کشمیر تو پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے چونکہ مسلم اکثریتی علاقہ ہے۔پاکستان میں شامل ہونا اس کا قانونی حق ہے۔مسلم اکثریتی علاقہ وہ بھلا کیسے دشمن کے حوالے کردیں۔وہ اس کے لیے جہاد کے لیے بھی مستعد تھے بولے کہ کشمیر کے پہاڑوں میں آزادی کی جنگ لڑتے شہید ہونا ہر محبت وطن پاکستانی کا خواب ہے۔شہادت ہی وہ عظیم منصب ہے جس کے خواب ہر مسلمان دیکھتا ہے۔اور وہ کشمیر کے مسئلہ پر ضمیر عالم کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس بندوق یا توپ نہیں ابلاغ کا ذریعہ تو ہے۔یادگاری ڈاک ٹکٹ کے ذریعے وہ کشمیر کی آزادی کی آواز بلند رکھنے کے عزم کا اظہار کرتے رہے۔وہاں عجب سے ملک کا فور بیٹھے تھے لکڑ پتھر کے حاکم کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔اور خورشید احمد انگریزی ادب کے باشعور انسان کہاں جھکنے والے تھے۔

آخر میں انہیں کہا گیا کہ وہ کیا اپنا دفاع کرنے کے لیے انکوائری کا سامنا کریں گے یا کہ گھر جانا پسند کریں گے۔خورشید احمد وہیں سے گھر لوٹ گئے۔سرکاری گاڑی دفتر واپس کردی۔فوری طور پر فاخر حسن کو محکمے کا سربراہ لگا دیا گیا۔محکمہ ڈاک کی تاریخ میں کبھی بھی ایک ٹکٹ چھاپنے پہ ایسا سخت فیصلہ نہ ہوا تھا۔

ہمیں بچپن میں ہی جہاد کشمیر کی تعلیم دی گئی تھی۔فلم بیداری جس میں جہاد کشمیر کا درس تھا ہمیں آدھے ٹکٹ میں دکھائی گئی۔کوئٹہ کے سارے اسکول بچوں کو یہ فلم دکھانے لے جاتے رہے۔بلکہ کوئی لڑکا فٹ بال کے کھیل میں کم ہمتی کرتا تو اسے ڈانٹ پڑتی کہ اتنے کمزور ہو تو جہاد کشمیر کیسے کرو گے۔

افغان مجاہدین پاکستان کے شناختی کارڈ بنا کر آباد ہوئے جاتے تھے۔مختلف کاروبار کر رہے تھے۔وہ اکثر کہا کرتے کہ ڈیورانیڈ لائن کو نہیں مانتے کچلاگ تک کا علاقہ ان کا ہے۔افغان جنگ کے باعث کمرشل ازم نے راہ پکڑی یورپ نے اڑھائی سو برس میں جو چھلانگ لگائی ہم بیس برس میں وہیں آن گرے کوئی کھل کر نہ بولتا۔مار دھاڑ تھی، حالت یہ تھی کہ صحافیوں کو بھی کوڑے مارے جا رہے تھے۔محکمہ بھی سیاہ چادر تلے آ گیا۔خوف کا عالم تھا۔

پھر چند ماہ بعد اسلام آباد میٹنگ میں جانے کا اتفاق ہوا۔پوسٹل اسٹاف کالج کا حال خورشید احمد کے نام سے معنون ہوا تھا۔ان کی بڑی خدمات تھیں۔سرکاری ڈنر پر انہیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ویسے ہی ہنس مکھ تھے، مجھے بھی اپنائیت سے ملے'' کیسے ہو گل؟''انہیں جونئیر افسروں کے نام بھی یاد تھے۔کشمیر پہ اپنے مؤقف پہ وہ بدستور قائم تھے۔ہم انہیں کشمیر کا گمنام شہید قرار دیتے۔

رات گئے جب ہم بیچ میٹ پوسٹل اسٹاف کالج کے ٹیریس پر پہنچ ہی رہے تھے تو میاں نواز نے انکشاف کیا''خورشید صاحب کی زندگی خطرے میں لگتی ہے'' ہم اس کی سادگی پہ ہنس دیئے۔نوکری سے برخاست کیا اب کیا کالے پانی بھجوا دیں گے؟ مگر نواز سنجیدہ تھا۔''ایم ڈی تاثیر کی جانب بھی کشمیر پہ گئی تھی۔اچھلے بھلے شام کو واک کر کے لوٹے تھے۔اسی ٹکٹ اور بدلی ہوئی خفیہ پالیسی کا گواہ خورشید احمد ہیں۔یہ ایک خفیہ یوٹرن ہے جس کا پاکستانیوں کو کچھ علم نہیں ہے۔تم لوگ جانتے ہو کہ ثبوت اور گواہ مٹا دیئے جاتے ہیں۔نواز لاہور کا رہنے والا تھا اور ان دنوں کراچی کی پوسٹنگ پہ تھا۔ہمارا خیال تھا کہ تبھی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔باؤلا ہوئے جاتا ہے۔میں کوہلو کا دورہ کر رہا تھا۔ان دنوں موبائل نہ تھے۔فائدہ بھی تھا کہ افسر ادھر اُدھر کھسک جاتے۔بلوچستان کے 347190 کلومیٹر علاقہ میں کسی بھی افسر کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔میں بھی اکثر رکھنی سے فورٹ منرو پار کر کے سرائیکی وسیب کے ادیبوں کے ہاں ملتان سے بھی آگے نکل جاتا۔ادبی مجالس میں شامل ہو کر ملگری توب کا لطف اٹھا کر لوٹ آتا۔میرے دفتر کے پاس وہی رٹا رٹایا جواب ہوا کرتا کہ صاحب ٹوور پر رہیں۔کوہلو میں مجھے پہلا فون آیا، چونکہ ٹیلی فون بگ گینگ کا م تھی اور خط تو ہمارے ہی سامنے سینئر ہوا کرتے میاں نواز محتاط تھا۔

''دیکھو میں نے کیا کہا تھا؟ تم لوگ مجھے سنجیدہ نہیں لیتے خورشید احمد پر حملہ ہوا ہے،شدید زخمی حالت میں پائے گئے ہیں۔''

مجھے سخت صدمہ پہنچا۔انگریزی ادب کا دانشور اور پھر محکمہ ڈاک جیسے سرکک بلکہ مُرر و محکمہ افسر کا افسر۔ہمیں گریڈ انیس کچھ ہی دور دکھائی دے رہا تھا۔شاعرانہ اشاروں کنائیوں میں گفتگو ہوتی رہی۔مگر صبر دشوار تھا۔میں نے بارکھان سے خبر کی وضاحت چاہی مگر فون میں کچھ گڑ بڑ تھی۔لورالائی کے ایک پبلک کال آفس سے اسلام آباد خفیہ فون کیا۔وہ دوست بھی اتنا ہی بتانے پہ رضامند ہوا کہ خورشید صاحب اکیلے رہتے تھے۔شام میں ملازم بھی چلا جاتا اور اگلی صبح ہی لوٹتا۔جب اس نے بیرونی تالا کھولا اور اندر آیا تو صاحب نہ ملے۔ادھر اُدھر تلاشتا پھرا تو باتھ روم کے فرش پہ شدید زخمی حالت میں پڑے تھے۔پولیس اور رشتہ داروں کو فون دوڑائے۔انہیں ہسپتال لے گئے۔مگر وہ دنیا سے منہ موڑ چکے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ ملکی مفادات اور کشمیر پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بہت سخت مؤقف پہ قائم تھے۔وہ کہا کرتے کہ ملکی سالمیت کا راستہ جہاد میں نکلتا ہے۔جو قوم ملکی مفادات پہ پیچھے ہٹتی چلی جائے وہ پھر پیچھے ہی ہٹی چلی جاتی ہے۔اسی بھگدڑ میں کچلی جاتی ہے۔ایسے میں کسی افسر نے رائے دی تھی''مگر قومی مفاد میں تو کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔''

چونکہ وہ انگریزی ادب کے تھے، بہت محظوظ ہوئے''اس کا کچھ اور مطلب بھی نکلتا ہے،کمپرومائیزنگ پوزیشن'' زیرلب مسکرا کر کہا۔

اصل روئیداد کا کسی کو علم نہ تھا۔شائد نواز کے خدشات درست نکلے۔پولیس نے ان کے لواحقین پر دباؤ ڈالا کہ حادثہ قرار دے کر کیس داخل دفتر کیا جائے۔پاؤں رپٹ گیا اور گر پڑے۔زخمی ہوئے اور چل بسے۔ورنہ مقدمہ برسوں چلے گا، انہیں بار بار بلایا جائے گا۔زمین جائیداد کی تقسیم بھی نہ ہو پائے گی۔گر کر زخمی ہونے کا مفروضہ تسلیم کر لیا گیا اور بات ختم ہوگئی۔

برسوں بعد جب کشمیر ہمارے ایٹمی پنجے سے نکلا تو وہ مجھے ڈاک کا ساٹھ پیسے والا ٹکٹ یاد آیا جسے پورا محکمہ تھیلوں میں بھر بھر کے اسلام آباد بھجوایا جا رہا تھا۔نوکری بنا رہا تھا۔میں نے بھی بلوچستان بھر سے کشمیر اکٹھا کیا اور تھیلے میں بھر کر اسلام آباد بھجوایا۔میری نظریں اگلے گریڈ پر تھیں۔

مقدس شجرزار

جمیل احمد عدیل
(گوجرانوالہ)

اگرچہ اپنے حوالے سے صلاح وسفارش کا عمل ان چاروں کی نظر سے مخفی ہی رہا کہ ان کا چناؤ کس نے اور کیوں کیا؟ لیکن حکام بالا کی جانب سے ذمے لگائی گئی تفویضہ (Assignment) کے لیے انھوں نے مستعدی دکھائی اور معین وقت میں اس علمی مہم کی مناسبت سے سارا کام مکمل کرلیا۔ طے شدہ تاریخ کو وقتِ مقرر پر چاروں کو ان کے گھروں سے سرکاری ویگن نے پک کیا اور اس وسیع وعریض عمارت میں لے گئی جس میں قائم شاندار دفاتر پورے صوبے کا نظم و نسق سنبھالتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ مذکورہ بابِ حکومت میں داخل ہونے کا شرف انھیں پہلی بار نصیب ہو رہا تھا؛ البتہ یہ آبرومندی تازہ تجربہ ثابت ہوئی کہ ان کے لیے صدر دروازے پر کسی قسم کی 'شناخت پریڈ' موثر نہیں کی گئی؛ یوں پارکنگ سے نکل کر ایک طرح کی خوداعتمادی اور سربلندی کے ساتھ وہ میٹلڈ روڈ پر چلتے رہے کیونکہ متعلقہ محکمے کا میٹنگ روم کافی آگے جا کر واقع ہوا تھا۔

ان چاروں عمر رسیدہ اصحاب نے اپنے اپنے بیگ تھامے ہوئے تھے جن میں اس میٹنگ سے متعلق تیار کردہ تحریری مواد بہت سلیقے کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کبھی قدرے حیرانی کے ساتھ گھنے درختوں کی طرف دیکھتے، کبھی سڑک پر نظر ڈالتے کہ اس سے پیشتر انھیں اتنی تعداد میں پرندے یہاں کبھی دکھائی نہیں دیے تھے ___ اب تو سیاہ پرندوں کے جھلڑ ہر طرف چھائے ہوئے تھے نیز نیچے پختہ گزرگاہوں پر سفید بیٹیں اتنی زیادہ تھیں کہ شاید ہی سطح کی سیاہی کسی چھوٹے سے حصے کی صورت میں اپنی موجودگی باور کرا رہی ہو!

ایک سے نہ رہا گیا:

ساری افسر شاہی روزانہ یہیں سے گزرتی ہے، کیا کسی کو سڑک کی صفائی کا خیال کبھی نہیں آیا؟

دوسرے نے بات بڑھائی:

اتنے پرندوں کو ہر روز خوراک کہاں سے ملتی ہوگی؟

اب اس نے ہنسی میں طنز کو عمداً شامل کیا:

پرندوں کی خوراک کے ذخائر مختلف ہوتے ہیں، جن سے وہ خود ہی واقفیت رکھتے ہیں۔ بھائی جان! سامانِ نشوونما صرف یوٹیلیٹی اسٹورز سے ہی دستیاب نہیں ہوا کرتا!

انا پروار کہاں برداشت ہو پاتا ہے! سو، ترکی بہ ترکی جواب آیا:

یہ کوئی کلیہ تو نہیں، شہر کی شاہراہ پر نصب قتالہ مشین کے جوار میں بنے کبوتر خانے کے آس پاس بکھرے رزق کو لاکھوں آنکھیں بلاناغہ دیکھتی ہیں۔

دونوں میں بحث سی چھڑ گئی:

سفید، سرمئی کبوتروں کو ان کالے پکھیروؤں کے ساتھ نہ ملاؤ، غور تو کرو! یہ کوے ہیں نہ چیلیں ہیں!!

پھر یہ کیا ہیں؟

میری دانست میں یہ بس 'کالے پرندے' ہیں۔ ان کے: پر، چونچیں، آنکھیں پنجے، حتیٰ کہ آوازیں بھی، سیاہ ہیں۔۔۔ ہاں! ان کی صرف بیٹیں سفید ہیں اور سیمی لیکیوڈ ہیں۔ یہ نیم مائع سیال زمین پر گرتے ہی پھیل جاتا ہے، پھر جلد ہی خشک ہو جاتا ہے، جیسے حکمنامے کے سفید ورق پر دستخط کی سیاہی دیکھتے ہی دیکھتے جم جاتی ہے!

ان کے باقی دو ساتھی جو اب تک خاموش تھے؛ انھوں نے بیک وقت اپنے جوتوں کے تلووں کو دیکھنا چاہا؛ کہیں یہ سفید ریزش ان کے ساتھ چپک تو نہیں گئی؟ لیکن وہ چیک کر کے مطمئن ہو گئے کہ تلووں کے ساتھ کچھ نہیں چپکا تھا۔

زیادہ باتونی مسکرایا:

یہاں سے کوئی کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا، دیکھتے نہیں ہو دائیں بائیں گراسی گراؤنڈز میں کوئی بینچ تک نہیں ہے تاکہ کوئی سائل یہاں بیٹھ بھی نہ سکے۔۔۔

ایک نے تعجب ظاہر کیا:

واقعہ یہ ہے کہ میں نے تو آج تک اس نوع کے پرندے کہیں نہیں دیکھے، نہ ایسی بیٹیں ہی کہیں مشاہدے میں آئی ہیں!!

چرب زبان نے پھر جارحیت کی روش اپنائی:

تمھاری چشمِ تنگ آج کے قضیے کی بابت بھی ایسے ہی تحریری نکات لکھ کر لائی ہوگی!

حریف نے اپنا دفاع کیا:

اگرچہ بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال! تاہم آپ عمر میں کچھ بڑے ہیں؛ اس لیے لحاظ کر رہا ہوں؛ وگرنہ عرض کرتا کہ از خود اس موضوع پر برسوں مرکوز رہا ہوں! یہ میٹنگ میں کھل جائے گا، کون کتنے پانی میں ہے!؟! ارے صاحب! چھوٹی چھوٹی گلیوں میں مقیم اپنی سوچ کو کبھی کشادہ نہیں کر سکتے!!

ایک قہقہہ فضا میں بکھرا:

لو بھئی! یہ بھی خوب کہی۔۔۔ بھیا! سوچ فکر کی کشادگی کا گلی کے طول عرض سے کیا تعلق؟

ہوتا ہے تعلق۔۔۔ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے!!

آپس میں چہلیں کرتے کرتے یہ چاروں جب میزبان صیغے میں میٹنگ روم کے پاس پہنچے تو چیئرمین کے پرسنل سٹاف آفیسر نے بتایا:

صاحب کو بگ باس نے اچانک بلا لیا ہے، اب میٹنگ دو بجے کے

بعد ہوگی!

ان چاروں نے وہاں تو مودب ہو کر یہ اطلاع سنی مگر باہر آ کر اپنی خفگی کو چھپا نہ سکے:

لو کر لو تعین کہ عذاب، آزمایش اور آفت میں کیا فرق ہے؟ کیسے کیسے حوالے جمع کیے تھے اور کیسی کیسی نادر تجویزیں ترتیب وار لکھی تھیں مگر۔۔۔۔

مگر کیا ہوا؟ اب نہ سہی بعد دوپہر جب میٹنگ ہوگی تو اپنی فکری محنت کو پیش کر دینا!

نہیں جناب! مجھے تو آج کی میٹنگ کا معاملہ ہی کھٹائی میں پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ اگر یہ کسی اور تاریخ پر ملتوی ہوگئی تو اعزازیہ بھی موخر ہو جائے گا!!

اب چاروں نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت کینٹین میں جا کر نشست جماتے ہیں۔

یوں وقت کٹی کے لیے انھوں نے غیر محسوس طور پر میٹنگ کے ایجنڈے پر اپنے نوٹس کمپیئر کرنے شروع کر دیے:

ویسے سرکار کو سوجھی کیا کہ عذاب کی نت نئی تعبیریں جمع کرنی شروع کر دی ہیں؟

ہم نشین نے اپنی رائے دی:

ارے بھائی! رموز مصلحت ملکِ خسروان دانند! کہیں تو گراری اڑ رہی ہوگی وگرنہ ہم ایسے از کار رفتہ مدرسوں کو پروٹوکول کے ساتھ سرکار دربار میں نہ لایا جاتا!

ایک اور نے اپنی خاموشی توڑی:

میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں، تھنک ٹینک، میڈیا پر کسی نئے مامور کو اپوائنٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کی ذہن سازی کی جا سکے کہ معاملات کے بگاڑ کا سبب اصحاب اقتدار نہیں ہیں بلکہ یہ اوپر سے نازل ہونے والا عذاب ہے؛ جو ہمیشہ جمہور کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے مسلط ہوا کرتا ہے۔

بات تو واقعی کافی گہری ہے مگر ایک شخص ان گنت افراد کی سوچ کیسے بدل سکتا ہے؟

بھئی! اس تجربے میں کون سی ندرت ہے؟ صدیوں کا آزمودہ نسخہ ہے! ہامان سے لے کر عہد موجود تک یہی ہوتا آیا ہے!

اس توضیح پر سب سے معمر شخص نے فوری مداخلت کی:

پرانے زمانوں کی بات اور تھی۔ اب جدید ذہن سے ایسی معصومیت کی توقع نری نادانی ہوگی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نئے تعلیم یافتہ طبقے میں روایتی معتقدات کی گرفت کمزور ہو رہی ہے۔ میرا گمان ہے، معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ کچھ یوں لگتا ہے کہ اس رنگ میں غور ہو رہا ہے، قوم کو عقل و فکر کے سپرد ہونے دیا جائے؟ یا اس کی راہ میں روکیں پیدا کی جائیں؟

ایک رفیق نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا:

یہ تو ری بالغیب ہے! بات قطعیت کے ساتھ ہونی چاہیے!

معترض نے فوراً قرض اتار دیا:

صاحب! ایک سوچنے سمجھنے والا فرد تو کبھی قطعیت کے ساتھ بات نہیں کر سکتا! اس پر باقی تینوں مسکرا دیے تو کہنے والا کچھ خفیف سا ہو گیا کہ اس نے جوشِ خطابت میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہنے کی غلطی کر ڈالی تھی! یوں تلافی کے لیے اسے طوالت میں پناہ لینی پڑی:

دوستو! دراصل اب خانقاہوں سے ریلیف نہیں مل رہا چنانچہ نئی نسل ادھر سے گریزاں ہو رہی ہے۔ عامی شامی کا ذہن یہاں تک نہیں پہنچ سکتا کہ نیم عقلی بیانیہ اب رجعت پسندوں کی ضرورت بن گیا ہے تاکہ ریشنلزم کی یلغار سے بچا جا سکے۔ اب وہی صومعہ و دستار کی حفاظت کر سکتا ہے، جسے کوئی صرف و نحو اور انگلش پیراڈائمز پر عبور رکھنے والا 'آزاد خیال' کانوں میں انڈیلے کیوں کہ حکومتی کارندہ پیش کار ہوا تو فوراً پٹ جائے گا۔ روایتی ہوا تو پڑھے لکھے لوگ ناک چڑھائیں گے۔ ان کے برعکس دھیمے لہجے میں تکلم کرنے والا وہ دانشور جب عقلیت کی مخصوص مقدار کے ساتھ اربابِ بست و کشاد پر نکتہ چینی کرے گا تو اس کی ساکھ بنے گی اور یہی ساکھ روایتیوں کو تحفظ فراہم کرے گی کہ وہ ان کے بے ضرر بیانیوں کو مسترد کرے گا اور ضرر رساں پہلوؤں کو چھوئے گا بھی نہیں! پرانے اداروں کے کرتا دھرتا اسے مطعون کریں گے مگر اس تاثر کو بھی مستحکم کریں گے کہ وہ کچھ غلطی خوردہ ضرور ہے لیکن اس نے متوازی بیانیے کی گمرہی کو رائج نہیں کیا۔ ایسا نیم دروں نیم بروں یعنی 'معتدل متکلم' جب برہان کے ساتھ یہ بیان کرے گا کہ عذاب غیب سے صرف تنبیہ ہوتے ہیں اور اس تنبیہ کو موثر بنانے کے لیے بے گناہوں کو مار دیا جاتا ہے تاکہ گناہگار متنبہ ہو جائیں! تو اس پر سب اش اش کر اٹھیں گے! سچی بات ہے، میں تو حکومتی منشا کو مدنگاہ رکھ کر اسی مفہوم کو تجاویز کی صورت میں لکھ کر لایا ہوں تاکہ عوام کی خیر خواہ سرکار کو اس فریم کے مطابق بھلے سے دانشور کی تلاش میں آسانی رہے!!

اس پر معترض ہوتے ہوئے ایک بولا:

بھئی! مجھے تو ایسی لگی لپٹی پسند نہیں! میں تو سیدھا سادہ لکھ لایا ہوں کہ عذاب و ثواب کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں قوانینِ فطرت سے روگردانی ہوتی ہے، اس کے مضر نتائج اپنے آپ مرتب ہونے لگتے ہیں۔ انفرادی سطح پر ہو تو کم خسارا ہوتا ہے، اجتماعی منفیت در آئے تو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے ____ بات ختم!

ایک سے نہ رہا گیا:

اے دانا! اب ایسی بھی سادگی کیا ہوئی! میاں! ایک ریاست میں بے شمار طبقات ہوتے ہیں۔ حاکم کو سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تائید درکار ہوتی ہے ____ آپ تو قفل ساز کارخانے سے ساز باز کر کے آئے لگتے ہیں تاکہ دیس کے آدھے سے زیادہ دروازوں کو تالے لگ

جائیں! میرے بھائی! متن راج نہیں کیا کرتا! یہ تاویل ہے جس کے ہاتھ میں عنان رہا کرتی ہے۔ متن معصوم ہوتا ہے؛ تاویل چرتر ہوتی ہے؛ اس لیے اصل مانگ اس تاویل کی ہے جو کھلی طرفیں رکھے بلکہ 'خوش غلاف' ہو!

ماحول کو اس برجستہ جملے نے خوشگوار کر دیا:

دراصل اس 'عذاب' نے ہی سب کو عذاب میں مبتلا کیا ہے کہ جو 'تعریف' کے قابل نہیں، اس کی 'تعریف' کی جستجو نے دخت ڈالا ہوا ہے!!

ایک زیرک نے گھڑی پر نظر ڈالی تو چونک کر کہا:

اٹھو پنچھیو! سوا دو بج گئے ہیں۔ باقی ماندہ علمی بیٹیں میٹنگ کے دوران کر لینا! سب ایک مرتبہ پھر میٹنگ روم کی جانب رواں دواں تھے۔۔۔لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا چیئرمین کو وزیر نے اپنی رہائش میں طلب کر لیا ہے اور انھوں نے جاتے ہوئے تاکید کی ہے کہ کسی کو جانے کی اجازت نہ دی جائے، شام کے بعد میٹنگ ہوگی!

جس نے کہا تھا کہ میٹنگ کھٹائی میں پڑتی دکھائی دے رہی ہے، بجز اس کے سب کے چہروں پر غصیلی افسردگی طاری ہوگئی! جسے دور کرنے کے لیے وہیں کیفے ٹیریا سے لنچ کیا گیا اور عذابی مکالمہ ومخاطبہ کو جاری رکھا گیا:

کہیں ایسا تو نہیں کہ سماجی سطح پر روز افزوں تشویش اور اضطراب کا سبب سائنسی دریافتیں ہیں؟ مجھے یہ خیال یوں آیا کہ سائنسی ایجادات کا مینڈیٹ تو انسانوں کو سہولت مہیا کرنے تک محدود ہے اور یہ قصہ مادیت کے مدار سے ایک انچ باہر جانے کا مجاز نہیں ہے جبکہ ذہن انسانی مادے سے کافی اوپر کے درجے کی 'چیز' ہے۔ اس کی غذا فکر ونظر ہے: سو، Food for Thought and Meditation کی معنویت کو ٹھہر کر سمجھنا ہوگا!

اختلاف کی خوگر زبان پھر متحرک ہوئی:

پہلے یہ بتایا جائے کہ ذہنِ انسانی وجود انسانی کا حصہ ہے یا نہیں؟ اگر وجود مادی ہے تو ذہن کو غیر مادی شے کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

ایک اور نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا:

عالمو! ایک ثانیے کو رکو! ذرا یہ تو بتاؤ کہ آخر ہم سب گھوم پھر کر 'انسان' ہی پہ کیوں رک جاتے ہیں؟

اس لیے کہ ہم انسان ہیں!

لیکن اس مختصر جواب سے مطمئن نہ ہونے والے نے پوچھا:

کیا ایک مکمل انسان وہی ہے جو ہر غیر انسانی مخلوق یا چیز کو نظر انداز کرے، جیسے وہ ہمیشہ ثانوی حیثیت کے بندی خانے میں قید رہے گی؟ مجھے لگتا ہے انسان منتقم مزاج ہے، وہ ہر اس شے سے انتقام لینے پر تلا ہوا ہے جو اس کی 'بقا' میں مزاحم ہو رہی ہے۔ دنیا سے نفرت کی، کوئی دوسری وجہ کم از کم میرے علم میں نہیں آ سکی!

بزرگو! رہنے دو یہ سب جوزف میکر کی The Comedy of Survival کے افکار کی صدائے بازگشت ہے!

ترنت جواب دیا گیا:

جوزف میکر ہو یا گلین۔اے۔لو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے! کبھی فرصت میں اس گہری بات پر غور تو کرنا:

''ٹائی ٹینک کے اندر کی سرگرمیاں ہمارے لیے اتنی پرکشش ہیں کہ ہم دور افق پر موجود برفانی تودے حتیٰ کہ اس پانی کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے جس کے اندر سے ہم گزر رہے ہیں۔''

اگر زمین کے محور نے اپنے مدار کی جانب تیئیس ڈگری پر جھکاؤ ظاہر کر کے اتنے متنوع موسم دان کر دیے ہیں جو رزق دیے ہی جا رہے ہیں تو ہمیں مٹی پر ماتھا ٹیکتے ہوئے شرم کیوں آتی ہے؟ مرنے کے بعد اگر کیڑے ہمارے بدن کھا بھی جائیں تو کہاں حق شکر ادا ہوتا ہے بھائی!

اب دن ڈھل چکا تھا۔ چاروں کیفے سے باہر آ کر دفاتر کے شجرزار میں چہل قدمی کرنے لگے اور اس ماضی کو یاد کرنے لگے جب اپنی: تعیناتیوں، تبادلوں اور دیگر ملازمتی مسائل کے سبب وہ وقتاً فوقتاً یہاں آیا کرتے تھے۔۔۔ایک نے مزے کی بات سنائی کہ مجھے اپنی ٹرانسفر کے سلسلہ میں اس قدر خوار ہونا پڑا، ایک روز عاجز آ کر میں سامنے مقبرے کے پہلو میں آباد مسجد کی طرف یہ سوچتے ہوئے چل پڑا کہ جا کر معلوم تو کروں، خداؤں کے اس ہجوم میں اصل خدا کا اسٹیٹس کیا ہے؟ وہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا، اس لیے ون آن ون ملاقات کے لیے بہت موزوں صورت حال تھی۔۔۔ابھی میں مکالمے کے لیے مناسب الفاظ کی جمع جوڑ کر ہی رہا تھا کہ اتنے بڑے ہال کے کونے میں ایک شخص سر جھکائے نشستہ دکھائی دیا۔ ان گھڑیوں میں وہاں ہم ہی دو مہمان تھے، تیسرا تو صاحبِ خانہ تھا، سداو ہیں قیام پذیر! اب جو غور کے ساتھ دیکھا تو یہ وہی آدمی تھا جس کے خلاف مجھے اپنا مقدمہ پیش کرنا تھا کیونکہ یہی وہ پرنخوت افسر تھا جس کے دستخط اس کی انگلیوں کی پوروں میں اینٹھے ہوئے تھے۔۔۔اس نے بھی 'سائل' کو پہچان لیا کہ تین ماہ سے متواتر اس کے دفتر میں منڈلا رہا تھا۔۔۔جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔۔۔جب وہ میرے شانے پہ ہاتھ رکھے اپنے دفتر کی جانب آ رہا تھا تو دل میں عہد یہی کیا، آرڈر لے کر اسی مسجد میں آ کے شکرانے کے نوافل ادا کروں گا۔۔۔لیکن آرڈر وصول ہوتے ہی وہیں سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا کہ بڑے خدا کی عملداری ایک مسجد تک محدود نہیں ہے، اس کی قلمرو ساری زمین کو محیط ہے، سو، کہیں بھی سر کو جھکایا جا سکتا ہے!!

برآمدوں میں چلتے چلتے انھیں اچانک احساس ہوا کہ جیسے وہ تین ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کا چوتھا ساتھی ایک بند دفتر کے سامنے کھڑا افسر کے نام کی تختی کو گھورے جا رہا تھا! پوچھنے پر اس نے بتایا یہ بڑا افسر کسی زمانے میں اس کا ہم کار تھا۔ ہم میں سے ایک کی سروس کا آغاز تھا جبکہ دوسرا اپنی مدتِ ملازمت پوری کرنے کے قریب تھا۔ فلسفے کا یہ نوعمر استاد بہت ہی بیبا اور پیارا شخص تھا۔ ہم دونوں ایک دور افتادہ شہر میں محکمہ انہار کے ایک کوارٹر میں مقیم تھے۔ اس کالونی کے

''چہارسُو''

ماحول کو متنوع درختوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا خوشبودار جنگل کہا جا سکتا تھا: سمبل، پیپل، ارجن، بیڑی پتہ، شہتوت، شیشم، پیلے پھولوں والا جنگلی کیکر، نیم، بکائن، آم، جامن، املتاس، سرس کے شاداب اشجار گردوپیش کو بہشت بنائے رکھتے تھے اور اس جواں سال ٹیچر کی درخت دوستی تو شجر پرستی کے مشابہ تھی۔ خاص طور پر اکتوبر کے مہینے میں واک کرتے کرتے رک جاتا اور السٹونیا کی مہک (Fragrance) کو سانسوں سے پینے لگ جاتا! ان دنوں یہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دن کہنے لگا: اگر میں بیوروکریٹ بن گیا تو اپنے تسمیے کی رعایت سے بے لچک عہدیدار بنوں گا مگر صرف درختوں کے معاملے میں! وہ سر جیمس جارج فریزر کے حوالے سے بتاتا تھا کہ مالوکاز میں جب لونگ کے درختوں پر پھول آتا تو ان کے ساتھ حاملہ عورتوں کا سا برتاؤ کیا جاتا۔ ان کے قریب کوئی شور نہیں مچا سکتا تھا! وسطی افریقا کا ڈائری قبیلہ یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ روحیں قیام کے لیے شاندار درختوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ ہوا میں ان کے پتوں کی سرسراہٹ کو روح کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ وہ جب بھی ایسے کسی درخت کے قریب سے گزرتے تو ادب سے سر جھکا دیتے!

پیڑوں پہ نہال ہو جانے اور گلہریوں کو سکٹ کھلانے والا یہ ہونہار اور ہرا بھرا حبیب پھر کبھی مجھے ملا نہیں وگرنہ پوچھتا کہ اس نے قدیم جرمن قوانین کی مانند درختوں کی بے حرمتی کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں تجویز کی ہیں یا نمک کی کان میں پہنچ کر خود نمک بن گیا ہے؟

غروبِ آفتاب کے بعد اب وہاں مکان کا انفرادنمایاں طور پر ابھر آیا تھا کہ سب پرندے اپنی بیٹیں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اکا دکا مکین ہی نظر آ رہے تھے اور وہ بھی تیزی سے ایگزٹ گیٹ کی جانب روانہ تھے۔ یہ چاروں بھاگم بھاگ جب تیسری مرتبہ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچے تو پرسنل سٹاف آفیسر اور متعلقہ محکمے کے پورے عملے کی غیر موجودگی میں یہ سوال ہی باقی نہیں رہا تھا کہ میٹنگ کا کیا بنا؟ پانچویں فلور سے گراؤنڈ فلور کی طرف مٹکتی ہوئی الیکٹرک لفٹ اپنے نصف اول یعنی الیکٹریسٹی سے ناگہاں محروم ہو گئی تو ان چار سواروں کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا، ایک فرشتے کا نام برقی رو بھی ہے جس کے منہا ہو جانے سے لفٹ ایک دم قبر میں تبدیل ہو گئی تھی! پون صدی کی اوسط اوڑھے یہ بوڑھے لوگ ذہنی طور پر چاق چوبند تھے کہ حالاتِ جدیدہ سے منقطع نہیں ہوئے تھے لیکن آلاتِ جدیدہ سے ان کی نہیں بن سکی تھی اور آل اولاد کے اصرار کے باوجود موبائل فون کو اپنی زندگیوں میں شامل نہ کر سکے تھے لہٰذا اب لاسلکی رابطے کی واحد شکل رہ گئی تھی، یعنی دعا کی جائے! اور اس عقیدے سے غیر متزلزل وابستگی ظاہر کی جائے کہ جب اوپر والا چاہے گا، بجلی آ جائے گی! پھر وہ ایسے ناامید بھی نہیں ہوئے کہ تجرباتی سطح پر جانتے تھے بجلی کی فطرت ہی یہ ہے؛ اچانک چلے جانا، اچانک آ جانا! علاوہ ازیں اس کی سریع الرفتاری کی مختاری، جو فاصلے کے کبر کو خاک میں ملا دیتی ہے! اس آس سے وہ توانائی کشید کرتے ہوئے حوصلے میں تو تھے لیکن ایک دوسرے سے بار بار پوچھتے بھی رہے:

لفٹ آپریٹر کو کیا کسی نے دیکھا تھا؟

ان مشکل گھڑیوں میں ایک نے شگفتگی کو قرینہ بنایا:

مکرم! اگر آپ اس گراں سمجھے جانے والے سجدے کو اسی مسجد میں ادا کر دیتے تو آج اس ابتلا کا شکار نہ ہوتے!

جس پر چوٹ کی گئی تھی، وہ مسکرایا:

تو آپ تینوں ہیں کس حساب میں؟

کیا گیہوں کے ساتھ گھن نہیں پستا؟

خوب کہی! ایک چوتھائی گیہوں اور تین چوتھائی گھن۔۔۔ انسبت تناسب ہے! واااہ!!

ایک کو تاریکی میں گھبراہٹ محسوس ہوئی تو اس نے دریافت کیا:

اس حالت میں ہم زیادہ سے زیادہ کتنی دیر زندہ رہ سکتے ہیں؟

سب سے معمر رسان سے بولا:

اس طرح کے سوالات میں اپنے پوتے سے پوچھا کرتا ہوں، جو گوگل پہ سرچ کر کے ایک منٹ میں جواب دے دیتا ہے۔۔۔ اگر میرے پاس موبائل فون ہوتا، تو اس کو کال کر کے آپ لوگوں کو بتا سکتا تھا!

سب نے قہقہہ لگایا:

یعنی موبائل فون ہوتا تو ایمرجنسی والوں کو بلانے کی بجائے پوتے سے مذکورہ انفرمیشن لی جاتی! ہاہاہا!!

اس نے خفت مٹانے کے لیے خوش طبعی کا سہارا لیا:

بابو شکر کرو، سردیوں کا موسم ہے وگرنہ شاید اب تک پارلگ چکے ہوتے!

ایک نے بے بسی ظاہر کی:

اس سردی کی وجہ سے واش روم پہلی ترجیح بنا ہوا ہے!

اس کیو بیکل میں 'کلامیے' جاری تھے، جن سے چاروں بقدر توفیق ہمت حاصل کیے جا رہے تھے!

کوئی چار ایک گھنٹے کے بعد جب بجلی آئی تو پہلی حیرت ان پر یہ طاری ہوئی کہ وہ تو کھڑے تھے، یہ ان کو کب کون بٹھا گیا؟ دوسرا تحیر یہ تھا کہ ان سے اٹھا کیوں نہیں جا رہا؟ اور تیسرا تعجب یہ وارد ہوا کہ ان کے درمیان آخری مکالمہ کتنی دیر پہلے تک جاری تھا؟ مگر کسی کی یادداشت معاونت نہیں کر رہی تھی! خیر 'ہبوط' کا پروسیس پورا ہونے پر اب وہ خود کو شتم پشتم گراؤنڈ فلور پہ زندہ سلامت محسوس کرنے کی اہلیت پیدا کر چکے تھے۔ موجودہ قید کی حالت سے نکلنا اب کوئی خاص مسئلہ نہیں رہا تھا کہ باہر سے مقفل در پہ اندر سے مسلسل دستک کسی نہ کسی چوکیدار کو متوجہ کر ہی لیتی لیکن سب سے بڑے بابے کی تجویز سے اتفاق کیا گیا اور لفٹ کی بجائے زینے کے ذریعے وہ دوبارہ پانچویں فلور پر آ گئے۔ دفاتر تو سارے بند تھے،

البتہ میٹنگ روم کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ انھوں نے اندر داخل ہو کر بلب جلائے اور جائزہ لیا تو حسبِ توقع انھیں باتھ روم اور کچن موجود ملے۔۔۔ ریفریجریٹر سے اشیائے خورونوش حاصل کی گئیں، چائے بنائی گئی، اعلا افسروں کے لیے محفوظ امپورٹڈ شوگر فری بسکٹس سے کام و دہن کو لذت فراہم کی گئی۔ سب نے ڈائیٹیز/ بلڈ پریشر کی ادویہ نگل لیں۔۔۔ آپس میں طے یہ ہوا کہ بندہ ہونے کے جبر کا تلخ ذائقہ تو بہت چکھ لیا، کیوں نہ عارضی خدا ہونے کا لطف بھی اٹھایا جائے۔۔۔ اس طرح چاروں نے باری باری چیئرمین کے لیے مختص مرکزی نشست پر براجمان ہونے کا مزہ لیا، لیکن صرف کرسی کو گھمانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے ڈیکورم کو قائم رکھتے ہوئے میٹنگ کنڈکٹ کی۔۔۔ انھیں زندگی میں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ جس اکیلی کرسی کو میز اور باقی کرسیوں نے اپنے حصار میں لیے ہوتا ہے، اس پر گزرا ایک لمحہ صدیوں کی جی حضوری پر کس درجہ بھاری ہوتا ہے!

'ایک چیئرمین' نے معلومات میں اضافہ کیا کہ کرسی فرعون کی ایجاد ہے، چنانچہ اس پر بیٹھتے ہی اس کی روح کرسی نشین میں لازماً حلول کرتی ہے اور یہ جو میز ہے نا، یہ بھی بہت امیزنگ ہے، اسے 'بیورو' کہتے ہیں۔۔۔ کرسی اور میز کے ملاپ سے ہی فرعونیت ابھرتی ہے۔۔۔

ایک سامع نے بہت مودب ہو کر پوچھا:

سر! یہ آپ کے پیچھے دیوار پر جتنی پینٹنگز آویزاں ہیں ان میں خطاطی کا فن کہیں دکھائی نہیں دیتا، نباتات اور حیوانات کے نقش و نگار کو فوقیت دینے میں کوئی خاص حکمت کارفرما ہے؟

'چیئرمین' نے لہجے میں تحکم کو ذرا مدھم کر کے جبلی دانش کو ابھرنے کا موقع دیا:

آپ نے عمدہ سوال پوچھا ہے! دیکھیے لکیروں سے حرف و لفظ بننے کا عمل بہت بعد میں ہوا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے 'نقشِ اول' کا ابہام بہت لبھاتا ہے۔ اس لیے یہ پینٹنگز خاص میری چوائس ہیں۔ ان کے توسط سے حیرو غلیفی کی طرف ناظر کا ذہن منتقل کرنے کی کوشش کارفرما ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جانوروں اور پودوں کی بنی تصویری علامتیں جو قدیم مصر میں حروفِ ابجد کی ایجاد سے قبل تحریر کے لیے مستعمل تھیں اسے Hieroglyphics کہتے ہیں بلکہ علم موسیقی کے ماہر بتاتے ہیں اب سے کوئی تیرہ چودہ سو برس قبل بلاد غربیہ میں ایک تصویری خط ایجاد ہوا تھا؛ جس میں الفاظ کی جگہ علامتیں استعمال کی گئیں، جو: خط فاصل، نقطے، جھٹکے، نوہٹے، قوسوں وغیرہ کی صورکو مظہر بناتی تھیں۔۔۔ مطلب یہ کہ فطرت کی قرات کے لیے اب بھی مصنوعی لفظوں کی بجائے فطری لفظوں پر انحصار کیا جائے تو وہ فاصلہ سمٹ سکتا ہے جو فرد اور فطرت کے بیچ ضد کیے بیٹھا ہے!!

اس تنقیح پر تینوں نے چہروں پر خوشامدانہ مدحت کا تاثر اس سرعت سے تان لیا کہ 'چیئرمین' دنگ ہو کر رہ گیا! درآں حالے کہ اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ مداہنت کا غازہ ہر اس چہرے پر اپنے آپ اور فوری اتر آتا ہے جو میز کی عمومی طرف میں موجود ہوتا ہے۔

نیم شب تک یہ ناٹک جاری رہا۔۔۔ عذاب و ثواب کی طبیعی، مابعد الطبیعی توجیہات پر عمیق گفتگو کا راگ سروں کی تیزی کو، کوملتا میں بدلتے ہوئے نتیجے کی بھیرویں لطافت سے ہمکنار ہونے کے قریب ہی تھا کہ دفعتہً میٹنگ روم کا دروازہ کھلا۔۔۔ تین چار پھرتیلے سیکیورٹی گارڈز اسلحہ تانے یکبارگی اندر داخل ہوئے اور ان چاروں بابوں کو ہینڈز اپ کرا لیا۔۔۔ بوڑھوں نے بہت واویلا کیا کہ ان کی بات تو سنی جائے لیکن کوئی محافظ اس پر قطعاً آمادہ نہیں ہوا اور انھیں تقریباً گھسیٹتے ہوئے ایک ویگن میں لا پھینکا گیا۔۔۔ اب وہ تھانے کی حوالات میں ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھے ایک دوسرے کو تسلی دے رہے تھے کہ کل اور پرسوں ہفتہ وار تعطیلیں نہ ہوتیں تو مسئلہ ہی کوئی نہیں تھا۔۔۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو دن ہی کی تو بات ہے، جلد ہی ان شاءاللہ ہم اپنے گھروں میں ہوں گے!!

بقیہ
آسیب زدہ کوٹھی

عمر کے آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہوں گی؟ شاید وہ کسی اور کو پسند کرتی ہوں؟ ہشت، یہ تو آج کل کے زمانے کی باتیں ہیں وہ شریف بوبو تھیں انہوں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اچھی عورت کے لیے تو خاندان کی خدمت میں عزت ہے، اسی خدمت میں راحت ہے۔

''بھئی ایسی گالیاں ان کے منہ سے سنیں جو میرا خیال تھا انہوں نے خود کبھی سنی بھی نہیں ہوں گی۔'' ایک عزیز نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھے عجیب سا خیال آیا کہ شاید یہ وہ گالیاں تھیں جو ذکیہ خالہ ساری زندگی دینی چاہتی تھیں اپنی زندگی کو، کسی کی دوسری بیوی بنائے جانے کو، یا اس شوہر کو جس نے انہیں خادمہ کی حیثیت دی اور اب اسٹروک نے اخلاقیات سے زباں بندی کرنے والے دماغ کے حصے کو ختم کر کے ذہن میں بسے آسیب کو رہا کر دیا تھا۔

رات کو سونے لیٹی تو نہ جانے دماغ میں کہاں سے اس کوٹھی کا خیال آ گیا جسے ہم سب بچپن میں آسیب زدہ سمجھتے تھے۔ سنسان کوٹھی میں کوئی نظر تو نہیں آتا تھا لیکن سنا تھا کہ کبھی کبھار کسی عورت کے چیخنے اور بکنے جھکنے کی آواز اس میں سے آتی تھیں۔ اسکول کے راستے میں جب یہ کوٹھی آتی تو اونچی دیوار کے اوپر سے پھیلے نیم کے درخت کی چھاؤں کے باوجود ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف چلتے تھے۔ میں کروٹیں بدلتی رہی پتہ نہیں اب بھی جیٹ لیگ کا اثر تھا یا ایک آسیب زدہ کوٹھی میں جھانک لینے کی دہشت تھی۔

خانہ پُری

تابش خانزادہ
(لاس اینجلس)

نہ اچھے وقتوں کی بات ہے جب سول انجینئرنگ کی ڈگری ملتے ہی مجھے قطر میں پڑی اچھی ملازمت مل گئی۔قطر میں بیس سال لگن سے کام کرنے کے بعد جب میری مالی حالت سدھری تو میں نے ملکی خدمت کے جذبے کے پیش نظر وطن واپس آ کر اپنے علاقے میں ایک چھوٹی سی تعمیراتی کمپنی کی بنیاد رکھی۔کمپنی کے لیے چند ملازم رکھے اور زندگی میں پہلی بار اپنے ملک میں ایک ٹھیکے کے ٹینڈر بھر کر پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں جمع کرا دیے۔میری حیرت اور خوشی دیدنی تھی جب ایک ماہ بعد مجھے فون پر میرا چالیس لاکھ روپے کا ٹینڈر منظور ہونے کی نوید سنائی گئی۔ٹھیکے کے مطابق مجھے دس میل لمبی ایک پرانی سڑک پر کھڈوں کی مرمت کرنے کے بعد اس پر نئی بجری اور تارکول کی تہ بچھانی تھی۔میرے بیس سالہ تجربے کے مطابق یہ تمام کام تیس سے پینتیس لاکھ روپوں میں آسانی سے ایک دو ماہ کے قلیل عرصہ میں مکمل ہو جانا تھا اور پاکستان میں پہلی بار مجھے اپنی محنت کے چند لاکھ روپے بچ جانے تھے۔مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میں اپنے وطن میں رہ کر اپنے وطن کی خدمت کے قابل ہوں۔

کال کرنے والے نے مجھے کہا کہ میں کل ان کے دفتر آ کر باقی ماندہ کاغذات اور فارم بھر کر دستخط کرنے کے بعد جمع کروا دوں تا کہ ٹھیکہ کی تمام کاغذی کاروائیاں جلد از جلد مکمل ہو جائیں۔خالی ہاتھ جانے کی بجائے سوچا کہ کم از کم دفتر والوں کا منہ میٹھا کرا دوں۔یہ سوچ کر دوسرے روز پی ڈبلیو ڈی کے دفتر جاتے ہوئے راستے سے دو کلو مٹھائی اور دو درجن سموسے لیتا گیا۔وہاں سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔میں نے قریب کے ایک ہوٹل سے چائے منگوائی اور دفتر والوں کی مٹھائی چائے اور سموسوں سے تواضع کی۔اس کے بعد تمام فارم بھرے اور ان پر دستخط کرنے کے بعد داخلِ دفتر کروا کر خوشی خوشی گھر آیا اور کئی دوستوں کو فون کر کے انہیں ٹھیکے کی خوشخبری سنائی۔

دوسرے روز مجھے ایکسئین صاحب کے پی اے کا فون آیا کہ صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔میں ایک کلو سوہن حلوہ لے کر ان کے دفتر گیا۔حلوہ لینے کے بعد پی اے نے مجھے بڑی محبت سے بٹھایا۔خیر خیریت پوچھنے کے بعد اس نے مجھے رازدرانہ لہجے میں کہا ہمارے صاحب بڑے سخت ہیں کسی سے تیس فیصد سے کم نہیں لیتے چونکہ آپ ہمارے اچھے دوست ہیں اس لیے میں آپ کا کام پچیس فی صد پر کرا دوں گا۔میں نے حیرت سے پوچھا کون سا کام؟ مجھے تو ان سے کوئی کام نہیں نکلوانا۔مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا، بھئی زیادہ بننے کی کوشش نہ کریں۔میں آپ کے ٹھیکے کی منظوری کی بات کر رہا ہوں۔لیکن میرا ٹینڈر تو میرٹ پر منظور ہوا ہے۔میں نے حیرت سے کہا۔وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمارے صاحب تکنیکی بنیادوں پر یہ ٹھیکہ منسوخ کرنے کی پاور بھی رکھتے ہیں۔

وہاں سے نکلا ہی تھا کہ میرے موبائل فون پر اکاؤنٹنٹ کا ٹیکسٹ ملا کہ میں اپنے ٹھیکے کے سلسلے میں ان کے دفتر ملنے آؤں۔پی اے کے دفتر سے سیدھا ان کے دفتر گیا۔انہوں نے اسی وقت چپڑاسی کو چائے کے لیے بھجوا کر مجھے اپنی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔اس کے بعد مجھے اتنا بڑا ٹھیکہ ملنے پر بڑی زوردار مبارک دیتے ہوئے کہا آپ میرے بھائیوں جیسے ہیں۔آپ کا کوئی بل میرے دفتر میں ایک دن کے لیے بھی نہیں رُکے گا۔یوں کیا کریں کہ بل بھجوانے سے پہلے مجھے ٹیکسٹ کر کے بتا دیں کہ آپ نے مجھے بل بھیجوا دیا ہے۔مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ابھی ایسے بے غرض لوگ اس جہاں میں اور ہمارے جیسے ملک میں موجود ہیں۔میں نے ان کی بے غرضی کی تعریف کرتے ہوئے اٹھتے ہوئے کہا۔اللہ آپ کو اس بے لوثی کا صلہ اس جہاں بھی دے گا اور اگلے جہاں میں بھی۔انہوں نے مجھے بٹھاتے ہوئے کہا۔بھئی ایسی جلدی کیا ہے، چائے تو پیتے جائیں۔چپڑاسی چائے لے کر ابھی آنے والا ہوگا۔میں واپس کرسی پر بیٹھا تو انہوں نے کہا میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ اپنے حصے کا بیس فیصد ٹھیکہ شروع ہونے سے پہلے لیتا ہوں اس کے بعد میں آپ کا بل بغیر کسی قسم کے تعطل کے منظور کر دوں گا۔آپ مجھے کب تک بیس فیصد دیں گے؟ میں نے بڑی حیرت سے پوچھا۔کاہے کا بیس فی صد؟ وہ ہنستے ہوئے بولے۔بھئی آپ کل کے بچے نہیں ہیں۔صاف بات یہ ہے کہ ہر ٹھیکے میں میرے اور میرے دفتر کا عملہ بیس فیصد حصہ لیتا ہے اور اس کے بغیر کسی کا ایک پائی کا بل بھی اس دفتر سے پاس ہو کر نہیں نکلتا اور ہم اپنا حصہ ٹھیکہ شروع ہونے سے پہلے وصول کرتے ہیں باقی آپ کی مرضی۔

ان کے دفتر سے نکلا تو ایس ڈی او صاحب کا چپڑاسی ان کا سلام لے کر دوار ہوا۔ایس ڈی او نے مجھے چھوٹتے ہی بڑے روکھے لہجے میں کہا۔میں آپ سے پندرہ فی صد سے ایک روپیہ کم پر بات نہیں کروں گا اور میں کسی قسم کی اگر مگر اور بہانہ بھی نہیں سنوں گا۔منہ لٹکائے واپس گھر پہنچا۔ابھی گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔باہر پی ڈبلیو ڈی کے اور سیر صاحب موجود تھے اور انہوں نے ٹھیکے کی مبارک باد کے چکر میں پڑنے کی بجائے مجھے صاف الفاظ میں مجھ سے ٹھیکے کا پانچ فیصد جگا ٹیکس طلب کیا۔

جس ٹھیکے کی وجہ سے چند روز بیشتر میں جتنا خوش ہوا تھا اب اتنا پشیمان ہو رہا تھا۔کچھ سوچ کر میں نے سب لوگوں کو دوسرے روز اپنے ہاں شام کے کھانے پر بلایا۔کھانا کھانے کے بعد میں نے کہا مجھ سے اب تک آپ تمام لوگوں نے میرے چالیس لاکھ روپے کے ٹھیکے میں سے تیس لاکھ روپے کی رشوت مانگی ہے۔آپ جیسے کتوں کے منہ میں ہڈی ڈالنے کے بعد میرے پاس صرف دس لاکھ روپیہ بچے گا، چلو میرا منافع گیا جہنم میں۔آپ مجھے بتائیں کہ دس لاکھ کی قلیل رقم سے دس میل سڑک کا ٹکڑا کیسے بن سکتا ہے؟ میری بات پر بُرا ماننے کی بجائے سب نے ہنس کر بیک زبان جواب دیا، بھولے بادشاہ، تم دس میل سڑک کے ٹکڑے کی مرمت کی بجائے اس پر چھڑکاؤ کرا دو، باقی کی خانہ پُری ہم کر دیں گے۔

''نالۂ آہ وفغاں''

سید صادق حسین کاظمی

(یکم اکتوبر 1898 تا 4 مئی 1989ء)

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لیے
یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لیے

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

کامیابی کی ہُوا کرتی ہے ناکامی دلیل
رنج آتے ہیں تجھے راحت دلانے کے لیے

نیم جاں ہے کس لیے حالِ خلافت دیکھ کر
ڈھونڈ لے کوئی دوا اس کے بچانے کے لیے

چین سے رہنے نہ دے ان کو نہ خود آرام کر
مستعد ہیں جو خلافت کو مٹانے کے لیے

استقامت سے اٹھا وہ نالۂ آہ و فغاں
جو کہ کافی ہو درِ لندن ہلانے کے لیے

آتشِ نمرود گر بھٹکی ہے کچھ پروا نہیں
وقت ہے شانِ براہیمی دکھانے کے لیے

مانگنا کیسا؟ کہ تو خود مالک و مختار ہے
ہاتھ پھیلاتا ہے کیوں اپنے خزانے کے لیے

دست و پا رکھتے ہیں تو بیکار کیوں بیٹھے رہیں
ہم اٹھیں گے اپنی قسمت خود بنانے کے لیے

○

میکش امروہوی

(بھارت)

اُس سے رشتہ تو نہ تھا کوئی قرابت جیسا
کل کوئی شخص ملا تھا تری صورت جیسا

باوضو ہو کے فرشتے بھی اُدھر جاتے ہیں
اُس کے کوچے کا تصور ہے عبادت جیسا

وہ جدھر جائے تو اس شخص کے آگے پیچھے
تتلیوں کا کوئی لشکر ہے حفاظت جیسا

اُس نے ابرو کی کمانوں کو جہاں جنبش دی
دل پہ ایک تیر لگا آ کے محبت جیسا

اُس سے ایک اور تعلق بھی نبھانا ہے مجھے
اُس سے رشتہ ہے مرا درد کی شدت جیسا

اُٹھ کے اب ہاتھ ملانے کے سوا کچھ بھی نہیں
فیصلہ کر لیا اُس نے کوئی ہجرت جیسا

وہ میرے ساتھ سفر میں تھا برابر کا شریک
بار اتنا بھی نہ تھا اُس پہ مسافت جیسا

دل کے اندر تو بہت کام رفو کے تھے مگر
ایک لمحہ بھی میسر نہ تھا فرصت جیسا

ہوں تری بزم کے سب لوگوں سے واقف لیکن
یہ الگ بات تعلق ہے رقابت جیسا

تم بھی میکش میاں منصور بنے پھرتے ہو
کیا ارادہ ہے تمہارا بھی شہادت جیسا

○

ماہرؔ اجمیری
(میرپورخاص)

حکایاتِ الم لکھتا رہا ہوں
خوشی کے ساتھ غم لکھتا رہا ہوں

پڑھی ہے زرد چہروں کی عبارت
اُسی کو بیش و کم لکھتا رہا ہوں

جنہیں کم تر سمجھتا ہے زمانہ
اُنہیں میں محترم لکھتا رہا ہوں

جو میرے ہم سفر کہتے رہے ہیں
وہ باتیں ہر قدم لکھتا رہا ہوں

جفاؤں کو بھی اپنے دوستوں کی
ہمیشہ میں کرم لکھتا رہا ہوں

مرے شعروں کے سچّے حرف ماؔہر
جنہیں میں دم بہ دم لکھتا رہا ہوں

○

اشرف جاوید
(لاہور)

جو زمیں کے رُخ پہ ہے سادگی، جو فلک پہ بل ہیں جلال کے
سبھی رنگ ہیں ترے حسن کے، سبھی روپ تیرے جمال کے

ہمی اجنبی تھے، غریب تھے، سو، کہیں بھی اوڑھ کے سو رہے
کبھی دھوپ تیرے ملال کی، کبھی سایے تیرے خیال کے

نہ زباں کُھلی، نہ نظر اُٹھی رُخِ شہ جمال کے سامنے
کئی بار آ کے گزر گئے وہی لمحے، جو تھے سوال کے

سرِ بام رقصِ ہَوا ہُوا، تو شریک اِس میں دیا ہُوا
یہ تری ادا کے ہیں معجزے، یہ ہیں شعبدے تری چال کے

کسی آنے والے کی چاپ سُن، کسی کل کا راگ، الاپ سُن
نہ سنا ہمیں یہ کہانیاں، یہ فسانے ماضی و حال کے

وہ جو دو قدم کی خلیج تھی، وہی عمر بھر نہیں طے ہُوئی
رہے فاصلے بھی کمال کے، ہُوئے فیصلے بھی کمال کے

فقط ایک شب کے وصال سے کہاں سارے قرض ادا ہوئے !
نہیں پل دو پل کا معاملہ، یہ خسارے ہیں مہ و سال کے

تجھے کیا خبر، تجھے کیا پتا! یہاں کی روایت و ریت کا
ذرا ہولے ہولے قدم اُٹھا، ذرا کھول آنکھ سنبھال کے

کوئی پیش گوئی فضول ہے کہ چہار سمت میں دھول ہے
ابھی اختیار میں کچھ نہیں، ابھی رات دن ہیں زوال کے

○

عبدالقادر تاباں
(راولپنڈی)

عکس میرا نہیں دکھایا مجھے
آئینہ کر گیا پرایا مجھے

ہو چکا تھا خلاؤں کا عادی
کون دُنیا میں کھینچ لایا مجھے

گُھل چکا ہوں مٹھاس کے صورت
شربتی آنکھ نے بلایا مجھے

پہلے تو میں نے دل کو گالیاں دیں
دل نے جی بھر کے پھر رُلایا مجھے

اب تو چاندی اتر گئی سر میں
عشق تُو نے کہاں جگایا مجھے

میں زمانے کے ساتھ چل نہ سکا
ہر زمانے، نے آزمایا مجھے

دُوریاں دو قدم پہ ہیں تاباں
قُربتوں نے بہت بھگایا مجھے

○

ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی
(میرٹھ)

بنے ہو جو رہبر وغیرہ وغیرہ
ہے شہرت کا چکر وغیرہ وغیرہ
میرے ساتھ خود بیٹھ کر پی چکے ہیں
خمار اور ساغر وغیرہ وغیرہ
نئی اِک غزل آج چھیڑی ہے میں نے
قوافی ہیں زر، پر وغیرہ وغیرہ
غلط کہہ رہے ہو کہ ہونگے برابر
وسیم اور جوہر وغیرہ وغیرہ
گلے ساؤنی رت میں ملنے لگے ہیں
ندی اور سمندر وغیرہ وغیرہ
جہاں دیکھئے آج ٹکرا رہے ہیں
مؤنث، مذکر وغیرہ وغیرہ
ترنم کے مارے ہوؤں کو کھلاؤ
دہی اور شکّر وغیرہ وغیرہ
سبھی ایک صف میں نظر آ رہے ہیں
گویئے، سخنور وغیرہ وغیرہ
تمہیں شرم کس بات پر آ رہی ہے
نہ متلی نہ چکر وغیرہ وغیرہ
صدائیں یہ اٹھیں میرے شعر سن کر
مکرّر، سہ کرر وغیرہ وغیرہ
دکھاتی ہے اب تو نئی شاعرہ بھی
ترنم کا جوہر وغیرہ وغیرہ
ادب میں بہر دور زندہ رہیں گے
جگر اور اصغر وغیرہ وغیرہ
میاں پاپولر توڑ کر پھینک بھی دو
یہ مینا یہ ساغر وغیرہ وغیرہ

○

تبسم ملیح آبادی
(راولپنڈی)

جب کبھی تیری، یاد آتی ہے
جان جاناں بہت رلاتی ہے

کیا یہ دنیا ہے کیسی دنیا ہے
رنج دے کر جو، مسکراتی ہے

دور ہے تو، مگر تری خوشبو
میرے اطراف پھیل جاتی ہے

وقت کو روکنے کی کوشش میں
سانس اپنی بھی پھول جاتی ہے

روٹھنے پر ترے، کہیں مجھ میں
شے کوئی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے

○

غضنفر ہاشمی
(یو ایس اے)

اک عجب حادثہ ہوا صاحب
خواب آنکھوں میں مر گیا صاحب
تیری دنیا نہیں ہے میرے لیے
میرے جیسا بھی کچھ بنا صاحب
میری کشتی تو خیر ڈوب گئی
تیرے دریا کا کیا ہوا صاحب
وقت کچھ دیر ساتھ چلتا رہا
پھر میں آگے نکل گیا صاحب
میرے ہمراہ سب زمانے ہیں
اور میں میرِ قافلہ صاحب
جب بھی دیکھا کسی نے چاہت سے
میں تو اندر سے ڈر گیا صاحب
ایک دریا نگل لیا میں نے
ایک مجھ کو نگل گیا صاحب
دل نے ہجرت بھی کی تو کچھ ایسے
رکھ دیا ایک در کھلا صاحب
سوچتا ہے وہ اب بنا کے مجھے
اس سے کیا شخص بن گیا صاحب
میرے لفظوں کی عمر کتنی ہے
وقت کر دے گا فیصلہ صاحب
ساری دنیا میں گھوم آیا ہوں
کوء تجھ سا نہیں ملا صاحب
تیرے ہمراہ عمر کٹ جاتی
ایک خواہش ہے اور کیا صاحب

○

نبیل احمد نبیل

(لاہور)

ختم ہو آج یہ کہانی بھی
چھین لے آخری نشانی بھی
حُسن تیرا بھی ہے زوال پذیر
ڈھل رہی ہے مری جوانی بھی
ظُلم تو ظُلم تھا مگر دیکھو
راس آئی نہ مہربانی بھی
وقت بدلا تو ساتھ چھوڑ گئے
تخت بھی، زر بھی، راجدھانی بھی
ظُلمتوں کے اُداس جنگل میں
صبح ہوتی کوئی سہانی بھی
رات کے بعد لوٹتا ہے دن
لوٹ آتی ہے کیا جوانی بھی؟
غم کی عمرِ طویل میں یارب
چند لمحاتِ شادمانی بھی
تیرے خط بھی جلا دیے میں نے
مِٹ گئی آخری نشانی بھی
شب گزارو غریب خانے پر
ہم کو آتی ہے میزبانی بھی
سرِ تسلیم خم کا دعویٰ تھا
پر کوئی بات تم نے مانی بھی
بن گئے سردیوں کا چاند آخر
تیرا جوبن مری جوانی بھی
کیا خبر اُس نے کیوں مجھے چھوڑا
اب کروں اُس کی ترجمانی بھی؟
تم نے دیکھی نہ ہو گی ایسی سبیل
آنکھ میں خون بھی ہے پانی بھی
قصّے لوگوں نے جو سُنائے ہیں
سُنتا چاہوں تری زبانی بھی
مجھ پہ کل رات جو گِری بجلی
تھی زمیں بھی آسمانی بھی
رات بھی تھک کے سو گئی ہے نبیل
ختم ہونے کو ہے کہانی بھی

اوصاف شیخ

(کراچی)

یوں ترے ہجر کا وظیفہ کیا
پل میں ہی رات کو لپیٹ دیا

زندگی کا تو جام تھا بھر پور
میں نے شاید بس ایک گھونٹ پیا

رات جو ادھڑی کھینچا تانی میں
پھر سے اک دن پکڑ کے رات کیا

شام کاسے میں بھر کے لائی سوال
رات بھر ایک اک جواب سیا

جب میں اوصاف لڑکھڑانے لگا
اپنے سائے کو میں نے تھام لیا

○

انتظار

آصف عمران
(لاہور)

رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں جب کرچی کرچی خواب نے آنکھوں کے جھروکے میں اپنے پنجے گاڑ لئے تو اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ اُس کے ذہن میں خوف اور حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی کا درد بھی جاگ اُٹھا ہے۔ تاریک رات۔۔۔گہری خاموشی۔۔۔کچی پکی نیند۔۔۔اور خواب آلُودہ فضا۔۔۔حیرت زدہ سراسیمگی کا کمبل اوڑھے وہ سوچ کے سمُندر میں غوطہ زن ہو رہا ہے کہ وہ ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اگر وہ خواب نہ دیکھے تو اُس کا زندہ رہنا محال ہو جائے گا۔ وہ پریشان ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ قلعہ کی اُنچی فصیلوں پر کرخت چہروں والے پہردار کھڑے ہیں اور اندر طویل اور مہیب سائے ہاتھوں میں بجھی ہُوئی مشعلیں لئے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ شاید کوئی آسمان گرنے والا ہے۔ عجیب سا ماحول ہے۔ دھند ہے، اندھیرا ہے، اچانک کسی گھر کے دروازے کھُلتے ہیں پھر کھٹ سے بند ہو جاتے ہیں۔ باہر بے سمت چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ پھر فضا میں دم توڑ دیتی ہیں اور پھر اُس اندھیرے میں ایک ہیولا ظاہر ہوتا ہے۔۔۔ایک عورت کا ہیولا۔۔۔بکھرے ہُوئے بال۔۔۔لیرو لیر لِباس۔۔۔تھکن سے چُور بدن اور ویران آنکھیں۔۔۔وہ اِنصاف کی دہائی دے رہی ہے۔ ہر دروازہ پر دستک دیتی ہے مگر اُس کی سُننے والا کوئی بھی نہیں ہے اور پھر اُس نے اُس عورت کی فریاد کی رسی کو تھام لیا اور آگے بڑھ کر اُس ہیولے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ اچانک چاروں طرف سے خوفناک خُونی پرندے اُن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ ہاتھوں کی تلوار کو لہراتے ہُوئے اُن سے بچنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ وہ زخموں سے نڈھال ہوتا ہے، گرتا ہے، پھر اُٹھتا ہے مگر وہ ہیولا آگے نکل جاتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ اُس کی نظریں چاروں طرف اُس ہیولے کو تلاش کرتی ہیں۔۔۔اُف۔۔۔کیا مصیبت ہے۔۔۔وہ واپس گھر کی طرف بھاگتا ہے کہ اُس کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔۔۔ہر طرف خاموشی ہے۔۔۔سناٹا ہے۔۔۔ماتھا پسینے سے تر اور پُورا جسم کانپ رہا ہے۔ اُس نے چارپائی پر بیٹھ کر ایک سگریٹ سُلگایا اور لمبا کش لے کر سوچنے لگا۔ حیرت کی کوکھ سے اُبھرنے والے خواب میں لامکانی، ہجرت اور لاتعلقی کے واضح اِشاروں کی اذیت ناک تصویر اُس کے ذہن کی سکرین پر اُبھرتی ہے۔ لمحہ لمحہ خوف۔۔۔ہیجان انگیز ماحول۔۔۔ہر کسی کا غیر محفوظ جان و مال۔۔۔جنت نظیر وادی کے زخم زخم راستوں پر لوگوں کا احتجاج۔۔۔گھروں پر چھاپے۔۔۔لاپتہ ہوتے نوجوانوں کی شہادتیں۔۔۔تار تار ہوتی عزتیں۔۔۔ہر طرف قید و بند کی مصیبتیں۔ ۔۔مظلوم لوگوں کی سب کراہیں۔۔۔سب آہیں۔۔۔سب سسکیاں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی لمبی قطاریں اور اُن میں سوار غاصبوں کی غُصے سے بھری شعلے اُگلتی آنکھیں۔۔۔یہ سلسلہ اُس وقت سے شروع ہُوا جب راجہ نے ذاتی مفاد کی خاطر قلعے کی چابی اُن ظالموں کے حوالے کر کے رعائیہ کی مرضی کے خلاف پُوری وادی پر قبضہ میں مدد دی۔ لوگ احتجاج کرتے رہے۔ اپنے حق کے لئے لڑتے رہے مگر اِنصاف کے سارے راستے بند کر کے گھر گھر پر پہرے دار بٹھا دیئے اور پھر یُوں ہُوا کہ بڑوں کی منصوبہ بندی سے کنٹرول لائن کی زنجیر نے وادی کو تقسیم کر دیا۔ پہاڑ، دریا، ندی نالے، وادیاں سب تقسیم ہو گئے اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کی فریاد پر کوئی بھی کان دھرنے کو تیار نہ ہُوا۔ اِنصاف کے دروازے بند ہو گئے اور وہ اِنصاف گھر کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ وہاں سب اِنصاف پسند اِکٹھے ہوتے ہیں لیکن اِنصاف ہوتا نظر نہیں آتا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا۔۔۔سہارے ڈھونڈتا ہے۔ بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ اُمید کے مینار سے روشنی کی کرنیں اُس کے خوابوں کو آباد رکھتی ہیں۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگ اُس کی وادی کو آزاد کرانے کے لئے جگہ جگہ عقل و خرد کی قندیلیں روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حق و اِنصاف کی خاطر اپنی آوازیں بلند کرتے ہیں لیکن پہرے دار اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے گئے اور پھر یہ پہریدار ہر گھر کے سامنے پہنچ گئے۔

سورج کی پہلی کرن کی تیز لہر نے دروازے پر دستک دی تو اُس نے دیکھا کہ دروازے پر ایک کرخت چہرے والا پہریدار کھڑا ہے۔ اُس نے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھایا تو پہریدار نے اُسے باہر جانے سے روک دیا۔ اور کہنے لگا کہ فی الحال اُسے باہر جانے کی اِجازت نہیں دی جا سکتی۔ باہر کرفیو ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ طاقت کا کیا ہے یہ تو اپنا مدار بدلتی رہتی ہے۔ آج کرفیو لگ گیا ہے۔ مجھے گھر میں ہی قیدی بنا دیا گیا ہے۔ اُس نے اپنے ذہن میں اُٹھنے والے طوفان کی لہروں کو ضبط کی چادر سے ڈھانپ دیا۔ اور پہریدار سے پوچھتا ہے کہ مجھے کب تک باہر جانے کی اِجازت مِلے گی؟

اِس سلسلے میں مَیں کچھ نہیں بتا سکتا۔۔۔پہریدار جواب دیتا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اِس وقت تُم باہر نہیں جا سکتے۔۔۔تُم اچھے وقت کے آنے کا اِنتظار کرو۔

دروازہ اَدھ کھُلا تھا۔ وہ اَدھ کھُلا ہی رہا۔ اُس نے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ پہریدار کو اُس کی یہ حرکت اپنے حکم کی نافرمانی لگی۔ اُس کا چہرہ اَور کرخت ہو جاتا ہے۔ اُس کو دروازے سے دُور دھکیل دیتا ہے۔ یہاں خاموشی سے بیٹھے رہو۔ اور ہاں! اگر تمہیں باہر نکلنے کا اِتنا ہی شوق ہے۔ پہریدار نے سخت لہجے میں کہا۔۔۔تو میری اِجازت کے بغیر باہر نکلنے کی کوشش کر دیکھو۔ لیکن یاد رکھنا کہ مَیں طاقتور ہُوں۔ قانون میرے ساتھ ہے اور مجھے ہر حال میں تمہیں باہر نکلنے سے روکنا ہے۔ ایسی صورت میں تمام تر نتائج کے تُم خُود ذِمہ دار ہو گے۔ اُس کو اندازہ ہونے لگا کہ وہ کن مشکلات میں گھِر چکا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لئے اُسے حالات کے بہتر ہونے کا اِنتظار کرنا ہو گا۔ کیونکہ اِنتظار کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ اُس نے پہریدار سے سوال کرنا بھی چھوڑ دیئے کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اُس

''چہارسُو''

کے ہر سوال کا جواب ایک ہی ہوگا کہ تُم باہر نہیں جا سکتے۔ پھر اُس نے پہریدار کے بارے میں سوچنا شروع کر دِیا کہ یہ پہریدار کون ہے۔ اُسے طاقتور کس نے بنایا ہے۔ وہ اپنے جواب کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں بھٹکا۔ نامعلوم اور خوابیدہ عدم کو معلوم دُنیا میں کھینچ لایا۔ ساتوں آسمان۔ خُوشبودار ہواؤں سے مہکی جنت، آگ کے شعلوں میں جلتی ہُوئی جہنم۔ یہاں تک کہ تخلیق کی دیوارِ کرب کو بھی چھُو چکا ہے۔ لیکن باہر خاموشی ہے، مکمل خاموشی۔۔۔ یہ اِنتظار کا ایک لمحہ ہے جو پھیلتے پھیلتے دِنوں، مہینوں اور سالوں کی بساط پر پھیل چکا ہے۔ یہ قیامت کا ایک لمحہ ہے جو چلتے چلتے رُک گیا ہے۔ جس میں وہ وقت اور مقام سے آزاد ہو گیا ہے۔ خواب اور حقیقت ۔۔۔ زِندگی اور موت۔۔۔ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان گُم۔۔۔ وہاں موجود ہے اُس کے گھر سے اِنصاف گھر تک کا فاصلہ طویل اور دُشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چاروں طرف پھیلی ہُوئی خاموشی سے اُٹھنے والے شور سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آواز کا پرندہ اُس کے گرد اُڑتا رہے اِسی لئے اُس نے سوال کا ڈول پہریدار کی آنکھوں میں ڈال دِیا ہے۔ کیا بعد میں مجھے باہر جانے کی اِجازت ہو گی؟

ممکن ہے ایسا ہو جائے۔۔۔ مگر آج اِس لمحہ تُمہیں باہر نکلنے کی اِجازت نہیں مِل سکتی۔ پہریدار نرم لہجے میں جواب دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے گھریلو سامان کی ایک ایک چیز پہریدار کو رِشوت کے طور پر پیش کرتا رہا ہے۔ وہ تمام چیزیں تو قبول کرتا جاتا اور کہہ دیتا تُم یہ بھی کر دیکھو۔۔۔ کوشش کرنے کا حق تو تُمہیں حاصل ہے۔ مگر اِس عرصہ کے دوران وہ بہت کچھ کھو چکا تھا۔ گھر لُٹ چکے تھے۔ رِشتے ٹُوٹ چکے تھے۔ کئی جانیں قربان ہو چکی تھیں۔ حق کی آواز دبانے کے لئے ظُلم کا شور بڑھ چکا تھا۔ باہر سے آنے والے اجنبی آباد ہوتے جا رہے تھے۔ پہریداروں کی تعداد مستقل طور پر بڑھتی جا رہی تھی۔

اُس نے دیکھا کہ اِس تمام عرصہ میں صِرف اِسی ایک پہریدار کا چہرہ ہی دیکھتا رہا ہے۔ وہ سوچتا اور حیران ہوتا کہ اِس طرف کِسی دوسرے پہریدار کا گزر کیوں نہیں ہوتا۔۔۔ سوچ سوچ کر وہ اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صِرف یہی پہریدار اُس کی آزادی کی راہ میں واحد رُکاوٹ ہے۔ اگر اُس کو کِسی طرح راستے سے ہٹا دِیا جائے تو وہ آسانی سے باہر آزاد فضا میں گھوم پھر سکتا ہے۔ وہ اُس کو زخمی کر کے، بے ہوش کر کے یا قتل کر کے آزاد ہو سکتا ہے۔ مگر وہ اِتنا جانتا ہے کہ جِسم کے گملے میں اُگے ہُوئے زِندگی کے مضبوط پودے کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا آسان کام نہیں ہے۔ اُسے یقین ہے کہ کِسی بھی آدمی کو مارنا اِنسانیت کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ اِس لئے وہ یہ مشکل کام نہیں کر سکتا۔ وہ اِس خیال کو جھٹک دیتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ تو ایک پُر امن اور محبت کرنے والا اِنسان ہے، وہ ہمیشہ سے ایک بہتر اور خوبصورت دُنیا کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ اُسے دُنیا کے ہر اِنسان سے محبت مگر نفرت صِرف غاصبوں، جابروں اور اِستحصال کرنے والوں سے ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے خلقِ خُدا کی محرومیوں پر آنسو بہاتا رہا ہے۔ وہ خُود ظُلم کا شکار ہُوا ہے۔ وہ خُود ظالم کیسے بن سکتا ہے۔ وہ اکثر اپنے بستر پر لیٹا سوچتا رہتا، جمائیاں لیا کرتا اور غصے میں اپنے آپ سے لڑتا رہتا۔ اُسے سِوائے کھانے یا کِتابیں پڑھنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اِس عرصے میں اُس نے اُس ایک پہریدار کے علاوہ نہ دُنیا کو دیکھا اور نہ ہی دُنیا والوں کو۔ مگر اُس کی کتابوں کی دُنیا بھی بڑی عجیب دُنیا ہے۔ وہ کتابوں کے رتھ میں لفظوں کو جوت کر اُس پر سوار ہو کر بڑے اِنہماک اور سرگرمی سے مُلک مُلک کی زبان اور فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا۔ اُن کتابوں کے ذریعے وہ اپنے تخیل میں جنگل جنگل گھوما۔ ہرنیوں اور وحشی جانوروں کا شکار کیا۔ رات کی تنہائیوں میں ہلکے بادلوں کی طرح اُڑ کر خوابوں کی دُنیا میں پہنچ جاتا۔ وہ محسوس کرتا کہ نیلے آسمان پر کوئی لرزتا ہُوا سایہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے جِس کے سُبک پاؤں کی سنہری پازیب ہر بڑھتے قدم پر موسیقی بھری آواز اُس کے دِل کے آنگن میں اِس طرح پڑتی جِس طرح رحمت ایزدی گُنہگاروں پر نازل ہوتی ہے۔ اُس نے اُس موسیقی کی لہروں کو اپنے دِل کے آنگن میں رقص کناں دیکھا جہاں اُس کی محبت کے نغمے اُن لہروں کے ہمنوا ہو کر اُسے مسرور کرتے۔۔۔ سایہ لرزتا رہتا۔۔۔ پازیب بجتی رہتی۔۔۔ ستارے داد دیتے رہتے۔۔۔ وقت کا پہیّہ چلتا رہتا۔۔۔ اُمیدوں کے چراغ جلتے بجھتے رہتے۔ وہ راتوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا اور وہاں سے صُبح کے سورج کو زرد بادلوں میں سے طلوع ہوتے دیکھتا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی صِرف یہی پہریدار نظر آتا اور وہ سوچنے لگتا کہ اگرچہ آج یہ پہریدار اندھے قانون کی وجہ سے طاقتور ہے لیکن موت ایک دِن زمین کے نیچے بسنے والی چوہیا کی طرح اِسے رِزقِ خاک کر دے گی۔ غاصبوں کا ظُلم، اِستحصال کرنے والوں کی شہرت اور طاقتور پہریداروں کی حشمت سب زمین کے ساتھ جل کر راکھ ہو جائے گی۔ یہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ جھوٹ کو سچ، بدصورتی کو خوبصورتی، نا اِنصافی کو اِنصاف سمجھتے ہیں لیکن ایک دِن آئے گا جب اِن کی حیرت کی اِنتہا نہ رہے گی اگر یک لخت سیب اور آم کے درختوں پر پھل کی بجائے مینڈک اور چھپکلیاں لگنی شروع ہو جائیں۔ ہرے بھرے باغوں میں گلاب کے پھولوں سے خوشبو کی جگہ گھوڑے کے پسینے کی بُو آنے لگے۔ تب اِن کی کمر اور ہاتھوں کے رگ و ریشے میں پشیمانی اور پچھتاوے کا سیاہ سیال مادہ بہنے لگے گا۔ یہ زمین کے ٹکڑوں پر قبضے کے لئے لڑتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم بہت کامیاب و کامران ہیں کیونکہ ہم صحیح ہیں۔ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ تُم غلط ہو، تُم صحیح ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ دھرتی جنم جنم سے ہماری ہے۔ تُم اِسے چھین نہیں سکتے۔ مَیں اِنصاف گھر پہنچوں گا اور اِنصاف لے کر رہُوں گا۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے وہ اُٹھا اور کُرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگا۔

''اَے پہریدارو!

میں یہ پیغام دُنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں لکھ رہا ہُوں۔ اِسے اُن زبانوں کے ماہرین اور اِنصاف گھر میں بیٹھے ہُوئے لوگوں کو دِکھانا۔۔۔ اُن کو پڑھانا۔۔۔ اگر وہ اِسے صحیح سمجھیں گے تو مَیں سوچتا ہُوں کہ وہ میرے لئے آواز بلند کریں گے اور اگر کِسی طرف سے ایک بھی آواز حق و سچ کے لئے اُٹھے گی تو مَیں سمجھوں گا کہ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ تُم میری اُس روحانی مُسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مَیں کِتنا خُوش ہُوں گا جب تُم سب بہتر اور

خوبصورت آزاد زِندگی گزارو گے۔کل سورج کی پہلی کِرن کا ہاتھ تھام کر مَیں اِنصاف گھر میں پہنچ جاؤں گا۔مگر تُم ایک بات یاد رکھو کہ ہر شخص اِنصاف اور آزادفضا تک رسائی چاہتا ہے۔اِنسانی ذہن میں صدیوں سے پیدا ہونے والے خیالات اور تاریخی واقعات میرے دماغ کی وسعت میں سما چکے ہیں۔اور مَیں اِس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ ہر چیز باطل ہے،ناپائیدار ہے،ایک پُشت آتی ہے اور پچھلی پُشت چلی جاتی ہے مگر وقت کا پہیّہ چلتا رہتا ہے۔

اِس کو کوئی نہیں روک سکتا۔میری اِنتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں''۔

پہریدار حیران ہو کر اکثر سوچتا ہے کہ یہ شخص اِن حالات اور ماحول میں اب تک مرکیوں نہیں گیا۔اِس کا جذبۂ شوق شہادت نہ جانے اب تک اور کیسے زِندہ ہے۔آہ بے چارہ،باہر جانے کی خواہش میں وقت کی صلیب پر سُوکھ کر اِس کی کیا حالت ہوگئی ہے۔پہریدار نے کمرے کی طرف دیکھا وہاں ایک شمع ٹمٹما رہی ہے اور وہ میز کے سامنے بیٹھا ہے۔وہاں سے پہریدار کو صِرف اُس کی پیٹھ، سر کے لمبے بال اور ایک ہاتھ دِکھائی دے رہا ہے۔کُھلی ہُوئی کِتابیں میز پر، کرسیوں پر،اور فرش پر بکھری پڑی ہیں۔اُس کے پڑھنے کی مِثال یُوں لگتی ہے جیسے وہ سمُندر میں تباہ شُدہ جہاز کے ٹُوٹے ہُوئے تختوں کے درمیان تیر رہا ہے اور اپنی جان بچانے کی جدوجہد میں ایک تختے کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف پھر دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے تختے کی طرف نہایت بے تابی سے لپک رہا ہے۔رات کے پچھلے پہر میں نیند سے بوجھل دماغ کو ہلکا کرنے کی خاطر پہریدار نے سوچا کہ وہ اُس کے قریب جا کر اُسے دیکھے اور اُس سے بات کر کے پوچھے آخر وہ یہ قیدِ تنہائی کِس کے لئے کاٹ رہا ہے۔پہریدار کمرے میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ میز کے سامنے ایک عجیب وغریب اِنسان بیٹھا ہُوا ہے۔اُس کا حُلیہ بدل چکا ہے۔جِسم سُوکھ کر ہڈیوں کا پنجر بن گیا ہے۔بال عورتوں کی طرح لمبے اور داڑھی بڑھ چکی ہے۔چہرہ زرد اور مٹیالا ہو چکا ہے۔سفید بالوں والے سر اور جھُریوں والے چہرے کو دیکھ کر اُسے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی صحت منداور خوبصورت نوجوان ہے جو اُسے پہلے دِن مِلا تھا۔جھُکے ہُوئے چہرے کے سامنے میز پر ایک کاغذ پڑا ہُوا تھا ،جِس پر باریک حرفوں سے کئی زبانوں میں ایک پیغام لکھا ہُوا تھا۔پہریدار نے کاغذ اُٹھایا اور اُسے پڑھنے لگا۔

پہریدار کاغذ پر لکھی ہُوئی عبارت پڑھ چکا تو اُس کے ذہن میں ہمدردی کی لہر کا طوفان اُٹھ کھڑا ہُوا۔اُس کے خیالوں اور سوچوں کی دِیواریں لرز اُٹھیں۔اُس کو اِس حال میں دیکھ کر پہریدار نے اِس سے پہلے کبھی اپنے آپ کو ایسا حقیر نہ سمجھا تھا جیسا وہ اب خُود کو محسوس کر رہا تھا۔اُسے اپنا ہر عمل ندامت کے تیروں کی طرح خُود میں پیوست ہوتا محسوس ہُوا۔اُسے اپنی زِندگی ظُلم اور زیادتی کی علامت بن کر ماتھے پر پسینے کے قطروں کی طرح محسوس ہُوئی۔اُن تمام برسوں میں گزرے وقت کے واقعات ایک سوال بن کر اُس کے وجود کے سمُندر میں تیرنے لگے۔

پہریدار نے دیکھا کہ ناتوانی کے سبب وہ اپنا جِسم اُٹھانے سے بھی معذور ہو چکا ہے۔اُس کے سب سوال ختم ہو چکے ہیں اور اب یہ شخص اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہا ہے مگر اُس کی کمزور آنکھوں میں اُمید کی شمع روشن ہے۔جِس کی روشنی سے کمرے کی سب دیواریں روشن مینار بن چکی ہیں۔پہریدار نے محسوس کِیا کہ اُس کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں آہستہ آہستہ حرکت پیدا ہو رہی ہے۔تب اُس حرکت نے آنکھوں میں جلتی ہُوئی اُمید کی شمع کی جلتی ہُوئی رسّی کو پہریدار کی ساعت کی جھاڑی پر پھینک دِیا جِس سے اُس کے کان جل اُٹھے اور آنکھوں کے سامنے ایک لرزتا ہُوا سایہ فضا میں حرکت کرنے لگا جِس کے سُبک پاؤں کی سنہری پازیب ہر بڑھتے قدم پر موسیقی کی لہریں پیدا کر رہی ہے۔سایہ لرزتا رہا۔۔۔پازیب بجتی رہی۔۔۔شب گزیدہ سحر بکھرتی رہی۔پہریدار خاموشی سے اُس کی خاموش آواز کو محسوس کرتا رہا۔اُس نے دیکھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے میں حرکت پیدا ہُوئی۔سائے نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اُٹھا کر دروازہ کی طرف چلنے لگا اور پھر باہر نکل کر گلی میں آگے بڑھنے لگا۔پہریدار کی نظریں خاموشی سے اُس کا تعاقب کرتی رہیں،گلی کے موڑ تک وہ نظر آتا رہا،پھر موڑ مڑتے ہی پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔تب پہریدار نے چاروں طرف بکھری کتابوں اور خالی کرسی کو دیکھا،اُس کا لکھا ہُوا پیغام جیب میں رکھا اور خُود بھی دروازہ کھُلا چھوڑ کر گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔

- بقیہ -

سسکتا رشتہ

اور بوسیدہ کپڑے تھے۔اس کی چال سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شخص رنج و غم کا مارا ہوا ہے۔وہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔وہ زندگی سے مایوس ہو چکا ہے۔وہ اب صرف زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔

جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔وہ کوئی اور نہیں،فرمان تھا۔

میں نے بڑی بے تابی سے اپنی بیوی سے پوچھا،یہ فرمان کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وہ بیمار ہے؟اس کی بیوی اور بیٹیاں کیسی ہیں؟

میری بیوی نے افسوس جتاتے ہوئے بتایا۔

فرمان کی بیوی اور دونوں بیٹیاں اسے چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں،کافی تلاش کیا گیا مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔

لیکن وہ لوگ فرمان کو چھوڑ کر کہاں اور کیوں چلے گئے؟

بیوی نے اپنی عادت کے مطابق مختصر سا جواب دیا۔

کہاں چلے گئے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔لیکن کیوں چلے گئے؟اس کا جواب تم خود بھی جانتے ہو۔یہ کہتے ہوئے وہ غم زدہ آواز میں بولی:

ہر رات فرمان کے بہکے قدموں نے رشتوں کو ایسی اذیت دی کہ ان کے باہمی رشتے سسکنے لگے۔جب اسکی بیوی روز روز کی چک چک سے تنگ آ گئی تو ایک دن اسکے برداشت اور صبر کے باندھ ٹوٹ گئے اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ کہیں گم ہو گئی،ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے!

سسکتا رشتہ

رئیس صدیقی
(دہلی)

دھت۔۔۔دھت۔۔۔اَبے چُپ۔یہ کتے بھی ہمیشہ بے وقت کا راگ الاپتے رہتے ہیں!

کسی کی بہکی بہکی آواز سرد فضاؤں میں گونجی اور سامنے کی گلی کے کُتّے ایک سُر میں بھونک نے لگے۔

میں اپنے گھر کی دوسری منزل پر بنے اپنے کمرہ میں لیٹا مطالعہ میں محو تھا اور دیوار پر آویزاں گھڑی رات کے گیارہ بجا رہی تھی۔کتّوں کی آوازیں سُن کر میں اپنی آنکھوں کو کچھ راحت دینے کے لیے اور کچھ یہ دیکھنے کے لیئے بالکنی میں آکر کھڑا ہو گیا کہ آخر گلی کے کُتّے اتنی سردی میں بھی اپنے گلے کو لگاتار اتنی زحمت کیوں دے رہے ہیں!

بہر حال، میری نگاہیں اُس گلی کا جائزہ لینے لگیں جہاں ایک شناسا کے گھر کے روشن دانوں سے روشنی چھن چھن کر گلی کی تاریکی کو چیر رہی تھی اور کُتّوں کی بھوں بھوں سے زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

دھت۔۔۔دھت۔۔۔اَبے چُپ! کیا تم لوگ مجھے جانتے نہیں؟ میں تم سب کا دوست، مسٹر فرمان ہوں۔

سبھی کُتّے ایک لمحہ کے لیے ایسے خاموش ہو گئے جیسے وہ سب فرمان کے طابعدار ہوں۔

اسی اثناء میں دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک نسوانی صدا سنائی دی، آپ آ گئے۔آج بھی بہت دیر کر دی۔

ہاں، میں آ گیا۔دروازہ بند کرو اور جلدی سے مجھے کھانا گرم کر کے دو۔بہت بھوک لگی ہے۔فرمان نے حکم دیا۔

مجھے کیا، گلی کے سب ہی لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جب فرمان رات گئے نشے کی حالت میں لوٹتا ہے تو پورا گھر کچھ دیر کے لیے جہنم بن جاتا ہے۔بیوی، جسے وہ بہت چاہتا ہے، وہ اپنے شوہر کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی اور اس کا جسم مارے خوف کے تھر تھراتا کیونکہ فرمان نشے کی حالت میں ذرا ذرا سی بات پر بے قابو ہو جاتا اور اپنی بیوی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر اول فول بکتا۔فحش گالیاں دیتا۔اُس کی چوٹی پکڑ کر فرش پر گھسیٹتا اور پھر پیٹنے لگتا۔

اس صورتِ حال میں، اس کی چھوٹی چھوٹی دو معصوم بیٹیاں چیخ کر جاگ اٹھتیں۔فریاد کرتیں، ہاتھ جوڑتیں، گڑگڑاتیں، مگر وہ؟ وہ کسی کی نہیں سنتا۔

البتہ جب وہ چلاّتے، مارتے اور گالیاں بکتے بکتے تھک جاتا تو اپنے کمرہ کے ایک کونے میں نڈھال ہو کر کہیں پڑ جاتا اور اس کی بچیاں رات بھر خوف کے مارے نہ روتیں اور نہ سوتیں۔اس کی بیوی بھی پوری رات اپنی قسمت کو کوستی رہتی مگر فرمان ساری رات دنیا سے بے خبر خراٹے بھر رہا ہوتا۔اس رات بھی سب کچھ ایسا ہی ہوا۔

فرمان ایک سرکاری دفتر میں اکاؤنٹینٹ تھا۔شروع میں سب ٹھیک ٹھاک تھا۔جلد ہی لوگوں نے اپنا کام کروانے کے لیے اسے تحفے دینے شروع کر دیے۔بہت جلد ان تحفوں نے رشوت کی شکل اختیار کر لی۔اب وہ آفس ٹائم کے بعد تھوڑی سی شراب چکھنے لگا۔پھر اسے ایسا چسکا لگا کہ وہ پینے لگا اور دھیرے دھیرے اسے اسکی ایسی لت لگی کہ روزانہ اسکا یہ معمول بن گیا۔آہستہ آہستہ وہ آفس کے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے لگا۔پھر اس کھیل نے قمار بازی کا روپ اختیار کر لیا۔اب اسے جوا بہت اچھا لگنے لگا۔اس شغل میں اسکا کافی وقت دفتر اور نئے دوستوں میں گذرنے لگا۔اب وہ اکثر و بیشتر کافی رات کو گھر آتا اور پھر وہ گھر اس کی بیوی اور بیٹیوں کے لیے جہنم بن جاتا۔

لہٰذا میں نے طے کیا کہ میں اسے سمجھاؤنگا، کہ وہ نشے اور قمار بازی سے توبہ کرے اور اپنی بیوی اور معصوم بیٹیوں کی زندگی جہنم نہ بنائے۔

اِس ارادہ کے ساتھ جب میں دوسرے دن صبح اُس کے گھر پہنچا اور دروازہ کی گھنٹی بجائی تو اندر سے آواز آئی۔

کون صاحب ہیں؟

میں ہوں، رئیس، رئیس صدیقی۔

آیئے، آیئے، تشریف لایئے۔

بڑی خوشگوار آواز میں جواب ملا۔

جب میں گھر کے اندر داخل ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی فرمان ہے، جس کے قدم رات کو بہک جاتے ہیں۔یہ وہی دونوں بیٹیاں ہیں جو رات کو اپنے باپ کے سامنے رو رو کر گڑگڑا رہی تھیں۔

مگر اس وقت وہ دونوں اپنے باپ کے ساتھ کھیلنے میں مست تھیں، خوش تھیں، چہرے پر مسرّت چھائی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی چائے لے کر آ گئی۔رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں لیکن وہ اپنی دونوں بیٹوں کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھی۔

یہ خوشگوار ماحول دیکھ کر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔میں نے چائے پی اور یہ کہتے ہوئے اجازت لی کہ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے، پھر کبھی آؤں گا۔

آج ایک ماہ کے سرکاری دورہ کے بعد جب میں ایک افسانہ لکھنے کے لیے گھر کی دوسری منزل پر بنے اپنے اسٹڈی روم ▯ میں بیٹھا تو میرے قلم ندارت تھے۔دراصل میری بیٹی شمن کی بہت بڑی کمزوری ہے میرے قلم۔لہٰذا میں اپنی بیوی سے پین لینے کے لیے زینے سے نیچے اتر ہی رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر میری نظر سامنے والی گلی میں آتے ہوئے ایک آدمی پر پڑی۔اس کے چہرہ پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔سر کے بال ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔جسم پر میلے

باقی صفحہ ۸۱ پر ملاحظہ کیجیے

ادھورا جسم

رعنا کوثر
(نیویارک)

یہ گھر بھی ایک نعمت ہے، چاہے اپنا ہو یا کرائے کا، اس کے اندر جو سکون ہوتا ہے وہ روح کو تروتازہ رکھتا ہے۔ اوائل اپریل کی صبح تھی، دھوپ بڑی سفید خوبصورت کھڑکیوں سے گزر کر اندر آ رہی تھی۔ عمدہ قالین پر ایک پروقار خاتون سمرہ بیٹھی، دھوپ بھی سینک رہی تھیں اور فون پر پیغامات بھی دیکھ رہی تھیں۔ بڑے کشادہ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ گھر سے باہر لمبے، بانس جیسے درخت کھڑے تھے۔ پودے ہوا سے لہرا رہے تھے اور چڑیاں گھاس پر پھدک رہی تھیں۔

امریکہ کے ایک نواحی علاقے میں یہ نیا گھر، کچھ عرصے پہلے ہی سمرہ اور ان کے شوہر خلیق نے خریدا تھا۔ سمرہ نے فون سے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آج تو بڑا اچھا موسم ہے، وہ خود سے بولی اور فون میز پر رکھ کر وہ کمرے سے باہر آئی، جوتے پہن کر وہ ٹہلنے گھر سے باہر نکل گئی۔ چلتے ہوئے وہ بہت دور نکل گئی۔ سفید اور گلابی پھولوں سے لدے درخت اچھے لگ رہے تھے۔ تھکن کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ سمرہ نے ہلکے ہلکے واپس گھر کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے جوتے ایک طرف رکھے، فرج میں سے جوس نکالا اور ہلکے نیلے، چمڑے کے صوفے پر بیٹھ کر گلاس منہ سے لگا لیا۔ کتنی فراوانی ہے ہر چیز کی اس ملک میں۔ شاید اسی لیے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں، اس نے سوچا۔

آج چھٹی کا دن تھا اور سمرہ کو یہ دن اکیلے ہی گزارنا تھا۔ روزانہ وہ اپنے کام پر چلی جاتی۔ گھر آتی تو شام ہو جاتی۔ چھٹی والے دن کہیں نہ کہیں جانا ہوتا مگر آج اتفاق سے کہیں جانا آنا بھی نہیں تھا۔ اس کے شوہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ وہ آج اپنے گھر میں مزے کر کے خوش ہو رہی تھی۔

سمرہ کو امریکہ آئے تین دہائیوں سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ پاکستان میں ایک متوسط علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ دو ہی بہنیں تھیں ایک کی شادی ہو گئی تھی۔ سمرہ نے فارمیسی میں ڈگری لی تھی۔ اب یہ قسمت کہ ابھی پڑھائی ختم ہی کی تھی کہ پتہ چلا کہ امریکہ اس قسم کی ڈگری والوں کو ویزہ دے رہا ہے، اسے گرین کارڈ کہتے ہیں۔ اس کے بہت سارے دوستوں نے نہ صرف خود اس موقع سے فائدہ اٹھایا بلکہ سمرہ کو بھی ساتھ ہی ویزہ دلوا دیا۔ یوں لگا چھپر پھاڑ کے کچھ مل گیا ہے۔ سمرہ کا تو دل اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ نیویارک کی سڑکوں پر چل پھر رہی ہے۔ ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ شروع میں تو دل بھی نہیں لگا۔ بڑی بہن، ماں باپ سب وہیں رہ گئے۔ وطن یاد آیا، اپنا کمرہ، اپنا گھر، اپنے کھانے، اس نے ہر چیز کو یاد کیا۔ مگر اب تو یہیں رہنا تھا۔ بہت کچھ سیکھنا تھا۔ انگلش آتی تو تھی مگر ہر زبان کے سمجھنے اور بولنے میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ آداب ہوتے ہیں۔ نئے شہر کے لوگوں کو سمجھنا، ان سے بات چیت کرنا کچھ آسان نہیں تھا۔ جلد ہی اسے ایک ہسپتال میں جاب مل گئی، مگر شروع کا ایک سال بہت مشکل تھا۔ وہ انگلش بولتی تو تھی مگر بہت لوگ سمجھ نہ پاتے۔ وہ کچھ دب سی جاتی اور اس ملک کے لوگ اسے نیا سمجھ کر خوب استعمال کرتے۔ وہ کام میں جتی رہتی، اپنا کچھ ہوش نہ تھا۔ مگر پھر وقت کے ساتھ وہ بہت کچھ سیکھ گئی۔ اب وہ ایک خود اعتماد سمرہ تھی۔

ڈاکٹر خلیق بھی اسی ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتے تھے جنہوں نے ان کو بلوایا تھا۔ وہ اب شادی کرنا چاہتے تھے۔ سمرہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے رشتہ دینے میں دیر نہ کی، اور یوں وہ سمرہ خلیق ہو گئی۔

اب ان کے تین بچے تھے اور وہ اپنی محنت اور لگن سے ترقی کرتے ہوئے عمر کی اس منزل میں تھے جہاں آپ کے پاس وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کی آپ تمنا کرتے ہیں۔ بچے جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی مرضی کرنے لگتے ہیں۔

تین بیٹوں میں سے ایک بیٹے راشد نے اپنی پسند سے ایک افغانی لڑکی سے شادی کر لی جو امریکہ میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ چھوٹے ساجد نے ایک پاکستانی امریکی سے شادی کر لی، بیچ والا حامد ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ سمرہ اکثر اسے شادی کا کہتیں مگر وہ اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف تھا۔ نہ تو وہ باپ کی طرح ڈاکٹر تھا اور نہ دو بھائیوں کی طرح بڑی ڈگریاں لی ہوئی تھیں۔ گریجویٹ کر کے پہلے تو وہ فلوریڈا چلا گیا وہاں سے ہوٹل منیجر بن کر واپس اپنے والدین کے پاس آ گیا۔ اسپینش زبان بھی اچھی بولتا۔ ایک ہوٹل میں جاب کر رہا تھا۔ اپنا فلیٹ لے کر الگ ہی رہتا۔

سمرہ کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ سلمٰی کوشش کر رہی تھی حالانکہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کی طرح خوش شکل تھا ان دونوں سے لمبا تھا مگر ابھی تک لڑکی نہیں ملی تھی۔

ایک دن سمرہ اور خلیق شام کی چائے پی رہے تھے کہ ان کے بڑے بیٹے کا فون آیا ہم آپ کی طرف آ رہے ہیں۔ ایک خوش خبری ہے جو آپ کو حیران کر دے گی۔ راشد نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اچھا وہ دونوں خوش ہو گئے۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ دونوں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو راشد اپنے بھائی حامد کے ساتھ کھڑا تھا۔ حامد کا بازو پکڑے ایک چھوٹے قد کی گوری چٹی لڑکی کھڑی تھی۔

سمرہ کی نظر اس کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کے پورے سراپے پر پڑی۔ اس کے تو لگ رہا ہے بچہ ہونے والا ہے۔ راشد نے زور سے کہا، سرپرائز ماما۔ اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کے غبارے بھی تھے۔ سمرہ سب کچھ سمجھتے ہوئے دروازہ چھوڑ کے اندر آ کر بیٹھ گئی۔ راشد نے اندر آ کر پھول اپنی ماں کی گود میں رکھ دیے۔ باپ کو مسکرا کر دیکھا اور بولا، میں نے کہا تھا ناں حیرت اور خوشی کی خبر ہے۔ حامد نے شادی کر لی ہے۔ اس لڑکی کا نام مریا ہے۔ اس دوران حامد مریا کے ساتھ صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ مریا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈاکٹر خلیق دکھ اور افسوس سے بولے، ہے تو اچھی خبر مگر ہم کو کیوں بتانے آ گئے۔ اب بھی اپنے تک ہی رکھتے۔ مجھے بھی آج ہی معلوم ہوا ہے۔ راشد بولا مگر حامد ہمیں شادی میں تو شریک کر لیتے سمرہ نے بھی غصے سے کہا۔ کیا میں منع کر دیتی؟ حامد نے اٹھ کر سمرہ

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر منانے والے انداز میں کہا، سوری مدر۔

ڈاکٹر خلیق اور سمرہ غصہ نکالنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کر چکے تھے کہ ان کے بیٹے نے ان کو بتائے بغیر شادی کر لی ہے۔ مریا کچھ بے آرام سی لگ رہی تھی۔ سمرہ کو اس پر ترس آیا۔ ابھی تک انہوں نے اس کو گلے بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی اس کو گلے لگایا۔ مبارک ہو وہ انگلش میں بولیں۔ آرام سے بیٹھ جاؤ، یہ تمہارا ہی گھر ہے وہ انگلش میں بولیں۔ چائے پیو گی؟ امی اسے انگلش نہیں آتی۔ یہ ابھی کچھ عرصے پہلے میکسیکو سے آئی ہے حامد بولا۔ نہیں؟ سمرہ نے گھبرا کر کہا۔ یہ کہاں کام کرتی ہے؟ میرے ہوٹل میں ویٹرس ہے، اصل میں اس کے پاس گرین کارڈ بھی نہیں ہے حامد نے سچائی سے کہا۔ سمرہ نے بے یقینی سے اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، خلیق صاحب نے اٹھ کر اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور طنز سے بولے: او کے ینگ مین، تمہاری زندگی ہے، تم کو ہی جینا ہے، تم نے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔ حامد نے آہستہ سے کہا، تھینک یو ڈیڈی، یہ بہت کیوٹ اور اچھی لڑکی ہے میرا بہت ساتھ دیتی ہے مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔

بہت جلد حامد نے خوش خبری سنا دی وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔ یوسف گول مٹول پیارا سا بچہ۔ سب نے مریا کو قبول کر لیا تھا۔ وہ بڑی محنتی تھی۔ جب بھی آتی گھر کا ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتی۔

سمرہ اپنی ہر شام گھر سے باہر بنے لکڑی کے ڈیک پر گزارتی۔ وہاں سے دور تک بچھی گھاس اور پھول پودے ذہنی تھکن کو دور کر دیتے۔ آج بھی وہ چائے کا کپ لے کر باہر آ گئی۔ ابھی چائے پی ہی رہی تھی کہ حامد یوسف کو لے کر آ گیا۔ یوسف اب ایک سال کا ہو گیا تھا، چلنے لگا تھا۔ آہا، آ گیا میرا گڈا، سمرہ نے اسے پیار کیا۔ وہ ان کی گود سے اتر کر لان میں کھیلنے لگا۔ لمبے لمبے درختوں کے پیچھے وہ اچانک چھپ جاتا اور باہر نکل کر خوب تالیاں بجاتا۔ وہ اچانک گرا تو حامد نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ مما آپ کو کچھ بتانا ہے وہ بولا۔ ہاں بولو، سمرہ نے کہا۔ انہیں اپنے اس بیٹے سے ہمدردی بھی بہت رہتی تھی۔

مما میں نے مریا سے شادی کے بعد تمام کاغذات بھر دیے تھے۔ مگر چونکہ وہ غیر قانونی طور پر امریکہ آئی تھی، اس لیے اسے واپس جانا ہوگا۔ اسے یہاں سے بے دخل کیا جا رہا ہے، حامد نے تفصیل سے بتایا۔ اچھا یہ تو اچھی خبر نہیں ہے، سمرہ پریشانی سے بولیں۔ یوسف کا کیا ہوگا؟ وہ بھی ساتھ جائے گا۔ مگر وہ تو یہاں رہ سکتا ہے میں رکھ لوں گی، سمرہ نے بے قرار ہو کر کہا۔ نہیں مما، میں اسے اپنی ماں سے جدا نہیں کر سکتا، حامد بولا۔ اور تم؟ انہوں نے پوچھا تم تنہا رہو گے؟ میں آتا جاتا رہوں گا۔ کتنا عرصہ لگے گا؟ سمرہ نے پوچھا۔ مما جو لوگ اس طرح آتے ہیں انہیں دس سال آنے کی اجازت نہیں ہوتی، حامد نے کہا۔ تو وہ دس سال وہاں پلے گا۔ ہاں، وہاں مریا کے رشتے دار ہیں، حامد نے کہا۔ سمرہ کچھ نہ بولیں۔ ان کی نظر گھر سے باہر اونچے بانس جیسے درختوں پر پڑی، جن کی جڑیں زمین میں نجانے کہاں سے کہاں تک ہوں گی۔ وہ خود اونچے سے اونچے ہوئے جا رہے تھے، جیسے شاید آسمان چھو لیں۔ ان کا یہ لمبا سا بیٹا بلاوجہ ہی مشکلوں میں پھنس رہا تھا۔

حامد نے ماں کو تسلی دی، امی آپ پریشان نہ ہوں، وہ وہاں آرام سے رہے گا، میں آتا جاتا رہوں گا پیسے بھیجوں گا۔ خلیق صاحب بھی یہ سب سن رہے تھے۔ بیٹا ہم وکیل کر لیتے ہیں، مقدمہ لڑتے ہیں۔ نہیں ڈیڈی، انہیں جانا ہی ہوگا، یہی قانون ہے۔ وہ تو شکر ہے میں نے مریا سے شادی کر کے اس کے لیے بہت آسانی کر دی ہے۔ بے شمار میکسیکن والدین کو یہاں غیر قانونی رہنے کی وجہ سے بے دخل کر دیا گیا اور ان کے بچے یہیں رکھ لیے گئے۔ وہ معصوم بچے یوسف کی عمر کے بھی اور بڑے بھی، سب کو مختلف سینٹرز میں رکھا گیا ہے، وہ لوگوں کو بانٹے جا رہے ہیں۔ والدین تو یہاں آ ہی نہیں سکتے۔ حامد تفصیل سے بتلا رہا تھا۔ سمرہ نے یوسف کو گود میں لے کر آنسو بھری آنکھوں سے پیار کیا۔ گھر پیارا گھر، یوں لگا یوسف بے گھر ہو رہا ہے۔ خلیق صاحب نے ان کو تسلی دی، ہم کبھی مل آیا کریں گے۔ خلیق صاحب بولے ڈیڈی وہ بہت دور دراز کا گاؤں ہے۔ وہاں ہوائی جہاز بھی نہیں جاتا، پہلے ائیر پورٹ سے بس لو، پھر گاڑی میں کوئی لینے آئے تب کہیں جا کے وہاں پہنچتے ہیں۔ آپ لوگ وہاں نہیں جا پائیں گے، سمرہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

آج مریا اور یوسف جا رہے تھے۔ حامد بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ یوسف سمرہ کی گود میں تھا۔ وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے پیار کرتا۔ دادی اس نے ابھی ایک دو لفظ ہی بولنے شروع کیے تھے مگر دادی بول لیتا تھا۔ ہاں ہاں بیٹا وہ پیار سے بولیں۔ سب ہی اسے پیار کر رہے تھے۔ ائیر پورٹ پہ یوسف چنی لگائے معصوم آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ مریا بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس کو نہیں پتا تھا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ حامد نے وعدہ تو کیا تھا کہ آتا جاتا رہے گا مگر کیا وہ وعدہ نبھائے گا۔ وہ ان سب کو نہیں دیکھ سکے گی جنہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے قبول کر لیا تھا کیونکہ وہ ان کے بیٹے کی پسند تھی۔ حامد کو اس نے اکثر اداس اور تنہا دیکھا تھا۔ اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے بھائیوں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار تھا۔ مریا کے ساتھ وہ بہت خوش رہتا، اُسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوتا اسی لیے اس نے اس سے شادی بھی کر لی تھی۔ ماں باپ کو بتانے کی ہمت بھی نہیں تھی مگر جب اسے مریا سے یہ پتا چلا کہ وہ باپ بننے والا ہے تو اس سے رہا نہیں گیا۔ اب یہ مریا کی قسمت کہ اُسے واپس جانا پڑ رہا ہے۔

مریا اور یوسف کو رخصت کر کے سب لوگ خلیق اور سمرہ کے گھر ہی واپس آ گئے۔ دونوں بیٹے اور بہوئیں ان کے بچے سب وہیں لان میں بیٹھے تھے۔ بچے جھولا جھول رہے تھے۔ ایک خوشحال گھرانہ بنے دونوں نے یہ خواب دیکھے تھے، اب کچھ ادھورا سا تھا۔ سب اپنے پیاروں سے جدا ہو کر کسی ملک میں اپنے بچوں کا مستقبل بنانے ہی جاتے ہیں۔ سب کچھ تھا لیکن یوسف جدا ہو چکا تھا۔ خلیق اور راشد انہیں تسلی دے رہے تھے۔ یوسف اپنی ماں کے ساتھ ہے۔ حامد بھی خیال رکھے گا اور ہم بھی جانتے ہیں۔ وہ کہاں سے ہے، سچ کہہ رہے ہو بیٹا، سمرہ نے کہا۔ میں تو ان ماؤں کے بارے میں سوچ رہی ہوں جن کو اپنے بچے جدا کر کے یہاں سے جانا پڑتا ہے اور بچے غیروں کے رحم و کرم پر رہ جاتے ہیں۔

باقی صفحہ ۱۰۳ پر ملاحظہ کیجیے

دَہاڑ: متا کی

حنیف سید
(آگرہ)

یوں تو ماں بیگم کا نام تھا، جہاں بیگم۔مگرلوگ کہتے تھے، ماں بیگم۔ماں بیگم، پہلے اُن کے بیٹے نادان نے کہا، پھر گھر میں پڑھنے والے بچوں نے، پھر تو ساری بستی کی ماں بیگم ہوگئیں، وہ۔

ماں بیگم اِن دنوں اپنے مائکے کے ایک چھوٹے سے مکان میں بچے پڑھا کر گزارہ کر رہی تھیں۔اُن کے شوہر کے مرجانے پر ان کے سسرالیوں نے اُن کو گھر سے نکال دیا تھا۔ماں بیگم ایک چیچا تک نہ لائیں تھیں؛ضد میں، اپنی سسرال سے۔سوائے اُس گلاب کے پودے کے۔جو اُن کے شوہر نے اپنے بیٹے نادان کی پیدائش کے روز نسلی گلاب کہہ کر لگایا تھا، صحن میں۔نادان بچپن سے ہی اپنے والد کی طرح دبلا، پتلا، مریل، نحیف، ضدّی، جھنّی تھا اور ہیکڑ بھی۔جس کام پر بھی ڈٹ جاتا، سر کر کے ہی مانتا، ہر صورت میں۔اِس لیے اُس کے والد اُس کو بھی نسلی گلاب کہنے لگے تھے۔

ماں بیگم کے ذریعے گلاب کا پودا لانے پر جب جیٹھ نے اڑچن لگائی اور ماں بیگم کمزور پڑیں تو کود پڑا نادان بھی۔پھر تو وہ جوہر دکھائے اُس نے کہ بس..!اپنے ہم جولیوں کو لے کر وہ ہنگامہ کیا کہ جیٹھ کو نانی یاد آ گئی اور ماں اپنے نسلی گلاب نادان کی مدد سے نسلی گلاب اُکھاڑ لائیں۔جس کی ساری بستی میں دھوم مچ گئی۔نادان کی اس کامیابی پر اُن کا من مورنی بن کر ایسا ناچا کہ اُن کی زندگی کے سارے ساون جھوم اُٹھے، ایک ساتھ۔یہ خوشی اُن کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔اب وہ بھی نادان کو نسلی گلاب سے مخاطب کرنے لگی تھیں۔اُن کو اِس گلاب کے پودے سے بھی بے حد لگاؤ تھا، نادان کی طرح۔وہ اُس کو گھوم پھر کر نہارتی رہتیں، جب تب۔دیکھ ریکھ بھی نادان کی طرح کرتیں، دل جان سے۔گلاب بھی کیا گلاب تھا، نسلی گلاب۔پھول تو زیادہ تر ایک ہی آتا، اُس میں۔اور جب آتا؛ تو یہ بڑا سا، کٹورے جیسا۔دیکھنے والے حیرت کرتے۔اس پر یہ بھی کہ پھول تب تک اپنی آب و تاب نہ کھوتا، جب تک دوسرا پھول اپنے شباب پر نہ آ جاتا۔اِسی لیے تو اتنا جھنجھٹ کیا تھا جیٹھ نے، گلاب کے پودے پر۔

ماں بیگم اِن دنوں کچھ زیادہ ہی دکھی تھیں، یوں تو ہمیشہ دکھی رہیں، وہ۔اُن کے شوہر بیمار پڑے، اور ساری کمائی علاج میں خرچ کے باوجود موت نگل گئی، اُن کو۔دکھی تو تب بھی تھیں، وہ۔پر اتنی نہیں۔جب اُن کا دوسرا بڑا بیٹا سترہ سال کا فرمان کسی سازش کے تحت مارا گیا تھا، دکھی تو تب بھی تھیں، وہ۔پر اتنی نہیں۔جائیداد کے لالچ میں جیٹھ نے جب گھر سے نکال دیا تھا اور وہ دانے دانے کو محتاج اپنے مائکے کے ایک کمرے میں رہ کر بچے پڑھا کر گزارہ کرنے لگی تھیں۔دکھی تو تب بھی تھیں، وہ۔پر اتنی نہیں۔اُن کے چودہ سالہ نادان کا من جب پڑھائی سے پوری طرح اچاٹ ہو گیا تھا۔دکھی تو تب بھی تھیں، وہ۔پر اتنی نہیں۔اُن کے سر پھرے نادان نے جوانی آنے سے پیشتر ہی عشق کا روگ لگا رکھا تھا۔دکھ تو اِس کا بھی تھا، اُنھیں۔پر اتنا نہیں۔دراصل وہ اب دکھی اس لیے زیادہ تھیں کہ نادان جس لڑکی کے عشق میں ڈوبا تھا، وہ غیر مذہب کی بارہ سالہ چندا تھی۔جس کی خوب صورتی کو لے کر پہلوان کے علاوہ اور بھی بے شمار دیوانے تھے، ایسی لڑکی سے محبت کرنے کے انجام سے وہ بہ خوبی واقف تھیں۔سونے پر سہاگا یہ کہ چندا بھی دل و جان سے چاہتی تھی، نادان کو۔اور اِن دونوں کے عشق کی خوش بو ساری بستی میں پھیل چکی تھی۔ایسے میں اُن کو نادان کی جان کا خطرہ تھا۔

چندا؛ چاند تھی، نہ جانے کتنوں کی راتوں کا تنہا، چاند۔نہ جانے کتنے بھونروں کا تنہا، پھول۔اُن گنت کناروں کی تنہا، لہر۔بلا کی حسین، بارہ برس کی۔بستی والوں کا کہنا تھا کہ چاند تو ایک ہے بستی میں، چندا۔چاند میں تو داغ ہے، پر چندا: بے داغ، صاف شفاف، پری جیسی۔

جب بولتی، وہ۔تو بے صدا ہو جاتے، پازیب کے گھنگرو۔چہچہانا بھول جاتے، مرغانِ چمن۔

جب زلفیں لہراتی، وہ۔تو گھٹائیں، گھمڑ گھمڑ گھمڑانے لگتیں، ٹوٹ کر بارشیں ہوتیں، تن من سیراب ہو جاتے، دیکھنے والوں کے۔

جب نظر اُٹھاتی، وہ۔تو برق غش کھا کر دھڑم، دھڑام، دھڑام، طور دھواں دھواں۔اور دیکھنے والوں کے دل پاش پاش۔ہاہا کار مچ جاتا، زمانے میں۔

جب ٹھمکتی چلتی، وہ۔تو بہاریں صفیں باندھ کر کھڑی ہو جاتیں، مسکرا کر۔ہوائیں چمن چھوڑ کر آ جاتیں، گھبرا کر۔دریا کی لہریں کناروں سے سر پٹکنے لگتیں، بل کھا کر۔کہکشاں، چاند اور ستارے غیر حاضری پر پچھتائے پچھتائے، اُداس رہتے۔

جیسے ہی صبح گھڑی کا الارم بجتا، چندا اسکول کا بستہ اُٹھا کر مکان سے باہر، اور اُس کی ممی پونم نگرانی کے لیے فوراً چھت پر۔دروازے پر اُس کی کئی سہیلیاں سروجا، مالتی، تارا، شمع، پدمنی، راما، لکشمی، حسینہ، لتا اور روپا وغیرہ کھڑی ہوتیں، جن کے ساتھ وہ اسکول کے لیے نکل لیتی، اور پونم اُس کی حفاظت میں سامنے کے دوراہے پر نظر جمائے دھڑکتے دل سے رام نام جپنے لگتی۔اسکول پہنچنے کے لیے سامنے تقریباً تین سو میٹر کے بعد دو راستے ہیں۔ایک سیدھا، اور دوسرا، دائیں سے ذرا مڑ کر۔یعنی کہ نادان کے دروازے کے سامنے سے ہوتا ہوا۔سیدھا یعنی سامنے والے راستے پر جب کبھی نادان نظر آتا، تو پونم اس کو فوراً کوسنے لگتی، من ہی من میں۔اور نظر نہ آنے پر چندا اپنی سہیلیوں کو چھوڑ کر جب دائیں والے راستے پر تنہا مڑ جاتی، تو پونم اپنی بیٹی کو بے تحاشہ گالیاں دینے سے نہ چوکتی، دل ہی دل میں۔

بیٹی کے اِس عمل کو چھڑانے کی ماؤ قسم ہی کھا رکھی تھی، ماں نے۔لیکن بیٹی کسی طور بھی ماننے کو تیار نہ تھی، اُس کا مرغ تھا، ایک ہی ٹانگ کا۔

چندابستی کے سب سے امیر لالہ لکھومل کی اکلوتی بیٹی تھی۔اُس کی خوب صورتی اور دولت کو لے کریوں تو نہ جانے کتنے اُس کی محبت میں کودے،یعنی کہ آگ کے دریا میں،دل تھام کر۔پرڈٹے رہے،تو دو ہی۔پہلوان اور نادان۔ عاشقی کو لے کراِن دونوں میں،انیس نہ پہلوان تھا،اور نہ ہی نادان۔

پہلوان،یعنی چندا کا پڑوسی،بائیس سالہ۔بیوی اور تین بچوں والا۔ اور دوسرا نادان،چودہ پندرہ کا۔اِن دونوں عاشقوں کے علاوہ اور بھی نئے نئے دھمکتے رہتے،آئے دن۔جان ہتھیلی پر لے کر،انجانے میں۔مگر حالات سے دوچار ہوتے ہی نکل لیتے،دُم دبا کر۔کچھ تو چندا کی بے اعتنائی کے سبب،اور کچھ پہلوان کے خوف سے۔رہی نادان کی بات،تو اُس کو کوئی شمار میں نہ لاتا۔

پہلوان اور نادان کو لے کر چندا کے ماتا پتا بے چین رہتے۔دراصل اُن دونوں کو نہ تو یہ پسند تھا،یعنی کہ پہلوان۔اور نہ وہ ہی،یعنی کہ نادان۔نادان تو اِس لیے بھی نہ پسند تھا،کہ وہ غیر مذہبی تھا۔مگر بیٹی اُسی کو چاہتی تھی،ٹوٹ کر،جی جان سے۔وہ اُس کو اپنے ذہن میں سپنوں کا دیوتا مان کر پوجا کرنے لگی تھی،عرصے سے۔اور نادان بھی اُس کو کوہ قاف کی پری مان کر سات سمندر پار سے لے آنے کی قسمیں کھائے ہوئے تھا۔جب بھی پونم اپنی بیٹی کی نگرانی میں چھت پر جاتی،تو وہ یا تو چندا کے دروازے پر ٹہلتا دکھائی دیتا،ٹہلتا ہونے پر چندا سامنے والے راستے سے سہیلیوں کے ہمراہ اُس کے آگے آگے ٹھمکتی چلی جاتی اسکول۔مسکرا مسکرا کر مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی۔وہ اکثر اپنے کارخانے کی بنی ہوئی نمکین دال موٹھ لے جا کر ایک خاص جگہ رکھ دیتی جس کو نادان اُٹھا لیتا،اور بدلے میں اپنے گھر سے لایا ہوا گلاب کا پھول ایک خاص جگہ رکھ دیتا،جس کو چندا بڑے پیار سے اُٹھا کر اپنے بالوں میں سجا لیتی۔سہیلیاں چھیڑتیں۔مگر اُس پر کوئی فرق نہ پڑتا۔پر خاص بات جو تھی،وہ یہ کہ نادان کبھی اُس کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرتا۔بس پیچھے پیچھے ہو لیتا،اُس کے۔اور جب کبھی وہ سامنے والے راستے پر دکھائی نہ دیتا تو وہ اپنی سہیلیوں کو چھوڑ کر،سیدھے ہاتھ کے راستے پر مڑ کر نادان کے مکان کے سامنے سے نکل کر مانو اپنے بھگوان کے درشن کرنا لازمی سمجھتی۔ماں بیگم دروازے پر کھڑی ہوتیں،جو اُس کو دیکھتے ہی لہاڑیاں سنانیں لگتیں۔مگر اُس پر کوئی فرق نہ پڑتا۔وہ جب تک نادان کو دیکھ نہیں لیتی،اس کا تن من سیراب نہ ہوتا۔کبھی کبھی اسکول چھوٹنے کے بعد بھی نادان لڑکیوں کے پیچھے پیچھے آتا دکھائی دیتا۔اور چندا اُس کو پلٹ پلٹ کر دیکھتی،گھر آجاتی۔پھر تو ماں خوب خوب لہاڑیاں سناتیں،مگر وہ کوئی جواب نہ دیتی۔پر مڑ مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چھوڑتی۔نادان بھی جب تب اُس کے مکان کے سامنے آجاتا۔خاص طور سے چھٹی کے دن۔چندا کو جیسے ہی بھنک لگتی،وہ کسی نہ کسی بہانے باہر جھانکنے پہنچ جاتی۔

نادان کے غیر مذہبی ہونے کو لے کر لالہ لکھومل کو اُس سے خدائی بیر تھا۔ایک بار اُنھوں نے اُس کو ڈانٹا۔جس پر اُس نے برابر سے لالہ لکھومل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:''ہمت ہو تو بیٹی کو روکو۔۔۔!''نادان کے تیور دیکھ کر پونم نے پتی کو سمجھایا:''اپنا ہی کھونٹا کمزور ہے،جی۔بیٹی کی خاموش محبت ہے۔ کسی پل بھی باغی ہو سکتی ہے،بیٹی۔گھر سے نکل گئی،یا جان سے گزر گئی،تو برباد ہو جائیں گے،ہم لوگ۔''لالہ لکھومل کو بھی اس سے اتفاق تھا،پوری طرح۔

پڑوسی پہلوان کو لے کر پتی پتنی،چندا کی عمر سے تین گنا اور دو بچے ہونے پر بھی کسی حد تک اِس لیے راضی تھے کہ بے پناہ دولت تھی پہلوان کے پاس،اور رسوخ بھی لاجواب۔پڑوسی ہونے کے ناتے لالہ لکھومل کے کارخانے کو سپوٹ بھی ملتا تھا۔پہلوان چاہتا بھی تھا چندا کو،بے انتہا۔اگر چندا کا ذرا بھی رجحان اُس کی طرف ہوتا تو پتی پتنی کو عار نہ تھی،لیکن بیٹی تو بجائے محبت کے نفرت کرتی تھی پہلوان سے،بے پناہ نفرت۔پھر یہ بھی سوچتے،کہ کیا پتا کہ کب اُوب جائے پہلوان،چندا سے۔بستی والوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ابھی تو کچی کلی ہے کچنار کی۔ذرا سا بھی رنگ چڑھنے دو،اُجاڑ ڈالے گا،پہلوان۔

ایک بار ہولی کے موقع پر شراب چڑھائے،گھس بھی آیا تھا لالہ لکھومل کے یہاں،ایک ہاتھ میں رنگ اور دوسرے میں مٹھائی کا ڈبا لیے۔بیٹی گھبرا کر خود کو بچانے کے لیے اماں اماں کہہ کر پہنچ گئی تھی،ماں کی آغوش میں۔بیٹی کی دِفاع میں دھان پان سے لالہ لکھومل نے بھی اپنے بتیسوں دانت نکال کر بیٹی کے قریب پہنچ کر کہا تھا:''بیٹی۔۔۔!چاچا ہیں چاچا۔تیرے اپنے چاچا۔''اتنا سن کر کچھ شرمندہ ہو کر نکل گیا تھا،گھر سے۔زمین پر رنگ اور مٹھائی کا ڈبا پٹخ کر،لحیم شحیم،بدمست،ہٹا کٹا۔تیز طرّار بھیڑیے جیسا،گینڈا،پہلوان۔لالہ لکھومل سے کہتا ہوا:''چاچا۔۔۔! بیٹی کا بیاہ کہیں اور نہ رچا دینا،دھوکے سے۔ساری بستی پھونک ڈالوں گا،ماں کسم۔۔۔!''اُسی دن سے پتی پتنی نے بستی چھوڑنے کا پلان بنا لیا تھا،چپ چاپ۔

جب پونم اپنے پتی کے کہنے پر ہر وقت اپنے مکان کے سامنے نادان کے کھڑے رہنے کی شکایت لے کر اُس کی ماں کے پاس پہنچی۔ماں بیگم نے پہلے تو ہاتھوں ہاتھ لیا پونم کو:''تمھاری بیٹی بڑی بدمست اور آوارہ ہو رہی ہے،پوری طرح۔ساری بستی کے لڑکوں کو نچائے پھرتی ہے،لونڈوں کی گیند،ابھی سے۔جوانی آنے پر نہ جانے کیا گل کھلائے گی،ہرجائی کہیں کی۔سمجھا دو اُس کو کہ میرے مکان کے سامنے سے ہو کر نہ گزرے۔سیدھے راستے سے جایا کرے اسکول،اُس طرف سے۔اِس طرف کی سنجیدہ،تبسم،شاہانہ،عبیدہ وغیرہ سب کی سب چلی جاتی ہیں لیکن تمھاری بیٹی جب تک میرے بیٹے سے آنکھیں چار نہیں کر لیتی،ٹلتی نہیں۔پیچھے پڑی گئی ہے،میرے نادان کے،حرّافہ کہیں کی۔حالاں کہ میں خود بھی کئی بار ڈانٹ پھٹکار چکی ہوں،ہرجائی کو۔پر چھنال مانتی ہی نہیں۔تم تو جانتی ہو۔پہلوان کا علاقے میں لق لقہ ہے،چاروں طرف۔پانچ بھائی ہیں،اُس کے۔اور چھٹا وہ خود۔بھرم اتنا ہے کہ کوئی آنکھ ملانے کی ہمت نہیں کرتا،اُس سے۔بس جوا شراب ہوتا رہتا،رات دن۔اُس کے مکان میں۔علاقے کے ایک سے ایک نامی بدمعاش آتے ہیں،اُس کے یہاں۔کبھی کبھار ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ پر گھنگروؤں کی جھنکار بھی گونجتی ہے۔تم کیا سنتی نہیں۔۔۔؟جوئے کے کمیشن سے ہستی بنا لی ہے،اُس نے۔دولت کی ریل پیل سے عیش کر رہا ہے،وہ۔بستی کی لڑکیوں پر بھی نظر رہتی ہے،اُس کی۔وہ تو

نازک کلیوں کا شیدائی ہے۔ جب بھی کسی کلی پر رنگ چڑھتا ہے، مسل ڈالتا ہے، دیکھتے دیکھتے۔ کبھی کبھی کوئی نہ کوئی لڑکی اچانک غائب بھی ہو جاتی ہے۔ لوگ دو ایک دن آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے قصہ تمام کر دیتے ہیں۔ کسی کی کیا ہمت جو کوئی اُف کرے، اُس کے سامنے۔ دو ایک جیالوں نے مداخلت کی بھی۔ آج تک پتا نہیں، ان لوگوں کا۔ کئی گھر تو حالات کے تحت اپنی رسوائی سے پیشتر ہی عزت بچا کر نکل لیے، راتوں رات۔ بھلا چاہتی ہو تو تم بھی بیٹی کو لے کر چپ چاپ نکل لو کہیں، فوراً، ورنہ پچھتاؤ گی۔ سمجھ لینا، پتھر کی لکیر ہے میری بات۔ چندا کے اسکول جانے آنے سے دس پانچ منٹ پیشتر ہی باہر کرسی ڈال کر بیٹھ کر ڈورے ڈالتا ہے، وہ۔ یہ کہو تمھاری بیٹی گھاس نہیں ڈالتی، اُس کو۔ تیور چڑھائے رہتی ہے۔ ورنہ اب تک پانی پھیر دیتا، تمھاری عزت پر۔ آج نہیں تو کل سہی۔ تیار رہو، منہ پر کالکھ پتوانے کے لیے۔ سو بات کی ایک بات۔ تمھاری دولت اور اکلوتی یعنی کہ دونوں پر نظر ہے، اُس کی۔ بہت پہلے سے۔ حاصل کر کے ہی رہے گا، وہ۔ ہر حالت میں، سمجھیں۔ پہلوان نے مجھے بھی سندیسہ بھیجا ہے۔ کہا ہے: "روک لو اپنے بیٹے کو۔۔۔! ہمارے بیچ آیا تو کاٹ ڈالوں گا۔" تم جانتی ہو، میرا ایک ہی بچہ ہے، اکلوتا۔ باپ مر چکا ہے۔ کوئی دوسرا سہارا نہیں۔ کچھ ہو گیا تو۔۔۔! میں تو برباد ہو جاؤں گی۔ اِس کے علاوہ تم یہ بھی جانتی ہو ہم دونوں کے مذاہب جدا ہیں، حالات اچھے نہیں۔ سارے ہندستان میں آگ لگی ہے۔ لوگ بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ کوئی انہونی ہو گئی کسی وقت، تو وبال مچ جائے گا، آگ تک لگا دیتے ہیں لوگ، مکانوں میں۔ میرا بچہ ہاتھ سے چلا گیا تو میں کیا کروں گی۔۔۔؟ میں تو کہیں کی نہ رہوں گی، سمجھیں۔۔۔؟"

ماں بیگم کی باتوں کو لے کر پونم، پہلوان کے بارے میں سوچتی: وہ کم بخت ہر حالت میں میری بیٹی اور دولت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔" جیسا پونم کو لگتا تھا ہوا بھی ویسا ہی، اگلے دن دھڑام سے دروازہ کھلا اور سہیلیوں نے ہانپتے کانپتے پونم کو بتایا: "چندا کو پہلوان اٹھا لے گیا۔" اور جب پونم چھت پر چڑھی تو بازار کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کچھ لوگ لالہ لکھومل کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ کوئی لب ہلاتا۔ لب ہلانے کی جرات تو پونم میں بھی نہ تھی۔ وہ دوڑی دوڑی شوہر کے پاس پہنچی۔ شوہر نے چپ چاپ نادان کے مکان پر جانے کا اشارہ کیا اور پونم فوراً نادان کے گھر جا پہنچی۔ ماں بیگم ڈنڈا لیے دروازے پر کھڑی تھیں۔ پونم کو دیکھتے ہی پہلے تو اُنھوں نے اپنا چہرہ بگاڑ کر بنا اسٹاپ غلیظ سے غلیظ گالیوں سے پونم کا خیر مقدم کیا۔ سانس لینے پر جیسے ہی پونم نے بتایا کہ چندا کو پہلوان اُٹھا لے گیا، ماں بیگم نے پلٹ کر اپنے اکلوتے کو للکارا: "جانسلی گلاب۔۔۔! جلدی جا۔۔۔! داغ لگ گیا بیٹی میں، تو دودھ نہیں بخشوں گی، تیرا۔"

ماں کی دہاڑ پر معصوم نادان چیتے کی سی پھرتی اور عقاب کی سی چستی کے ساتھ پہلوان کی جانب یوں لپکا جیسے بہادر سُورما اپنے دشمن کی جانب عزم و استقلال سے بڑھا کرتے ہیں۔

Speaks about you

A(+) : Good leadership.

A(-) : Hardworking.

B(+) : Can Sacrifice for others and very ambitious, tolerance.

B(-) : Non flexible, Selfish & Sadistic.

O(+) : Born to help.

O(-) : Narrow minded.

AB(+) : Very difficult to understand.

AB(-) : Sharp & Intelligent.In

What is ur blood group ?

Try....It....share Fantastic information

BLOOD GROUP COMPATIBILITY

What's Your Type and how common is it

O+	1 in 3	37.4%
(Most common)		
A+	1 in 3	35.7%
B+	1 in 12	8.5%
AB+	1 in 29	3.4%
O-	1 in 15	6.6%
A-	1 in 16	6.3%
B-	1 in 67	1.5%
AB-	1 in 167	.6%

(Rarest)

Compatible Blood Types

O- can receive O-

O+ can receive O+,O-

A- can receive A-,O-

A+ can receive A+, A-, O+,O-

B- can receive B-,O-

B+ can receive B+,B-,O+,O-

AB- can receive AB-,B-,A-,O-

AB+ can receive AB+,AB-,B+,B-,A+,A-,O+,O-

یاترا

ڈاکٹر صوفیہ شیریں
(کولکتہ)

قومی شاہراہ نمبر 6 جسے عام فہم زبان میں Bombay Road بھی کہتے ہیں، پر روزانہ نہ جانے کتنی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور نہ جانے کتنی موت کی آغوش میں سوتی ہیں۔ آئے دن اس شاہراہ پر غفلت کے ماروں کی دبی کچلی لاش پڑی ہوتی ہے۔ آخر کو شاہ راہ ہے، شاہی ہونے کی قیمت تو لے گی ہی، شاہ راہ ہے اس لئے بنا دئے کچھ لیتی بھی نہیں۔ کلکتہ سے بمبئی تک لمبی یہ سڑک کے دونوں کنارے پر بھوک مٹانے کے کئی سادھن دستیاب ہیں۔ بھوک! جی ہاں بھوک، چاہے ناف کے اوپر کی ہو یا نیچے کی، محبت کی ہو یا عزت کی، دولت کی ہو یا شہرت کی، انسان کو چین سے جینے کہاں دیتی ہے۔ زندگی کا پہیہ اسی بھوک کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ خان پارکنگ میں بھی اسی بھوک نے ایک دنیا بسا رکھی ہے۔ اسی بھوک نے چھ ہزار ماہانہ پر نصیر کو یہاں بارہ گھنٹے کی چوکیداری پر مامور رکھا ہے۔

''ارے او نصرو! کہاں مر گیا؟ کس کی دلالی کرنے چلا گیا؟ ابے گیٹ کھول۔''

بارہ پہیوں والی لاری کے ڈرائیور نے چلاّتے ہوئے نصیر کو آواز لگائی۔ ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی سے سر نکال کر جھانکا۔ اپنی سرخ انگارہ جیسی آنکھوں کو گھما کر دور تک دیکھا۔ نصیر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ رات بھر جاگ کر گاڑی چلاتے ہوئے اس کا دماغ ویسے ہی تھکان اور نیند سے بھنّایا ہوا تھا، اس پر مین گیٹ پر نصیر کی غیر حاضری نے اس کی جھنجھلاہٹ میں مزید اضافہ کر دیا۔ وہ کود کر لاری سے اترا اور چھوٹا دروازہ کھول کر پارکنگ ایریا میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ اس کے منھ سے ایک اور گالی نکلتی اس کی نظر نصیر پر پڑ گئی جو پاخانے سے ازار بند باندھتے ہوئے نکل کر اس کی طرف تیزی سے چلا آ رہا تھا۔

''آ رہا ہوں بھئی، کاہے مرے جا رہے ہو، نوکری نہ ہوئی آپھت ہو گئی۔ انسان جرا آرام سے ہلکا بھی نہیں ہو سکتا۔''

''ہلکا ہونے کے لئے یہی ٹیم ملا ہے، چل جلدی کھول، کتنی دیر سے گاڑی باہر کھڑا کیا ہوا ہوں۔''

نصیر نے بڑا دروازہ کھول کر کوپن کاٹا اور رجسٹر میں لاری کا نمبر اور داخلے کا وقت درج کر دیا۔ کل رات سے اب تک ساٹھ گاڑیاں باہر گئیں تھیں اور بیس گاڑیاں آئیں تھیں۔ زیادہ تر گاڑیاں رات کو نکل جاتیں اور صبح کو آ کر پارک ہو جاتیں۔ خان پارکنگ میں یہی روز کا معمول ہے جھارکھنڈ کے شمالی حصے میں سہاراسٹی کے مخالف جانب ڈلما پہاڑ کے دامن میں خان پارکنگ دو ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے جہاں مختلف جگہوں سے آنے والی پھلوں، سبزیوں اور مچھلیوں سے لدی کبھی خالی گاڑی بھی چند گھنٹوں کے لئے یہاں آ کر رکتی ہیں۔ ڈرائیور اور اسٹاف ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں، نہاتے دھوتے، کھانا پکاتے' کھاتے اور آرام کرتے ہیں۔ پارکنگ کے پچھلے حصے میں ان کے لئے بڑا سا حمام خانہ بھی ہے جہاں بیک وقت بیسوں لوگ غسل کر سکتے ہیں، حمام خانے کے جنوبی حصے میں پارکنگ کے آخری سرے پر سرچنگ لائٹس لگی ہیں۔ فصیلوں کے باہری حصے میں داخلی دروازے کے داہنی جانب آدی باسیوں نے چائے ناشتہ کی کئی دوکانیں لگا رکھی ہیں جب کہ بائیں جانب قطار سے میکینک شاپس ہیں۔ پارکنگ کے اندر مین گیٹ سے ملحق ایک طرف منیجر کا آفس اور دوسری طرف چوکیداروں کی آرام گاہ ہے۔ پارکنگ ایریا میں ہمہ وقت دھول مٹی اڑتی رہتی ہے یا گالی گلوچ کی بوچھار ہوتی رہتی ہے۔ ایسے ماحول میں گذشتہ نو سالوں سے نصیر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہے۔ اس کی طرح بھانو اور رام کھلاون بھی چوکیداری میں لگے ہوئے ہیں۔ آٹھ بج چکے ہیں پر دوسری شفٹ کا چوکیدار بھانو ابھی تک نہیں آیا۔ ساڑھے آٹھ کے قریب بھانو آیا تو نصیر اس پر چڑھ دوڑا۔

''اتنا دیری کیسے ہوا؟ بارہ گھنٹے ڈیوٹی کر کے اب تیرا بھی ڈیوٹی کرنا پڑے گا۔''

''جرا سی دیر کیا ہو گئی ہم سے، تو بلبلانے لگا۔ ادھر ہنومان جی کی ہتیا ہو گئی ہے اور تُو ہے کہ بس گھر جانے کے لئے مرا جا رہا ہے۔''

بھانو گارڈ یونیفارم کی آستین اٹھاتے ہوئے پھنکارا۔

''کس کا ہنومان جی؟ کون سا ہنومان جی؟ بوجھوول مت بوجھا، ہم کو کھل کے بتا کہ کیا ہوا۔''

پورا بات سننے کا تو تیرے پاس وکھت ہی نہیں ہے۔ بس ڈیوٹی ختم ہوا اور تو گھر بھاگا۔''

''ارے! نہیں، نہیں۔ بتانا! کیا ہوا؟''

نصیر کی آنکھوں میں تجسس ابھر آیا۔

''وہی ڈلما پہاڑ سے ہنومان جی کھیلتے کھیلتے جرا ادھر آ گئے۔ ایک ٹرک والا ان کو کچل کے نکل گیا۔ سالا۔۔۔۔ روج کا ہو گیا ہے۔ کبھی انسان تو کبھی جانور اور آج تو حد ہو گیا ہنومان جی کو مار دیا۔''

''اوہ! اچھا۔ اچھا۔۔۔۔ سمجھا پہاڑ پر سے ہائی وے پر کوئی بڑا والا بندر آ گیا ہو گا۔''

نصیر کا سارا تجسس جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں بولا۔

''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ نہیں چوہا نہیں' بندر۔''

نہیں نصرو' بندر مت بول ان کو۔ پہاڑ پر بسنے والے سب بندر ہم لوگ کے ہنومان جی ہیں۔ ہنومان جی رام جی کے بھکت تھے اور ہم ان کے بھکت ہیں۔

''ہنومان جی کی پوری سینا' بستی میں گھس کر جو چاہے کھا لے، جو چاہے لے لے، مجال ہے کوئی برا مان لے، شاکشات بھگوان گھر آئیں تو کاہے کوئی برا مانے، لیکن اب ہم برا مان گئے ہیں۔ ہنومان جی کا مرت شریر لے کر سب آدی باسی سڑک کنارے بیٹھ گئے ہیں۔ ہر آنے جانے والی گاڑی کو سو سو روپے دینا ہو گا اور آس پاس کے ہر دوکان دار کو بھی، تا کہ پورے ویدھی ودھان کے ساتھ ان کا

انتم سنسکار ہو سکے۔''

''کیا اول جلول بک رہا ہے بے؟'' ہائے وے کے کنارے انتم سنسکار کیسے ہوگا؟

نصیر نے اپنے جاننے میں بڑے پتے کی بات کہی۔

''انتم سنسکار اگنی دان دے کر نہ ہو سکے گا تو وہیں دپھنا دیں گے، ہنومان جی کا سادھی بنا دیں گے۔''

''ہاں ای ٹھیک رہے گا۔ اچھا ہم نکلتا ہے گھر جلدی پہنچنا ہے۔ تُو تو جانتا ہے جس دن نائٹ ڈیوٹی ہوتا ہے اس دن جورو بھتائے رہتی ہے۔''

نصیر سائیکل چلاتے ہوئے سہارا سٹی کے بغل والے راستے سے ہو کر آزاد بستی چلا گیا، جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی بسی ہوئی ہے۔ راستے میں کمبل والے بابا کو اٹھنی دینا نہ بھولا۔ کئی سالوں پہلے ایک مجذوب سہارا سٹی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں نہ جانے کہاں سے آ کر گھومنے لگا تھا۔ کوئی اسے روٹی دے دیتا تو کوئی پیسے۔ کسی نے ایک سرد رات اسے کمبل دے دیا جسے وہ گرمی میں بھی اوڑھے رہتا تب سے وہ کمبل والے بابا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کہتے ہیں جس کی طرف بھی وہ نظر بھر کر دیکھ لے اس کی قسمت ہی بدل جاتی ہے۔ نصیر بھی اپنی قسمت بدل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

دوسرے دن بھانو کام پر نہیں آیا۔ نصیر کو اس کے حصے کی ڈیوٹی بھی کرنی پڑی۔ جب گاڑیوں کی آمد و رفت کم ہو جاتی تو نصیر دروازے سے ملحق چھوٹے سے کیبن میں کچھ دیر آرام کر لیتا۔ مسلسل کئی گھنٹوں کی ڈیوٹی سے اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ مزاج میں تھکان اور چڑچڑاپن لئے وہ سوچ ہی رہا تھا۔

''آج منیجر سے بات کر کے ایسی نوکری کو لات ماردوں گا۔ چھ ہزار روپے میں ہوتا کیا ہے؟ وہ تو ادھر ادھر سے کچھ بنا لیتا ہوں ورنہ اتنے پیسے میں کیا سنسار چلے اور کیا بچے پڑھیں؟''

کہ ٹھیک آٹھ بجے بھانو ہنستا گنگناتا چلا آیا۔

''تیری ماں کی۔۔۔ کس کے کوٹھے میں گھس کے بیٹھا تھا کہ تھو بڑا چمک رہا ہے۔''

''ہی ہی ہی۔۔۔ کچھ نہیں نصرو۔۔۔ وہ بستی میں میلہ لگا ہے نا۔ تینوں وکھت اچھا اچھا کھانا، حلوہ پوری، بھاجی، لڈو، پکوان یہ پکوان، کھا کھا کے شریر سے آنتا تک کھُس ہو گئی ہے۔ پورے جنم میں اتنا اچھا کھانا نہیں کھایا جتنا دو دن میں کھا لیا''

بھانو پیٹ پر ہاتھ اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے گیا۔

''ہوں ں ں۔۔۔ لگتا ہے کسی بڑا آدمی کا بیاہ تھا۔''

نصیر نے منہ میں آئے ہوئے پانی کو گھونٹتے ہوئے پوچھا۔

''ابے نئیں۔۔۔ اس کل یوگ میں کون دانی پوری بستی کو چار وکھت مجے دار پکوان کھلائے گا؟ ای سب تو ہنومان جی کی کرپا ہے۔ بھگوان ہی ایسا چمتکار کر سکتے ہیں۔''

''بھگوان؟ چمتکار؟ کا مطلب''

''ارے بکلول! وہ جو ہنومان جی کا سادھی بنانے کے لئے بستی کا سارا آدمی باسی دھرنے پر بیٹھا تھا نا! بھگوان کی کرپا سے اتنا دھن اکٹھا ہو گیا کہ ان کی سادھی بھی بن گئی اور پرساد میں پوری بستی نے دو دن کا بھوجن بھی کر لیا۔ سچ بتا رہا ہوں نصرو! تیج تیوہار میں بھی اتنا مجا نہیں آیا جتنا ہنومان جی کی انتم یاترا کو سپھل بنا کے آیا۔''

نصیر سمجھنے سے قاصر تھا کہ بھانو کی آنکھیں شردھا سے چمک رہی ہیں یا مزہ سے۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ اچانک بھانو نے کام پر آنا بند کر دیا۔ اس کی جگہ ایک نیا چوکیدار راجو آ گیا۔ اتفاق سے وہ بھانو کی آدی باسی بستی سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ ایک دن نصیر نے اس سے بھانو کے متعلق پوچھ ہی لیا۔

''ارے کچھ نہ پوچھو بھیا۔ بھانو کا تو پانچوں انگلی گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ اس نے بستی کے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر ایک کمیٹی بنائی اور چندہ اکٹھا کر کے ہنومان جی کا مندر بنا لیا ہے۔ ہر آنے جانے والی گاڑی مندر میں پیسے ضرور پھینکتی ہے تا کہ اس کی یاترا سپھل ہو۔''

''ہاہاہا۔۔۔۔۔ بھانو کی گاڑی تو چل پڑی۔ چلو بھئی اس بات پہ ایک ایک کپ گرما گرم چائے ہو جائے۔''

''نئیں بھیا ہم کو دیری ہو رہا ہے۔ اتنی سردی میں نائٹ ڈیوٹی کر کے تو ہمارا جان ہی نکل گیا۔''

راجو یونیفارم بدلتے ہوئے بولا۔

''۔ابھی نئے ہونا! دھیرے دھیرے تم کو عادت پڑ جائے گا۔ چلو چائے پیتے جاؤ تا کہ تھوڑا گرمی آ جائے۔''

دونوں ٹہلتے ہوئے دوکان پر پہنچے جہاں پہلے سے ہی کافی بھیڑ تھی۔ لوگ کسی موضوع پر آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ نصیر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''کا ہوا؟ اتنا بھیڑ کا ہے ہے؟''

چائے والا جھٹ چولہے سے چائے کی کیتلی اتار کر پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا:

''تم کو نئیں معلوم نصرو بھیا! وہ کمبل والے بابا تھے نا! کل رات سردی سے ٹھٹھر کر مر گئے۔''

''اچھا!۔۔۔۔ ایسا کیا؟''

نصیر نے ہاتھ بڑھا کر چائے کی پیالی اٹھائی، پل بھر کو اس کی آنکھوں میں بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی، وہ ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بھیا؟'' راجو نے پوچھا۔

''مجار کے لئے جمین دیکھ رہا ہوں۔''

''اچھی کتاب''

ایک اچھی کتاب، سو برے دوستوں سے بہتر ہے مگر ایک اچھا دوست، ایک لائبریری سے بڑھ کر ہے۔

ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام

''گوشہ نشینی''

نوید سروش

(میرپورخاص)

اک لفظ میرے دل پہ وہ تحریر کر گیا
مجھ کو سراپا صورتِ تصویر کر گیا

گزرا مرے قریب سے اک شخص اس طرح
میری شبِ حیات کو تنویر کر گیا

گوشہ نشینی اب کسی نعمت سے کم نہیں
فکرِ رسا کو وہ مری زنجیر کر گیا

سب سے عزیز دوست سمجھتا تھا میں جسے
کل شب مرے خلاف وہ تقریر کر گیا

وہ کون تھا جو تاج محل اپنے پیار کا
مرے دل و دماغ میں تعمیر کر گیا

جس وقت فیصلے کی گھڑی آئی سروش
آیا نہیں وہ آنے میں تاخیر کر گیا

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

تیری محفل میں جو کچھ لمحے گزار آتے ہیں
واپسی پر وہ بڑے باغ و بہار آتے ہیں

تیری باتیں، ترے اندازِ سخن، تیری ہنسی
زندگانی کے کئی لمحے سنوار آتے ہیں

جب تجھے چاہا تو پھر کوئی تکلف کیسا؟
دل کو ہم اپنی خوشی سے بھی تو ہار آتے ہیں

چار دن کی ہے جو یہ زیست، گزاری ہنس کر
سُوئے رب ہو کے بڑے شکر گزار آتے ہیں

سارا دن ساتھ ترے گزرے ہوئے سب لمحے
نیند کی وادی میں بھی کیف اتار آتے ہیں

سب گزر جائیں گے اس خانۂ ہستی سے ریاضؔ
ہم بہرطور یہ لمحے بھی گزار آتے ہیں

○

خالد رامے

(لاہور)

اُسے بھولے تو یاد آیا مآلِ زندگی کیا ہے
جہاں خورشید روشن تھے وہاں یہ تیرگی کیا ہے

نفس کی آمد و شُد میں تمہارے نام کے سجدے
تمہیں کیسے خبر ہو، کیا وفا ہے، بندگی کیا ہے

کسی کی یاد سے دائم چراغاں شیشۂ دل میں
اماوسِ کی شب ہجراں اور اس کی چاندنی کیا ہے

یہ مکتب ہے محبت کا، سبھی مفتون و سودائی
جہاں میں اس سے آگے اور حرفِ آگہی کیا ہے

فقط اغراض نے باہم کیا، روحوں کو جسموں کو
یہ چاہت کیا، وصال و ہجر کیا ہے، دوستی کیا ہے

سیاست، زرگری، دربار اور سرداریٔ محفل
جو ہو دستار بے وقعت تو رسم عاشقی کیا ہے

فریبِ آرزو میں کٹ گئی عمر رواں خالد
وگرنہ شعر میرے کیا ہے اور یہ شاعری کیا ہے

○

تصور اقبال

(اٹک)

گھر سے نکلا ہے پھر وہ کڑی دھوپ میں
کوئی بیٹھا نہیں دو گھڑی دھوپ میں

اس طرح بھی ہُوا ہے کبھی دوستو
لگ گئی ہو اچانک جھڑی دھوپ میں

مجھ پہ سایہ کیا ماں نے دیوار سا
خود بڑی دیر تک وہ کھڑی دھوپ میں

پھر وہ ڈھونڈے گا کیسے پتنگ آخرش
ڈور جس کی کسی سے اڑی دھوپ میں

اس کو ملتا ہے کیا محنتوں کا صلہ
ہل چلاتا ہے جو اس کڑی دھوپ میں

اس کو سایہ میسر نہیں ہے ابھی
آنکھ جس سے تصوؔر لڑی دھوپ میں

ہو تصوؔر شجر ہی گھنا راہ میں
کام آتی نہیں اک چھڑی دھوپ میں

نسیم شیخ

(اسلام آباد)

یہ جو میں لن ترانی کر رہا ہوں
غموں کی ترجمانی کر رہا ہوں

تمہارے بعد آ کر دیکھ تو لو
میں کس پر حکمرانی کر رہا ہوں

لگا کر ہجر کو سینے سے اپنے
حقیقت کو کہانی کر رہا ہوں

بچھا کر آئنے دہلیزِ دل پر
ضعیفی کو جوانی کر رہا ہوں

غموں کی آنچ کو تھوڑا بڑھا کر
میں خود کو پانی پانی کر رہا ہوں

ہے سجدے میں مری گوشہ نشینی
میں اس کی نگہبانی کر رہا ہوں

دبا کر سسکیاں آنسو بہا کر
سخن کی باغبانی کر رہا ہوں

ہوا قرطاس پر کیوں شور برپا
میں کچھ تو خاص یعنی کر رہا ہوں

لگا کر دائرے اطراف اپنے
میں کارِ آسمانی کر رہا ہوں

ملی ہے جب سے یہ موجِ نسیم
میں رقصِ جاودانی کر رہا ہوں

نادیہ گیلانی

(ملتان)

اے دوست اب سہاروں کی عادت نہیں رہی
تیری تو کیا کسی کی ضرورت نہیں رہی

اب کے ہماری جنگ ہے خود اپنے آپ سے
یعنی کہ جیت ہار کی وقعت نہیں رہی

اک بات پوچھنی ہے خدا سے بروزِ حشر
کیا آپ کو بھی ہم سے محبت نہیں رہی؟

آسان تو نہیں ہے نا عورت پہ شاعری
عورت بھی وہ جو ٹوٹ کے عورت نہیں رہی

عادت اکیلے پن کی جو پہلے عذاب تھی
اب لطف بن گئی ہے اذیت نہیں رہی

حمیرا راحت
(یو۔ایس۔اے)

اسے بھولی ہوئی کوئی کہانی مار ڈالے گی
تجھے اے دل تری یہ خوش گمانی مار ڈالے گی

بہت ہی سخت جاں ہیں ہم مگر لگتا ہے کچھ ایسا
عنایت غم کی، دکھ کی مہربانی مار ڈالے گی

تم اپنے خواب اور جذبے سمیٹو اور بچھڑ جاؤ
ہمیں تو اپنے دل کی رائیگانی مار ڈالے گی

کبھی مرنے نہیں دیں گے بہت نامہرباں لمحے
کبھی تنہائی اور اک شب سہانی مار ڈالے گی

حیاتِ نو کبھی بن جائے گا اک آخری لمحہ
کبھی ایسا بھی ہو گا زندگانی مار ڈالے گی

○

وشال کھلر
(لدھیانہ)

اس کا ہنسنا گلاب ہو جانا
اس کا کھلنا کتاب ہو جانا

آپ اپنا جواب ہو جانا
فلسفے کا شراب ہو جانا

بہتا دریا وہ زندگی کی بقا
اس کہ تھمنا عذاب ہو جانا

اس کی صحبت تمیز اور تہذیب
اس سے دوری خراب ہو جانا

اس کی قربت گلوں کی کھیتی ہے
اس کا ہونا سراب ہو جانا

دھوپ، بارش، ہوا، گھٹا اس کی
موسمو! آب آب ہو جانا

بند پلکوں میں کھل گئیں آنکھیں
اس کا نیندوں میں خواب ہو جانا

اس کی چاہت کھلے کنول جیسی
اس کی حسرت شباب ہو جانا

کتنا مشکل ہے عقل کے رہتے
دل کا خانہ خراب ہو جانا

یہ ہنر کس قدر انوکھا ہے
کوششیں کامیاب ہو جانا

○

اصغر شمیم
(کولکتہ)

کیوں یہ لگتا ہے کھو گیا ہوں میں
خود کو آواز دے رہا ہوں میں

اتنی ہمت نہیں کہ لڑ پاؤں
اس لئے خود سے بھاگتا ہوں میں

لوگ آتے ہیں لوگ جاتے ہیں
ایک جانب کہیں کھڑا ہوں میں

فاتحہ پڑھ رہا ہوں خود اپنا
خواب کیسا یہ دیکھتا ہوں میں

کوئی احساس بھی نہیں باقی
اپنے اندر ہی مر گیا ہوں میں

ایک آنسو نہیں گرا اصغر
جب کے اندر سے رو رہا ہوں میں

○

کنول ملک

(اسلام آباد)

کردو بس اک خواہش پوری، تحفہ دو! عید پہ کاسنی رنگ کی چوڑی تحفہ دو!
آ کر میرے کان میں کہہ دو آپ کا ہوں کردو میری مانگ سندوری، تحفہ دو!
لاک ڈاؤن میں حال بُرا ہے مان لیا لیکن عید پہ کیا مجبوری، تحفہ دو!
تحفے میں اک پھول گلاب کا کافی ہے پیار میں لازم اور ضروری، تحفہ دو!
ناز اٹھاؤ ناز اٹھانے لائق ہوں پائل، مہندی، کنگن چوڑی، تحفہ دو!

○

محبوب اصغر

(حیدرآباد، دکن)

سمندروں میں تموج کے آنے جانے سے لگے نہ ہاتھ صدف میرے اک زمانے سے
اتر گئی ہے طراوت کہیں میرے اندر مہیب رات میں جگنو کے مسکرانے سے
نہ جانے ختم کہاں ہوگا اب یہ سناٹا جو آبسا ہے محافل میں ان کے جانے سے
وفا شناس نہیں اب رہے زمانے میں کہ اٹھ گئی ہے وفا بھی تو اب زمانے سے
حسین چادریں تانی ہیں آبشاروں نے اتر رہے ہیں فرشتے فلک کے شانے سے
کتابِ الفت ونکہت کا ہر ورق گیلا ہوا ہے شبنمی لفظوں کے جھلملانے سے
سرشت آپ کی مانا کہ التہابی ہے دیا جلاؤ کہ بہتر ہے دل جلانے سے
تیرے نشانۂ مستی سے کون چوکا ہے بس ایک چوک گیا میں تیرے نشانے سے
یہ جسم وجاں کی اذیت حماقتوں کا سبب نہ حزن وغم سے ٹلے گا نہ مسکرانے سے
وہ دور جا کے بھی اتنا قریب تھا اصغر وجود اس کا بدن میں میرے سمانے سے

○

ذکی طارق بارہ بنکوی

(بھارت)

قرار وقول ابھی اس سے ہارتے رہنا تم اس میں پیار کا جذبہ ابھارتے رہنا
وہ خواب جن کی نہ تعبیر پوری ہو پائے تم اپنی آنکھوں میں ان کو اتارتے رہنا
نہ جانے کس گھڑی ہو جائے ملتفت وہ کریم تم التجاؤں کا دامن پسارتے رہنا
تم اپنے چہرۂ زیبا کی اک جھلک دے کر ہمارا حسنِ تخیل سنوارتے رہنا
بھلایا جا نہ سکا جانا وہ خفا ہوکر اور اپنا دیر تک اس کو پکارتے رہنا
ترے شباب پہ نظریں اٹھیں بہ حدِ ادب یہ کیا ہے جو کے نہیں من کو مارتے رہنا
اسی پہ ایک دن آ کر آ گے گا سورج بھی یونہی ہتھیلی پہ جگنو اتارتے رہنا
یہ ریت پر نہیں جم پائیں گے مگر پھر بھی نشان قدموں کے اپنے ابارتے رہنا

○

فرح کامران

(نیویارک)

زخم بھریئے اسے رفو کیجئے — اب کوئی اور گفتگو کیجئے
ذکر میرا نہ کو بکو کیجئے — جو گلہ ہے وہ دو بدو کیجئے
چاک کر دیجئے قبائے سکوت — رقص بسمل ہے ہا و ہو کیجئے
وحشتیں آنکھ میں سمٹ آئیں — دل کو اتنا لہو لہو کیجئے
ہنس کے سہیئے عذاب ہجراں کا — تلخیٔ غم کو ہم سبو کیجئے
نخل امید کو ہرا رکھیئے — پھول کھلنے کی آرزو کیجئے
یوں نہ کیجے نماز عشق ادا — پرسش حسن با وضو کیجئے
خود کو پہچانیے ذرا صاحب — آئنہ اپنے رو برو کیجئے
جس کو پانے کی دھن میں رہتے ہیں — اس کو پانے کی جستجو کیجئے

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور)

یہ تو لازم ہے کہ چوکیدار ہونا چاہیے — وہ زیادہ بھی نہیں ہشیار ہونا چاہیے
آتے جاتے راہ میں اچھلے نہیں اس واسطے — آدمی کے سر پہ تھوڑا بار ہونا چاہیے
آدمی کا دل دکھانے میں کمی کیا رہ گئی — ایسے ٹاپک پر تو سیمینار ہونا چاہیے
سرحدوں کی بھی نگہبانی ضروری ہے مگر — گھر کے دشمن سے بھی تو ہشیار ہونا چاہیے
چاک دامانی کی باتیں اب پرانی ہوگئیں — کچھ جنوں والوں کا بھی معیار ہونا چاہیے
آپ کے منہ میں زباں ہے اتنا ہی کافی نہیں — دل میں بھی تو جرات اظہار ہونا چاہیے
ہر گھڑی تیار ہوں میں تو سفر کے واسطے — شرط یہ ہے راستہ دشوار ہونا چاہیے

○

نسرین نقاش

(سری نگر)

تمہارے شہر میں ایسی بھی تتلیاں ہوں گی — کہ جن کی زیست کا عنواں اُداسیاں ہوں گی
یونہی جو آتے رہے گاؤں شہر کی زد میں — نہ کھیت ہوں گے نہ گندم کی بالیاں ہوں گی
وہ کشتیاں جنہیں اپنے سفر پہ جانا ہے — کبھی ضرور وہ ساحل سے بدگماں ہوں گی
پسِ نگاہ وہ چاندی کا شہر ہو گا ضرور — مکاں مکاں جہاں سونے کی تھالیاں ہوں گی
یہ ڈھلتی شام کے سائے مجھے نہ چھوڑینگے — کہ پھر نظر کی فضائیں دھواں دھواں ہوں گی
خموش موجیں کسی وقت جب بھی بھڑکیں گی — بھنور میں ڈوبتی معصوم کشتیاں ہوں گی
وہ خواہشیں جو ہمارے دلوں میں پلتی ہیں — وہ ہم سے بچھڑی ہوئی شاہزادیاں ہوں گی

○

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار
(میامی)

قسط......۷

آج کل گڑ گاؤں، فرید آباد، بھرت پور، دوسا، الور، متھرا، آگرہ اور ریواڑی کے گرد و نواح میں بہت زور کا طوفان آیا ہوا ہے۔ ایسا طوفان جس کی گرد میں کسی کو کچھ دکھائی دیتا ہے، نہ سُجھائی۔ یہ علاقہ امن و امان کے حوالے سے کبھی بھی مثالی نہیں رہا مگر گذشتہ چند مہینوں سے چوری، ڈاکوں اور لوٹ مار کی تیز آندھی نے بڑے بڑے نوابوں، زمینداروں، سیٹھوں اور ساہوکاروں کے ساتھ انتظامیہ کی نیندیں بھی حرام کر دی ہیں۔

چند دن پہلے ہی علاقے کے انگریز ڈی ایس پی کو ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر کی جانب سے وارننگ ملی ہے کہ اگر ایک ہفتے کے اندر علاقے کا امن و امان بحال نہ ہوا اور جرائم پیشہ لوگوں کو نکیل نہ ڈالی گئی تو علاقے کی تمام پولیس فورس کو لائن حاضر کر دیا جائے گا۔

ڈی۔ایس۔پی صاحب نے تمام تھانوں کے داروغان کو بلا کر مخصوص زبان مین صاف صاف بتلا دیا:

''یُوتَو سبنّے پتو ہو اِک سُسّا نے ناہر گوامیں کُدا دیو ہو۔۔۔!''

(یہ تو سب کو پتہ ہے کہ ایک بدمعاش نے سب کو مشکل میں ڈال دیا ہے)

انگریز کی زبان سے اپنی بولی سُن کر تمام داروغان حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اس کے بعد تمام داروغان نے سر ہلا کر ڈی ایس پی صاحب کی تائید کی۔ ڈی ایس پی صاحب نے تمام داروغان کو غور سے دیکھتے ہوئے:

''رادھا کے گھر تو جو جا کا من میں آوے ہوا وکرے ہا۔۔۔''

(یہاں تو جس کے جی میں جو آتا ہے وہی کرتا ہے)

اس مثال کے بعد ڈی ایس پی صاحب نے نقشوں اور اخبار کے تراشوں کی مدد سے تیزی سے بڑھتی چوری اور ڈکیتیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اعداد و شمار گنواتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر کا حکم نامہ سنانا شروع کیا۔ جس میں صاف صاف لفظوں میں بتایا گیا تھا کہ سات دن کے اندر اندر علاقے کے چوروں، ڈاکوؤں اور رسّہ گیروں کے گرد گھیرا تنگ نہ کیا گیا تو آپ سب کا وہی انجام ہو گا جو مجرموں کا ہوا کرتا ہے بلکہ جو سلوک آپ لوگ مجرموں سے کرتے ہیں وہی سلوک، سرکار آپ سے کرے گی۔

ڈی ایس پی صاحب کی گفتگو کے بعد تمام داروغان کے چہروں کی رنگت زرد بلکہ سیاہ پڑ گئی تھی جواب میں ایک آواز ابھری:

''ایکلو چڑو بھاڑ نہ پھوڑ سکے۔۔۔!'' (اکیلا آدمی دوسرے کی مدد کے بغیر بڑا کام نہیں کر سکتا)

اس بار ڈی ایس پی صاحب کی آواز سنجیدہ ہونے کے ساتھ گمبھیر بھی ہو گئی تھی:

" I Don't care whether you catch criminals indipendently or jointly but i only want all sorts of criminals including Dacoit Shamsher Singh here infront of me, dead or alive and that too with in this week.

"Is it clear?"

"Yes Sir"

☆

''ابے تیرے دادا کا کیا ہوا جنہیں ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے۔۔۔؟''

(غیاث الدین نے لقمہ دیا)

''تم لوگوں کی یہی بات بری ہے کہ درمیان میں۔۔۔ سے باز نہیں آتے۔۔۔ ابے۔۔۔ صبر کرو، صبر، وہ کہاوت نہیں سنی تم نے۔'' بنیا سر منڈھوا رہا تھا اور گھڑی، گھڑی نائی سے پوچھ رہا تھا:

''ججمان جی کتنے بال رہ گئے ہیں کھوپڑی پر''

پہلے تو نائی نے خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا، جب بنیا باز نہ آیا تو نائی جھلّا کر بولا:

''مونڈے مانڈے آگے آجاویں گے مہاراج''

۔۔۔ کے۔۔۔ زبان کو لگام دے کر بیٹھو۔۔۔ ساری۔۔۔ مٹا دوں گا۔۔۔! (عمران کا غصہ اور جھنجھلاہٹ دیکھ کر وجے اور غیاث منہ پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئے) بس جناب اُس دن کے بعد پولیس ایسی حرکت میں آئی، ایسی حرکت میں آئی کہ بڑے بڑے پھنّے خانوں کی سٹّی گم کرا دی۔ تھانے، عدالت اور جیلوں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے مگر پولیس کو آرڈر تھا کسی نواب، وڈیرے، چوہدری یا رئیس کی سفارش نہیں سننی۔

اس ہڑبونگ اور پکڑ ادھکڑی کے درمیان ایک رات بارہ بجے کے قریب دادا کے دروازے پر دھیمی آواز میں دستک ہوئی۔ پہلے تو دادا نے کتّے، بلّی جان کر کان نہ دھرے مگر دستک جس تواتر اور ردھم میں ہو رہی تھی اُس سے دادا کے کان کھڑے ہو گئے۔ دیوار پر لگی بندوق کو لوڈ کرتے ہوئے دادا نے مضبوط آواز میں دریافت کیا:

''کون ہے۔۔۔؟'' (خاموشی)

''کون ہے۔۔۔؟''

''پولیس۔۔۔'' (دھیمی آواز میں)

لفظ پولیس سنتے ہی دادا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔گھبراہٹ میں کبھی بندوق، کبھی دروازہ، کبھی اہل خانہ کو دیکھتے ہوئے اور تو کچھ نہ سوجھا، چولہے کے پاس موجود لکڑیوں کے ڈھیر میں بندوق چھپا کر دروازہ کھولا تو سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک اہلکار گویا ہوا:

''آنکھن میں کے دُھوڑ جھونکڑو۔۔۔؟''

(آنکھوں میں کیا دھول جھونک رہے ہو)

''صاب، بچ نہ اُچھاڑو۔۔۔!'' (دادا نے اندر کے خوف پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا)

''ایک لوچنیو بھاڑ نہ پھوڑ سکے۔۔۔!'' (آفیسر نما شخص نے دادا کے پیٹ میں جھڑی گھونپتے ہوئے دھمکایا)

''آندھو کہا چہاوے دُوُ آنکھ۔۔۔'' (دادا کے جواب پر اہلکاروں نے اجتماعی قہقہہ لگاتے ہوئے قریب پڑی چارپائی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے، دادا سے کھانے کی فرمائش کی) اُس رات کی گھنٹوں پر محیط ملاقات میں پولیس اور دادا کے درمیان کیا کچھ طے پایا یہ راز، پولیس اور دادا کے علاوہ دوسرا کوئی شخص نہیں جانتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پُشتے لگنے لگے۔ بڑے بڑے نامی گرامی چور ڈاکو یا تو پولیس کی حراست میں تھے یا میوات چھوڑ کر دور دراز کے علاقوں میں ہجرت کر گئے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے میوات کا امن وامان اور لوگوں کی جان ومال جس عدم تحفظ کا شکار تھے وہ کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور جس دن ڈاکو شمشیر سنگھ بھرت پور کی پہاڑیوں میں پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا اُس دن کے بعد میوات کے لوگوں نے سُکھ کا سانس لینا شروع کر دیا تھا اور روزمرہ کی مجلسی زندگی لوٹ آئی تھی جس کا اظہار لوک گیتوں کی شکل میں پھر سے سنائی دینے لگا تھا:

راجا ہم پہ چلے نہ تیر چاگی
ہماری پتلی سی کمریا رے
ناگوری ماروں ناگوری چھیڑوں
دوھری لگا دوں پڑی ہاری
تمہاری پتلی سی کمریا رے
راجا ہم پہ کھنچے نہ تیروپاڑی
ہماری بالی سی کمریا رے
نہ گوری ماروں نہ گوری چھیڑوں
دوھری لگادوں پڑی ہاری
تمہاری بالی عمریا رے

☆

جُوں جُوں میوات اور اُس کے گردونواح کی رونقیں بحال ہو رہی تھیں دُوں دُوں علاقے کے لوگوں کو نورے میراثی کی یاد ستا رہی تھی۔ نورے میراثی کی تانیں، بندش اور گرہیں میوات کے لوک گیتوں کو چٹخارے دار بنا دیا کرتی تھی۔ جب وہ ترنگ میں آتا تو ڈھولکی فتح محمد عرف فتو کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ اور ہارمونیم کی لے پر خوب جگل بندی کرتا اور جوانوں کے ساتھ بزرگ بلکہ ڈیوڑھی، دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی عورتیں بھی مٹھیاں بھر بھر پیسے اور سوغات لٹاتیں۔ آج کل اہل میوات کی گفتگو میں کسی نہ کسی طور نورے میراثی کی گمشدگی اور اُس کے گیتوں خاص کر:

ایئے میرو رو۔ رو گُل بند بھیجے
ایئے سُکھیں سُو گل میرو دُکھے
ساس میری دیکھے، سُسر میرا دیکھے
ایئے ہر بابی بلم بنا دِیکھے
ایئے میرو رو۔ رو گُل بند بھیجے
دیور بھی دیکھے، دو رانی بھی دیکھے
ایئے پھر چندو بلم بنا دیکھے
ایئے میرو رو۔ رو گُل بند بھیجے

''عمران ابے او عمران۔۔۔!''

''تُو پہلے۔۔۔لے۔۔۔!''

''ابے سُن نا۔۔۔ایک میواتی گیت گا کے سنانا۔۔۔!''

''۔۔۔نہ دے دوں۔۔۔!'' (عمران نے جھلاّ کر فحش زبان استعمال کی تو غیاث الدین اور وجے کھسیانے ہو کر بولے)

''غلطی ہو گئی پیر صاحب۔۔۔معاف کر دیں۔۔۔!'' (کان پکڑتے ہوئے)

''غلطی کی ماں کا۔۔۔تم نے آخر سمجھ کیا رکھا ہے۔۔۔؟''

''باپ۔۔۔میرے باپ۔۔۔تُو جیتا۔۔۔ہم۔۔۔ہارے۔۔۔ اب جلدی سے یہ بتا دے کہ تیرا دادا۔۔۔کُھس گیا۔۔۔؟''

''تیری۔۔۔میں۔۔۔!''

''دیکھ بے دیکھ۔۔۔بات تیری میری ہو رہی ہے۔۔۔ماں۔۔۔ باپ۔۔۔بیچ میں نہیں آنے چاہیے۔۔۔!''

''بہت بڑھیا، کیا کہنے۔۔۔تُم میرے دادا۔۔۔اور۔۔۔میں کچھ بھی نہ بولوں۔۔۔!'' (عمران نے غصے کا اظہار کیا تو غیاث اور وجے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے)

''ہماری توبہ۔۔۔ہمارے باپ کی توبہ (کان پکڑتے ہوئے) چل اُٹھ باہر چل کے چائے پیتے ہیں۔ کلّے میں بیڑا دبا اور چار مینار کی سگریٹ کا کش لگا کر طبیعت رواں ہو جائے گی۔ بقول کرشن بہاری نور:

یارو گھر آئی شام چلو میکدے چلیں
یاد آ رہے ہیں جام چلو میکدے چلیں

''یاد آنے کی بات نہ کرنا پہلوان، بیڑے کا ذکر کر کے بانکے مرزا کی

یاد، بہت سُرتا بنتے ہیں بانکے مرزا، میں بھی دیکھتا ہوں، بکرے کی ماں کب تلک خیر منائے گی۔''(بانکے مرزا کے ذکر پر عمران کا جوش دیدنی تھا)

''ابے نہیں یار۔۔۔! یہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے، چھوٹوں، بڑوں کو اُن کا صحیح مقام دینا اور ادب آداب کی پاسداری کرنا ہماری گھٹی میں شامل ہے''

''کون سی تہذیب کی بات کر رہا ہے۔۔۔ کتو بر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی۔۔۔ بازی۔۔۔ بازی۔۔۔ وغیرہ۔''

''میرے بھائی۔۔۔! تُو بات کر رہا ہے مغلوں کے زوال کے بعد کی۔۔۔ اور۔۔۔ میں کر رہا ہوں مغلوں کے دورِ عروج کی بات۔۔۔ معلوم بھی ہے۔۔۔ اُس زمانے میں بڑے بڑے رئیس زادے طوائفوں کے کوٹھے پر تہذیب سیکھنے جاتے تھے۔''(غیاث الدین کی ناصحانہ گفتگو عمران کو ایک آنکھ نہ بھائی)

''کس تہذیب کی بات کر رہے ہو پہلوان، ہمیں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔۔۔؟''

''میرے بھائی یہ اُس زمانے کی باتیں ہیں جب میر تقی میرؔ کو اہل لکھنؤ:

''اِدھر آبے، او چاک گریباں والے''

کہہ کر بلاتے تھے، کِسے بلاتے تھے۔۔۔ خدائے سخن میر تقی میر کو۔۔۔؟ وہی میرؔ جو خدا کو بھی نہ بخشتے تھے:

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ یہ خدائے سخن کون ہے۔۔۔؟''

''۔۔۔ ایک طرف تو تُو کہتا ہے کہ میں آدھا مسلمان ہوں۔۔۔ دوسری طرف تجھے خدائے سخن میر تقی میرؔ کا اتہ پتہ نہیں۔۔۔ تو۔۔۔ کاہے کا مسلمان ہے۔۔۔؟''(وجے کمار نے رحم طلب نظروں سے غیاث کی جانب دیکھا تو اُس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے اُس کی تسلی کرنے کی کوشش کی)

''میری جان۔۔۔ ! میر تقی میرؔ۔۔۔ اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں۔۔۔ اتنے بڑے۔۔۔ کہ اُنہیں اردو شاعری کا خدا مانا جاتا ہے۔۔۔!

(وجے کمار نے گویم مشکل کے انداز میں سر ہلایا)

''او بے او غیاث، سامنے دیکھ۔۔۔!''

''چائے کی دکان۔۔۔!''

''ابے چائے کی دکان کے سامنے، میز کے گرد جو چار بزرگ چونچیں لڑا رہے ہیں۔۔۔ ہوں نا ہوں۔۔۔ یہ شاعر ہیں۔۔۔!''

''پھر۔۔۔''(غیاث نے حیرت سے سوال کیا)

''پھر یہ کہ جا کے کھجلی مٹا لے۔۔۔ تجھے بھی وقت بے وقت شاعری بہت آتی ہے۔۔۔!''

''تُو باز مت آئیو۔۔۔؟''(عمران نے غیاث کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر آواز لگاتے ہوئے چائے کی دکان کی جانب اشارہ کیا)

''فٹافٹ تین چائے پکڑ لے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ سامنے والی دکان سے تین نان کھاتائیاں بھی لیتا آ۔۔۔ سنا ہے۔۔۔ میرٹھ کی نان کھاتائیاں بہت خستہ اور بھُربھُری ہوتی ہیں۔۔۔!''

☆

''لو بھئی لونڈوں مزہ آ گیا چائے کے ساتھ نان کھاتائی، گلوری اور پاسنگ شو کے سگریٹ نے طبیعت چھک کر دی۔۔۔!''

''ہاں یار۔۔۔ سگریٹ یہ بھی بُرا نہیں۔۔۔ آئندہ سے یہ ہی پیئیں گے۔۔۔!''(وجے نے گرہ لگائی)

''پہلوان بُرا نہ ماننا، بات بنی نہیں۔۔۔!''

''کون سی بات۔۔۔؟''(عمران نے حیرانی سے دریافت کیا)

''وہی تیرے دادا والی۔۔۔!''

''نہیں بنی تو۔۔۔ میں کیا کروں؟''

''تیری قسم ابھی تک پتہ ہی نہیں چلا، سیتا عورت تھی یا مرد، بھائی ہو گا۔۔۔ تو تفصیل سے بتا دے۔۔۔!''

(وجے کمار نے عمران کے کاندھے دباتے ہوئے رام کرنے کی کوشش کی)

''ابے۔۔۔ والو۔۔۔!۔۔۔ اتنی سی بات سمجھ نہیں آئی۔۔۔ جب میرے دادا کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے تو ڈاکوؤں کے سردار نے دس فیصد لُوٹے ہوئے مال کا حصہ دینے کے عوض دادا کو موٹے مرغوں کی معلومات مہیا کرنے کی ذمہ داری سونپی۔۔۔ دادا علاقے کی دائی تھا۔۔۔ سب کچھ اُس کی انگلیوں کی پوروں پر درج تھا جو حرف بہ حرف اُس نے ڈاکوؤں کے سردار کو بتلا دیا۔۔۔ جس کے بعد ڈاکو تاک، تاک کر۔۔۔ ایک سے ایک موٹا مرغا حلال کرتے۔ ڈاکوؤں کے منہ کو اتنا خون لگ گیا کہ علاقے میں کہرام مچ گیا۔

آدھی رات کو دادا کے گھر میں پولیس داخل ہوئی اور زور زبردستی سے، دادا سے وہ سب کچھ اُگل والیا جو پولیس کو درکار تھا۔ اس زور زبردستی میں اگر پولیس کی جانب سے دس فیصد کے بجائے پچاس فیصد کا لالچ شامل نہ ہوتا تو میرا دادا، مرتے مرجاتا مگر پولیس کے آگے ایک لفظ نہ اُگلتا۔

ڈاکو شمشیر سنگھ کے ساتھ اُس کے قریبی اور وفادار لوگ بھی مارے گئے۔ یہ پولیس محکمے کے ساتھ علاقے کے داروغہ کے لیے بڑی کامیابی تھی۔ ڈاکو شمشیر سنگھ منہ زور ہونے کے ساتھ ہاتھ چھٹ بھی بہت تھا۔ زبان سے بات کرنا اُس کی توہین تھی۔ وہ ہر بات گولی کی زبان میں کرتا۔ انسانی جان کی قیمت اُس کے نزدیک جانور سے بھی کم تھی۔ کئی بار علاقے کے داروغہ نے شمشیر سنگھ سے ساجھے داری کرنے کی پیشکش کی مگر ہر بار شمشیر سنگھ نے ''آخ تھو'' کہہ کر پولیس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ پولیس کی تمام کوششیں رائیگاں جا رہی تھی جس کے دوران کئی پولیس ملازمین بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ڈاکو شمشیر سنگھ کی موت کے بعد پولیس نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے

میرے دادا کو بچے کھچے ڈاکوؤں کا سردار بنا کر آدھو آدھ کی شرط کو برقرار رکھا، ترمیم صرف یہ کی گئی کہ لوٹے ہوئے مال کو داروغہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہی تقسیم کرنے کا مجاز ہوگا۔

کئی سال پولیس اور ڈاکوؤں کی ملی بھگت عمدگی سے چلتی رہی۔ پولیس نے بڑی چالاکی سے ڈاکوؤں کے سردار کا نام اخفا میں رکھا۔ کسی کو کانوں کان بھنک نہ پڑی کہ جس نور محمد عرف نورا، اُن کے جان، مال کا دشمن ہے لفظ آبرو اس لیے شامل نہیں کہ میرے دادا نے ڈاکوؤں کا سردار بننے کے بعد اپنے ساتھیوں کو سختی سے اس امر پر کاربند رہنے کی تاکید کی تھی کہ جس طرح بیٹیاں مشترکہ اثاثہ ہوتی ہیں اس طرح ہم نے ہر عورت کو وہی عزت، احترام اور احساسِ تحفظ دینا ہے جو ہم اپنی ماں، بہن، بیٹی اور بہو کو دیا کرتے ہیں۔

☆

بظاہر چوروں کی اس پوٹلی کو کسی طرف سے کوئی کھٹکا نہ تھا بقول پرانی کہاوت:

''سیّاں بھئے کوتوال، پھر ڈر کاہے کا''

مگر اٹھارہ سو ستاون کے انقلاب نے پورا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ ہندوستان کیا انگلستان اور امریکہ تک بڑے بڑے سرکاری ایوانوں میں اس انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے بڑے بڑے لوگ سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مسئلہ بہادر شاہ ظفر یا اُن کی فوج نہیں بلکہ وہ انقلابی تھے جو، جوق در جوق پورے ہندوستان سے دارالخلافہ دہلی کی جناب جتھوں کی شکل میں بڑھ رہے تھے۔

حکومت ہند نے پہلے پہل تو پولیس اور فوج کی مدد سے انقلابیوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی مگر بپھرے ہوئے سمندری طوفان کی مانند انقلابیوں کے جوش و جذبے کے ساتھ تعداد میں بھی ہوش ربا اضافہ ہو رہا تھا۔ برٹش حکومت نے بڑے غور و فکر، سوچ بچار اور تاج برطانیہ کے مشورہ سے ایک انوکھی ترکیب انقلابیوں سے نمٹنے کی نکالی جو اس کے بعد دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر بھی جرمنی میں یہودیوں کے خلاف آزما چکا ہے۔

جتنے بھی صاحبِ حیثیت یا انگریزوں کے باج گزار، زمیندار، چوہدری، رئیس، بڑے پیر، فقیر، گدی نشین، چور، ڈاکو، رسہ گیر اور پیشہ ور قاتل تھے اُن کو فی انقلابی بیس روپے معاوضے کی پیشکش کر دی گئی۔ جو شخص انقلابیوں کی جتنی لاشیں پیش کرے گا ہاتھوں ہاتھ بیس روپے فی لاش نقد رقم وصول کرے گا۔

''تیرے دادا نے کتنے وصول کیے۔۔۔؟''

''میرے دادا نے۔۔۔ اس حوالے سے، جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔۔۔ تان البتہ سینکڑوں پر ٹوٹتی ہے۔۔۔ میرے دادا کو شمال مغربی علاقوں سندھ، سرحد، بلوچستان، راجستھان اور کشمیر وغیرہ کے علاقے سونپے گئے۔ ان علاقوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی زیادہ تر لوگ نائی، دھوبی، لوہار، سنار، بڑھئی، موچی، درزی، ٹھگ، سپیرے، معمار، راج، مستری، بیلدار، کیمیادان، فلسفی، نیچے بند، خطاط، نقاش، مصور، مولوی، مؤذن، مدرس، محقق، معلم، بہروپیے، بہشتی، کمہار، کہار، ٹانگے بان، بھڑبھونجے، نٹ، قلئی گر، رفوگر، خانساما، مسالچی، مالشیئے، سائیس، کان میلئے، جادوگر، میراثی، قوال، گھوسی، دودھ فروش، سبزی فروش، پھل فروش، نان بائی، مٹھائی فروش، کریانہ مرچنٹ، جولاہے، رنگی، حکیم، وید، جرّاح، عطّار، مجمع باز، تیلی، عطر فروش، سُرمہ فروش، چٹیا، کنگھی، مسّی، دنداسہ، تیل پھلیل، کاجل یعنی بسطاخانے کے کاموں سے منسلک تھے۔ ان لوگوں میں خدا خوفی، ایک دوسرے کا احترام محنت اور ایمانداری کے بعد سب سے بڑی خوبی مٹی سے محبت تھی۔ مٹی یعنی اپنی سرزمین سے محبت ان کے خون میں شامل تھی۔ یہ سادہ مگر سچے لوگ اپنی سرزمین کو ماں کا درجہ دیتے اور اس کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے دریغ نہ کرتے۔

☆

اٹھارہ سو ستاون میں منگل پانڈے کو پھانسی دینے کے بعد میرٹھ آرٹلری کے جوانوں نے انگریز فوجیوں کو قتل کرنے کے بعد دہلی کی جانب مارچ شروع کیا تو جذبۂ حریت سے سرشار ہندوستان بھر سے ہر محبِ وطن کی یہ خواہش تھی کہ گھڑی کی چوتھائی میں کسی طرح دہلی پہنچ کر حرّیت پسندوں کے جتھے میں شامل ہو جائیں اور مادرِ وطن کو انگریزوں کے چنگل سے نجات دلائے۔

مٹی کی محبت سے شرابور جیالے، لاٹھی، سوٹا، ڈانگ، چاقو، چھری، چاپڑ، کلہاڑی، تلوار، بھالا لے کر دس دس، بیس بیس یا سو پچاس کی ٹولیوں میں کبھی چنے اور گڑ سے پیٹ کی بھوک مٹاتے کبھی بھوکوں پیٹ سفر جاری رکھتے کبھی درختوں کے پتوں اور چھالوں سے معدے کی آگ ٹھنڈی کرنے کی کوشش کرتے۔

کسی طرح کی منصوبہ بندی، حکمت عملی، ہنر یا جدید ہتھیار تک اُن کی رسائی تھی نہ دسترس۔ جس کے پاس جو سہولت دستیاب تھی وہ اپنی حفاظت اور بچاؤ کی حد تک کارگر تھی۔ کسی کو مارنا، نقصان پہنچانا یا جنگ کرنا اُن کے عزائم میں شامل نہ تھا۔ اُن کی سوچ، فکر اور اُڑان اس حد تک تھی کہ بھاری تعداد میں دہلی پہنچ کر نہتے اور مجبور تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر کو اخلاقی کمک پہنچائیں تاکہ بہادر شاہ ظفر اعتماد کے ساتھ مضبوط فیصلے کر سکیں۔

دوسری طرف انگریزوں کے زرخرید گماشتوں کو نہ صرف تکنیکی سہولیات، مہارت، جدید ہتھیار اور منظّم ہلّہ شیری دستیاب تھی۔ انتظامیہ کے نشان زد راستوں پر یہ غدرانِ وطن مضبوط درخت کے ساتھ موٹے رسّے کا ایک سرا باندھ کر، دوسرا سرا پاس رکھتے اور پہلے سے تیار کردہ مخصوص اور محفوظ ٹھکانوں میں بیٹھ کر معصوم اور نہتے انقلابیوں کی تاک میں رہتے جیسے ہی انقلابیوں کا قافلہ اس درخت کے نزدیک پہنچتا جس سے رسّے کا ایک سرا بندھا ہوتا یہ لوگ نہایت چالاکی سے ہاتھ میں رسّے کا تھاما سرا جھٹکے کے ساتھ کھینچ لیتے۔ رسّہ موٹا اور تنا ہونے کے سبب کافی تعداد میں انقلابی اوندھے منہ گرتے اور عین اُسی وقت یہ شقی القلب غدّرانِ وطن بندوقوں کے فائر کھول دیتے کچھ انقلابی موقع پر شہید ہو جاتے اور کچھ نڈھال ہو کر بے سدھ ہوتے تو انسان نما حیوان اُن پر تلواروں اور

بھالوں سے ٹوٹ پڑتے صرف اس لیے کہ انگریز کی دی ہوئی گولیاں کم سے کم خرچ ہوں اور ان گِدھوں کو ان گولیوں کے عوض حرام کے مزید لُقمے میسر آ سکیں۔
کاش! ہوس کے بندوں کو اقبال بروقت سمجھا سکتے:

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

☆

اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے ظالمانہ طریقے استعمال میں لائے گئے۔ مثلاً کئی مقام پر پُرعزم و پُرجوش انقلابیوں پر کھولتا پانی اُنڈیلا جاتا۔ جگہ جگہ خندقیں کھود کر اُنہیں درختوں کی جھاڑیوں سے ڈھانپ دیا جاتا، بے خبری اور لاعلمی میں تھکے ماندے انقلابی ان خندقوں میں گرتے تو مُردار گدھ اُن پر حملہ آور ہو جاتے۔ کئی مقام پر نوک دار کانٹے اور خار دار تاریں بچھا کر انقلابیوں کو شکار کیا گیا۔ خوفناک اور خونخوار جانوروں کو بھی اس قبیح کھیل میں شامل کر کے انقلابیوں کی زندگیوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔

اسی پر بس نہیں جن جن علاقوں سے انقلابی، مادرِ وطن کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے کی غرض سے گھر بار چھوڑ کر سروں پر کفن باندھ کر نکلے تھے انقلابی مہم سر کرنے کے بعد اُن علاقوں میں چُن چُن کر انقلابیوں کے بزرگوں، خواتین اور بچوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ظلم کی ایسی داستانیں رقم کی گئیں کہ ان داستانوں کو رقم کرنے کے لیے مؤرخ کو لوہے کا سینہ اور پتھر کا جگر درکار ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

خاک صحرا پہ جمے یا کف قاتل پہ جمے
فرق انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمت ناکارہ و رسوا سے کہو
جبر کی حکمت پرکار کے ایما سے کہو
محمل مجلس اقوام کی لیلیٰ سے کہو
خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے خرمن پہ لپک سکتا ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

''واقعی یار، تُو ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔۔ یقین مان، رونگٹے کھڑے ہو گئے۔۔۔ دیکھ۔۔۔ غور سے دیکھ (کلائی آگے کرتے ہوئے) ابھی بھی رُواں رُواں کھڑا ہے۔ میرا تو دل، دھک دھک کرنے لگا ہے۔ (عمران کا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے وجے کمار نے اپنی کیفیت بتلائی تو غیاث بھی بول پڑا)

''بڑی ہولناک کہانی ہے بھئی۔۔۔! پہلے رائے بہادر کا نام سن کر۔۔۔ جا رہی تھی۔۔۔ اب تیرے دادا کا نام سوچ کر۔۔۔ چکی ہے۔۔۔!''

''ویسے ایک بات ہے، مسلمان ہوتے بڑے جی دار ہیں۔۔۔!''

''وہ کیسے۔۔۔؟'' (وجے کی بات پر عمران حیران ہوا)

''انگریز کے سامنے ڈٹ جانا، خالہ جی کا گھر تھوڑی ہے۔۔۔!''
(وجے کمار کے چہرے پر خوف کے سائے نمایاں تھے)

''ابے باؤلا ہوا ہے۔۔۔ ہندو مسلمان کہاں سے آ گئے بیچ میں۔۔۔؟ یہ ہندو کی لڑائی تھی نہ مسلمان کی۔۔۔ لڑائی تھی۔۔۔ حق کی۔۔۔ دھرتی ماتا کی لڑائی۔۔۔ اس لڑائی میں ہندو، مسلمان نہیں۔۔۔ ہندوستانی لڑے تھے۔۔۔ بلا، رنگ و نسل۔۔۔ اور۔۔۔ مذہب و دھرم کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔''

''ہے بھگوان۔۔۔ میں کتنا مورکھ ہوں۔۔۔ کاش! اُس دور میں ہم لوگ ہوتے۔۔۔ تو۔۔۔ دھرتی ماں کی آزادی کے لیے ہم بھی اپنی جان لڑا دیتے۔۔۔!''

''دل چھوٹا نہ کر میری جان۔۔۔! اقبال نے تیرے لیے ہی کہا ہے!''

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔ وطن کی خدمت کرنے کے اور بھی طریقے ہیں
(غیاث نے وجے کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے عمران کو مخاطب کیا)

☆

''تیرے دادا کا کیا ہوا۔۔۔؟''

''میرے دادا۔۔۔(لمبی سانس خارج کرتے ہوئے) بڑا کرُوتھا، میرا دادا۔۔۔!''

''کرُو۔۔۔؟''

''ابے اتنا بھی نہیں جانتا ۔۔۔ ! کرُو کا مطلب۔۔۔ تُو بتا بھئی اسے۔۔۔کرُو کا مطلب۔۔۔؟(غیاث کی طرف رُخ کرکے)

''کرُو کا مطلب ۔۔۔ ! (سوچتے ہوئے) کرُو کا مطلب ہے۔۔۔ ضرورت سے زیادہ چنٹ (چٹکی بجاتے ہوئے) دوسروں کو ٹیکہ لگانے والا۔۔۔!''

''اوہ۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ تیری باتوں سے۔۔۔تو۔۔۔ تیرا دادا۔۔۔ اس سے بھی آگے کی چیز لگتا ہے۔۔۔!''

''ابھی سے چیں بول گئے بیٹا جی۔۔۔!''

آگے، آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

''بتاؤ نا میری جان۔۔۔! جلدی بتاؤ۔۔۔تمہارے دادا جانی نے آگے چل کر۔۔۔ کیا گُل کھلائے۔۔۔؟ (غیاث نے بے تابی ظاہر کی تو عمران کی طبیعت رواں ہوگئی)

پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود میرے دادا پر یہ مثال صادق آتی ہے:

''آنکھ کا اندھا، گانٹھ کا پورا''

''یہ کیا بات ہوئی بھئی۔۔۔؟''

مطلب یہ کہ سُرتا بہت تھا میرا دادا۔۔۔دور کی سوچ رکھتا تھا۔ اگر چاندنی چوک سے، حوض قاضی بھی جانا ہے تو اس کے ذہن میں پہلے سے پروگرام ترتیب پا جاتا تھا کدھر سے جانا ہے، کس سے ملنا ہے، کس سے بچنا ہے۔ ابّا میاں بتلاتے ہیں کہ ہماری دادی کہا کرتی تھی کہ جب تمہارے دادا کے پاس کھانے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا دستیاب نہ تھا، خواب وہ تب بھی بڑے، بڑے دیکھا کرتا تھا۔(غیاث کے سوال پر عمران نے اپنے دادا کی شخصیت پر روشنی ڈالی تو غیاث خاموش نہ رہ سکا)

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ان باتوں کا قتل وغارت گری سے کیا تعلق۔۔۔؟''

''بیٹا جی، اُسی سے تعلق ہے تبھی تو بتلا رہا ہوں۔۔۔ ہر معرکہ سر کرنے کے بعد سرکار سے بیس روپے فی لاش وصول کرکے، میرا دادا، انٹی میں لگاتا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا کہ سرکار نے کہا ہے کہ وہ، کام ختم ہونے کے بعد یک مشت ادائیگی کرے گی۔''

پہلے پہل تو دادا کے بہلاوے میں آکر سب لوگ ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگے مگر جُوں، جُوں وقت گزرنے لگا، دُوں دُوں تنگ دستی بڑھتی گئی۔ جب، جب کوئی ساتھی اس کا ذکر کرتا تو میرا دادا روپے، دو روپے تھما کر اُس کا منہ بند کر دیتا مگر ایک دن سارے ساتھیوں نے ہم آواز ہو کر دادا سے پیسوں کا مطالبہ کیا تو دادا نے سرکار سے بات کرنے کا وعدہ کرکے وقتی طور پر گلو خلاصی حاصل کرلی۔ اس کے بعد دادا کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ اگلی بار جب انہوں نے بارہ مولا، پتن اور سری نگر سے آنے والے قافلے وہی سری نگر جہاں کشمیری نوجوان عبدالقدیر کو غداری کے الزام میں گرفتار کرنے کے ردِعمل میں ۶۔ اگست ۱۹۳۱ء کو بڑی تعداد میں جیل کے سامنے کشمیریوں کا احتجاج ہوا تو احتجاج کے دوران نماز کا وقت ہوگیا۔ ایک کشمیری نوجوان نے اذان دینا شروع کی جیسے ہی نوجوان نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی ڈوگرا فوج نے نوجوان کو شہید کردیا ایک کے بعد دوسرا نوجوان اذان کو جاری کرتا اور شہید کر دیا جاتا۔ اس طرح بائیس نوجوانوں کی شہادت کے بعد اذان مکمل ہوسکی جو برصغیر نہیں دنیا کی تاریخ میں سفاکیت کا حامل سب سے گھناؤنا واقعہ ہے۔۔۔!

''سب سے گھناؤنا کیوں۔۔۔؟''

''ایک، دو نہیں پورے بائیس معصوم اور بے گناہ نوجوانوں کو، صلوۃ اور فلاح کا پیغام دینے کی پاداش میں، آگ اور خون میں نہلا دینا، چھوٹا ظلم ہے کیا۔۔۔؟''(وجے کے سوال پر عمران کا لہجہ کرخت ہوگیا تھا)

''میں کب چھوٹا کہہ رہا ہوں۔۔۔اس ظلم نے تو مجھے ۲۴۔ مارچ ۱۹۳۱ء لاہور کے مقام پر بھگت سنگھ، سُکھ دیو اور راج گُرو جیسے آزادی کے متوالے کڑیل اور بے باک نوجوانوں کو پھانسی دینے کے واقعہ کی یاد، دلا دی ہے۔ اُن کے مردہ جسموں کو ٹکڑے کرکے ستلج کے کنارے واقع گاؤں حسینی والا میں تیل چھڑک کر آگ لگائی تو حسینی والا اور اردگرد کے گاؤں میں آگ کے شعلوں کے ساتھ انسانی گوشت کی چراند کے سبب بے شمار مشتعل لوگ گھروں سے باہر نکل آئے جنہیں دیکھ کر پولیس اہلکار مارے خوف کے بھاگ نکلے۔''

پولیس کے بھاگنے کے بعد اہلِ علاقہ نے تینوں ادھ جلی لاشوں کی باقیات کو جمع کرکے لاہور کے قریب راوی کے کنارے احترام کے ساتھ انتم سنسکار کیا جس میں عوام کے جمِ غفیر کے ساتھ بھگت سنگھ کی بہن پرکاش کور اور لالہ لاج پت رائے کی بیٹی پاروتی نے سوگوار دل اور پرنم آنکھوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔

''۲۴۔ مارچ نہیں، یہ واقعہ ۲۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو ہوا تھا۔''

''یار۔۔۔ تجھے نہیں پتہ۔۔۔ پھانسی کی تاریخ تو ۲۴۔ مارچ ہی تھی مگر عوام کے غم وغصہ کے خوف سے ڈر کر انگریزوں نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۲۳۔ مارچ کی شام کو ہی یہ گھناؤنا جرم انجام دے دیا۔''(غیاث کی تصحیح پر عمران نے وضاحت ضروری جانی)

پھانسی کے پھندے کی جانب بڑھتے ہوئے بہادر اور جرّی بھگت سنگھ نے ڈیوٹی پر موجود انگریز مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کیا تاریخی جملے ادا کیے تھے:

''بڑے خوش قسمت ہو صاحب، تمہیں بھارت ماتا کے جیالے سپوتوں کا دیدار نصیب ہو رہا ہے۔''

''اپنی زندگی کے آخری الفاظ ادا کرنے کے بعد بھگت سنگھ، راج

گرواور سکھ دیوایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ہنستے گاتے مقتل کی جانب رواں دواں تھے'':

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

☆

''کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ انگریز لوگ۔۔۔!''(غیاث نے ٹھنڈی آہ بھر کر، گرم سانس چھوڑتے ہوئے دُکھ کا اظہار کیا)

''اسی کا نام سیاست ہے پیارے۔۔۔سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔۔۔اگر یہ بات غلط ہوتی تو اورنگزیب عالمگیر اقتدار کی خاطر، سگے بھائی شہزادہ داراشکوہ کو جانوروں سے بدتر انجام سے دوچار نہ کرتا اور نہ ہی اپنے باپ شہاب الدین محمد خرم المعروف شاہجہاں کو قیدِ تنہائی میں ڈالتا۔اور جب پورے تیس سال ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء تک ہندوستان کا عظیم الشان بادشاہ اور ظلِ الٰہی کہلانے والا شخص بیٹے کے حضور یہ درخواست ارسال کرتا ہے کہ ''تنہائی کے سبب وقت کاٹے نہیں کٹتا لہٰذا میری خواہش ہے کہ میں معصوم بچوں کو قرآن پڑھا کر وقت کا بہترین مصرف کروں اور اپنے خدا سے نجات کا حقدار ٹھہروں۔''

محصور اور مہقور باپ کی درخواست کے جواب میں شقی القلب بیٹا کہتا ہے:

''ابھی تک بڑے میاں کا شوقِ حکمرانی نہیں گیا۔۔۔!''

یاد رہے شہاب الدین محمد خرم المعروف شاہجہاں فقط ایک بادشاہ ہی نہیں، علوم وفنون، سیاسیات، جمالیات، تاریخ اور فلسفہ میں یکتائی کے ساتھ ایک عظیم عمارت کار بھی تھا جس نے اپنے دورِ حکمرانی میں آگرہ کا تاج محل، موتی مسجد آگرہ، لال قلعہ دہلی، جامعہ مسجد دہلی، چاندی چوک دہلی، شالیمار باغ لاہور، شیش محل لاہور، نولکھا محل لاہور، جہانگیر کا مقبرہ لاہور، مسجد وزیر خان لاہور، شاہی قلعہ لاہور، مسجد مہابت خان پشاور، شاہی مسجد ٹھٹھہ سندھ جیسی عظیم الشان اور تاریخی عمارات تعمیر کرائیں۔یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ٹھٹھہ سندھ کا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔

مگر یہ بھی تاریخ کا سیاہ باب ہے کہ شاہجہاں خود بھی اپنے والد شہنشاہ جہانگیر کی خواہش کے برعکس اپنے دو بھائیوں شہریار مرزا اور خسرو مرزا کو شاطرانہ طریقے سے قتل کرا کر تخت نشین ہوا تھا۔

''واہ ری سیاست، واہ۔۔۔!''

چند روز قبل عبدالرحمٰن المعروف محسن بھوپالی نے پاکستان کے سیاسی گلیاروں کی اُچھل کود، وہی سیاسی گلیارے جن کی چستی اور پھرتی پر آج کل نہرو جی کی بھپتی زبان زدِ عام ہے:

''میرے دھوتی تبدیل کرنے سے قبل پاکستان کی حکومت بدل جاتی ہے'' پر کیا خوب نشتر زنی کی ہے:

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

☆

ہاں جی۔۔۔!جب سری نگر کے وطن پرستوں کو، تڑتڑ گولیوں سے بھون کر میرے دادا نے سرکار سے پیسے وصول کیے تو فی ساتھی دس، دس روپے دے کر اُن کا منہ بند کر دیا۔جب انہوں نے بقیہ پیسوں کا مطالبہ کیا تو میرے دادا نے پھر سے سہانے خواب دکھانا شروع کر دیئے۔۔۔!

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب دادا کو اندازہ ہو گیا کہ امن وامان تیزی سے قابو میں ہونے کے سبب آزادی کے متوالے آٹا کم ہو رہے ہیں تو کچھ روز بعد میرا دادا رات کی تاریکی میں اپنے ساتھیوں کو جُل دے کر غائب ہو گیا۔

''ایک دن، دو دن، ہفتہ، دو ہفتے گزرنے کے بعد ساتھیوں میں تشویش پیدا ہوئی۔۔۔جائیں تو کہاں جائیں۔۔۔کس سے نور محمد کا پتہ معلوم کریں۔۔۔ گاؤں والوں کی نظروں میں وہ پہلے ہی لاپتہ تھا۔۔۔ان بے چاروں کو تو اپنی شناخت چھپانا مشکل تھی جس کے پاس بھی جاتے پہلے وہ ان کی شناخت پوچھتا۔۔۔کوئی بہار سے تھا۔۔۔کوئی بنگال سے۔۔۔کوئی روہتک سے۔۔۔ تو۔۔۔کوئی منی پور سے۔۔۔اور۔۔۔کئی تو ایسے بھی تھے جو پیدا ہی ڈاکوؤں کے ہاں ہوئے تھے۔۔۔جن کے گھر بار۔۔۔خاندان۔۔۔اور۔۔۔رشتہ داروں کا۔۔۔کوئی۔۔۔اتہ پتہ نہ تھا۔۔۔؟

☆

''اُس پیسے کا کیا بنا جو تیرے دادا نے ہڑپ کیا تھا۔۔۔؟''

''تُو نے سچ کہا تھا۔۔۔تُو۔۔۔ہے۔۔۔ابے۔۔۔پیسے کے لیے ہی تو غائب ہو تھا میرا دادا۔۔۔ظاہر ہے۔۔۔اُسی کے پاس ہوں گے۔۔۔!''

''تیرے خیال میں کتنی رقم ہو گی اندازاً۔۔۔؟''

''ہزاروں سے کیا کم ہو گی۔۔۔!''

''ہزاروں۔۔۔؟''(وجے اور غیاث کے منہ سے ایک ساتھ نکلا)

''آہستہ بولو۔۔۔دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔۔۔!''

''ابے۔۔۔مگر۔۔۔وہ۔۔۔ہزاروں۔۔۔گئے کہاں۔۔۔؟''

''تیری۔۔۔میں۔۔۔؟''

''نا بابا، نا۔۔۔تیرے دادا کی دولت ہے۔۔۔تو ہی رکھ۔۔۔ مناسب جگہ پہ۔۔۔!''(غیاث کا جملہ مکمل ہوتے ہی عمران اس کی طرف لپکا تو دروازے پر، زور زور سے دستک ہونے لگی۔۔۔تینوں چوکنا ہو کر دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے اشاروں، اشاروں میں ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔۔۔عمران نے غیاث کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو اُس نے وجے کو دھکیل دیا، وجے نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو عمران نے اُسے گھور کر دیکھا۔۔۔چار و ناچار۔۔۔دبے قدموں سے عمران خود دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔۔۔!!!)

کرن ڈیسائی سے مکالمہ

ڈاکٹر احمد سہیل
(ریاض)

کرن ڈیسائی ایک مشہور ہندوستانی مصنفہ کی بیٹی ہیں۔ وہ2006 کے بکر پرائز کی فاتح ہیں۔خیر، ہم بات کر رہے ہیں نامور بھارتی ناول نگار کرن ڈیسائی کی۔ وہ 3 ستمبر 1971 کو چندی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال پونے اور ممبئی میں گزارے۔اس نے کیتھیڈرل اور جان کونن اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

احوال زندگی

جب وہ نو سال کی تھیں تو ان کا خاندان دہلی منتقل ہو گیا۔ جب وہ چودہ سال کی ہوئی تو خاندان برطانیہ چلا گیا۔ ایک سال بعد ان کا خاندان امریکہ نقل مکانی کر گیا۔۔کرن ڈیسائی نے اپنی اسکول کی تعلیم میساچوسٹس میں مکمل کی۔انھوں نے بعد میں ہالنس یونیورسٹی اور کولمبیا یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد، اس نے اپنی پہلی کتاب "Hullabaloo in the Guava Orchard " لکھنے کے لیے دوسال کا وقفہ لیا۔

کرن ڈیسائی کے عشق کے معاملات رہے ہیں ان کے بوائے فرینڈ 2006 کے فکشن نگار،اسکریں پلے رائٹر، ماہر تعلیم اور ادبی نوبل انعام یافتہ اورہان پاموک ہیں۔

* کیریئر*

کرن دیسائی کا پہلا ناول، Hullabaloo in the Guava Orchard، 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول کے لیے انھیں کئی ممتاز ہندوستانی مصنفین کی جانب سے بہت زیادہ پذیرائی ملی۔سلمان رشدی جیسی قابل ذکر ہندوستانی شخصیات نے ان کے پہلے ناول، Hullabaloo in the Guava Orchard کی کامیابی پر ان کی تعریف کی۔

کرن ڈیسائی کا پہلا ناول، امرود کے باغات میں ہلابالو، بائیس سے زیادہ ممالک میں متفقہ طور پر شائع ہوا تھا۔اب دیسائی ہمیں شمال مشرقی ہمالیہ کی طرف لے جاتے ہیں جہاں بڑھتی ہوئی شورش پرانے طرز زندگی کو چیلنج کرتی ہے۔کنچن جنگا پہاڑ کے دامن میں ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں ایک بوڑھا جج رہتا ہے جو سکون سے ریٹائر ہونا چاہتا ہے جب اس کی یتیم پوتی سائی اس کی دہلیز پر آتی ہے۔جج کا چیٹی کک اس پر نظر رکھتا ہے،لیکن اس کے خیالات زیادہ تر اپنے بیٹے بجو کے ساتھ ہوتے ہیں، جو نیویارک کے ایک ریستوراں سے دوسرے ریسٹورنٹ میں جاب کرتا ہے، آئی این ایس سے ایک قدم آگے رہنے کی کوشش کرتا ہے، دنیا میں اپنے ملک کے مقام پر غور کرنے پر مجبور ہے۔ جب پہاڑوں میں ایک نیپالی شورش سائی کے اپنے خوبصورت نیپالی ٹیوٹر کے ساتھ نئے ابھرے ہوئے رومانس کو دھمکی دیتی ہے اور ان کی زندگیوں کو افراتفری میں ڈال دیتی ہے،تو وہ بھی اپنے آپس میں ٹکرانے والے مفادات کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔قوم خود لڑتی ہے۔

باورچی نے درجہ بندی کو الٹتے اور ضائع ہوتے دیکھا۔جج کو اپنے ماضی پر نظر ثانی کرنی چاہیے،متضاد خواہشات کی اس گرفت بھری دنیا میں اس کا اپنا کردار—ہر لمحہ امید یا دھوکہ دہی کا امکان ظاہر کرتا ہے۔گہرائی اور جذبات کا ایک ناول، دیسائی کا دوسرا،طویل انتظار والا ناول اس کے پہلے کے ذریعے قائم کیے گئے عظیم وعدے کو پورا کرتا ہے۔

کرن ڈیسائی کی دو(۲) یہ معروف ناولین ہیں:

The Inheritance of Loss	2006
Hullabaloo in the Guava Orchard	1998

کرن ڈیسائی2000 کے بکر پرائز برائے دی ہیریٹینس آف لاس کی فاتح اپنے پہلے ناول، امرود کے باغ میں ہلابالو کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔

سوال: اس کتاب کو لکھنے کے لیے آپ کا عمل کیا تھا-کیا آپ نے کرداروں سے آغاز کیا یا پلاٹ سے؟

جواب: میں نے ایک بہت ہی چھوٹے خیال کے ساتھ شروع کیا، واقعی۔ میں نے ٹائمز آف انڈیا میں ایک کہانی پڑھی تھی اور بہت سے لوگوں سے ایک کردار کے بارے میں سنا تھا، ایک ایسا شخص جو ہندوستان میں ایک بہت مشہور ہجوم تھا جس نے واقعی ایک درخت پر چڑھا تھا، جو کئی سالوں تک ایک درخت پر رہتا تھا، یہاں تک کہ وہ مر گیا وہ پچھلے سال مر گیا، مجھے یقین ہے۔تو میں سوچنے لگی کہ اس طرح کے شخص کے بارے میں کیا بات ہے جو اپنی زندگی درخت پر گزارنے کے مترادف کچھ کرے گا۔تو یہ واقعی اس کردار سے شروع ہوا، اور پھر کہانی اس کے اردگرد بنی۔

جب میں نے اسے لکھنا شروع کیا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کہانی کیا ہوگی۔ مجھے اس سازش کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔اس نے ایک طرح سے رفتار جمع کی اور مجھے اپنے ساتھ کھینچ لیا۔ یہ ایک ناقابل یقین حد تک گندا عمل تھا اور مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بارے میں جانے کا یہ سب سے ہوشیار طریقہ تھا کیونکہ یہ میری پہلی کتاب تھی، اس لیے مجھے خود کو یہ سکھانا پڑا کہ میں اسے کیسے لکھ رہی ہوں، اور میں نہیں جانتی اگر میں اس کے بارے میں صحیح طریقے سے چلی گئی۔لیکن مجھے یقینی طور پر بہت مزہ آیا۔ اگرچہ یہ بہت گڑبڑ تھا-- مجھے بہت سے صفحات باہر پھینکنے پڑے-- تقریباً نصف کتاب جس کے بارے میں میرے خیال میں میں نے ترمیم ختم کر دی تھی۔ایک بار جب میں جانے کے تمام مختلف طریقوں سے واقف ہو گیا تو، تمام سازشیں بدل جاتی ہیں۔

سوال: تو آپ کو کیسے پتہ چلا کہ آپ کا کام ہو گیا، جب کہانی مکمل ہو گئی؟

جواب: مجھے لگتا ہے کہ یہ سب سے مشکل چیز ہے، یہ جاننا کہ آپ کب ختم کر چکے ہیں، کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ آپ ہمیشہ چمکانے اور پالش کرنے اور اس پر کچھ اور کام کر سکتے ہیں۔لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے لگتا ہے کہ میں اس کے اتنا قریب تھا کہ میں اسے مزید دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔اپنے طور پر جاری رکھنے کا کوئی مطلب نہیں تھا، اور اس لیے میں نے آخر کار اسے اپنے ایجنٹ کو دکھایا اور ایک ایڈیٹر سے اس کو اگلے درجے تک لے جانے میں میری مدد کرنا چاہی۔لیکن، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک نقطہ کے بعد آپ کسی چیز کو مکمل کرنے اور اسے پالش کرنے اور اسے بہتر بنانے پر نہیں جا سکتے، کیونکہ آپ اس عمل میں کچھ کھو دیتے ہیں، اس کی تازگی، اور میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ مکمل طور پر کامل نہیں تھا۔ مجھے اسے چھوڑنا پڑا۔یہ کافی تھا- میں اس پر مزید کام نہیں کر سکتا تھا۔یہ ایک توازن ہے؛ اگر آپ ایک چیز کو مکمل کرتے ہیں تو آپ کچھ اور کھو دیتے ہیں، اور یہ وہ مرحلہ ہے جہاں میرے خیال میں آپ کو یہ جاننا ہوگا کہ کب رکنا ہے۔

سوال: آپ کے لیے کون سا کردار یا حصہ لکھنے میں سب سے زیادہ مزہ آیا؟

جواب: یہ یقینی طور پر لکھنے کے لئے ایک تفریحی کتاب تھی۔جب میں اسے لکھ رہی تھی تو میں بہت خوش تھا۔ مجھے تمام کردار بہت پسند آئے، شاید سمپت اور اس کی بہن سب سے زیادہ۔وہ کردار تھے جنہوں نے مجھے خوش کیا، جس نے مجھے ایک طرح سے کہانی کی طرف راغب کیا۔اس کا باقی کام جو مشکل تھا وہ تھا، پیچیدہ پلاٹوں کو متوازن کرنا اور ان کو باہم باندھنا۔یہ مشکل اور کم مزہ تھا۔

سوال: کچھ مصنفین کا کہنا ہے کہ کتاب مکمل ہونے کے بعد ان کے کردار ان میں زندہ رہتے ہیں-- کیا آپ کو اب اپنے کردار یاد آتے ہیں جب آپ نے ان کے بارے میں لکھنا ختم کر دیا ہے؟

جواب: جی ہاں، آپ جانتے ہیں، آپ ان کرداروں کے ساتھ برسوں سے رہتے ہیں اور آپ سیٹنگز میں رہتے ہیں-- میں اس چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی جسے میں نے اتنا لمبا عرصہ بنایا تھا کہ کتاب ختم ہونے پر پہلے تو میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے۔لیکن اب نہیں، اب میرے ذہن میں دوسرے خیالات ہیں۔ میں آگے بڑھ گئی ہوں۔ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے جب میں نے آخری بار اسے دیکھا۔

سوال: کیا آپ اپنی زندگی اور اپنی تعلیم کے بارے میں تھوڑا سا پس منظر بتا سکتی ہیں کہ آپ آج اس مقام پر کیسے پہنچے؟

جواب: میں ہندوستان میں پیدا ہوئی، ہندوستان میں پلی بڑھی، جب میں چودہ سال کی تھی۔تو ہندوستان چھوڑ دیا اور انگلینڈ میں ایک سال گزارا، اور پھر میں ریاستوں میں چلی گئی اور تب سے میں یہاں پڑھ رہی ہوں۔ میں میساچوسٹس میں ہائی اسکول گئی اور پھر ورمونٹ میں انڈر گریجویٹ- بینگٹن میں- اور پھر ورجینیا میں ہولنس نامی ایک تحریری پروگرام میں گئی، جہاں میں نے واقعی یہ کتاب لکھنا شروع کی۔ پھر میں کولمبیا چلی گئی لیکن میں نے کتاب ختم کرنے کے لیے دو سال کی چھٹی لی۔ میں ایک ہی وقت میں اسکول نہیں جا سکتی تھی اور لکھ نہیں سکتی تھی۔ میں رائٹنگ ورکشاپ کے ماحول میں ناول نہیں لکھ سکی۔

سوال: کیا آپ کی تحریر پر آپ کی والدہ کا براہ راست اثر تھا؟

جواب: مجھے یقین ہے کہ ان کا بڑا اثر تھا، کیونکہ میں اپنی ساری زندگی لکھنے، ادب اور کتابوں کے بارے میں اس کی باتیں سن کر بڑی ہوئی ہوں۔جب میں یہ کتاب لکھ رہی تھی، اس سارے عمل کے دوران اس سے بات کرنے کے لیے اس کے ساتھ رہنا بہت اچھا تھا۔وہ پوری چیز میں حیرت انگیز تھی۔یہ ایک بڑا خطرہ مول لینا ہے، اپنی زندگی کے سالوں کو کچھ ایسا کرنے میں گزارنا جس کے بارے میں آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ کیسے نکلے گا، اور وہ اس پورے وقت میں بہت اچھی رہی، جذباتی مدد کی طرح تنقیدی مدد فراہم نہیں کی۔ واقعی ایک بہت ماں والا کردار ہے۔

سوال: آپ کے پسندیدہ مصنفین، یا آپ کے پسندیدہ کاموں میں سے کچھ کون ہیں؟

جواب: میں ہر طرح کی کتابیں پڑھتی ہوں، لیکن مجھے Ichiguru کا کام بہت پسند ہے اور Gabriel Garcia ،Kenzaburo Oe Marquez ،Narayan۔ میری پسندیدہ کتابوں میں سے ایک Pedro Paramo by Juan Rulfo ہے، جسے میں نے بار بار پڑھا۔ میں نے بھی بہت شعر پڑھے۔

سوال: ان دنوں بہت سارے بین الاقوامی مصنفین ریاستہائے متحدہ میں شائع ہو رہے ہیں اور بہت سارے امریکی مصنفین بیرون ملک شائع ہو رہے ہیں- کیا آپ اشاعتی صنعت میں ہونے والی ان پیشرفتوں پر تبصرہ کر سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں، بہت سارے ہندوستانی مصنفین شائع ہو رہے ہیں۔

بقیہ —— انتظار

سمرہ کو روتا دیکھ کر ان کا آٹھ سالہ بیٹا جبران ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولا، دادی آپ یوسف کو مِس کر رہی ہیں۔ ہاں، انہوں نے کہا۔ میں بھی مس کر رہا ہوں۔ ڈیڈی، یوسف کب آئے گا، ہمیں کب تک اُس کا انتظار کرنا ہے۔ خرم نے اپنے باپ سے پوچھا۔ راشد نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ جب تم ہائی سکول ختم کر کے کالج جاؤ گے، یوسف آ جائے گا۔ اتنا لمبا انتظار، معصوم خرم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ دونوں ہاتھوں کو دور تک پھیلا کر بولا۔ سب اس کی اس حرکت پر مسکرا دیئے، معصوم بچے تو انتظار کا مطلب بھی نہیں جانتے۔ وہ نہیں جانتے کہ جب ان کے خونی رشتوں سے یہ کہا جاتا ہے ''انتظار کرو'' تو وہ رشتے کس کرب سے گزرتے ہیں۔

"عظمتوں کا حوالہ"

فبای الاء ربکما تکذبن

ابرار کاشف
(اکولہ، مہاراشٹر)

میرے رب کی مجھ پر عنایت ہوئی
کہوں بھی تو کیسے عبادت ہوئی
حقیقت ہوئی جیسے مجھ پر عیاں
قلم بن گیا ہے خدا کی زباں
مخاطب ہے بندے سے پروردگار
تُو حسنِ چمن تُو ہی رنگ بہار
تُو معراج فن تُو ہی فن کا سنگھار
مصور ہوں میں تُو میرا شاہکار
یہ صبحیں یہ شامیں یہ دن اور رات
یہ رنگین دل کش حسیں کائنات
کہ حور و ملائک و جنات میں
کیا ہے تجھے اشرف المخلوقات
میری عظمتوں کا حوالہ ہے تُو
تُو ہی روشنی ہے اجالا ہے تُو
فرشتوں سے سجدہ بھی کروادیا
کہ تیرے لیے میں کیا نہ کیا
یہ دنیا جہاں یہ بزم آرائیاں
یہ محفل یہ میلے یہ تنہائیاں
فلک کا تجھے شامیانہ دیا
زمیں پر تجھے آب و دانہ دیا
ملے آبشاروں سے بھی حوصلے
پہاڑوں میں تجھ کو دیے راستے
یہ پانی ہوا اور یہ شمس و قمر
یہ موج رواں یہ کنارہ بھنور
یہ شاخوں پہ غنچے چٹکتے ہوئے
فلک پہ ستارے چمکتے ہوئے
یہ سبزے یہ پھولوں بھری کیاریاں
یہ پنچھی یہ اڑتی ہوئی تتلیاں
یہ شعلہ یہ شبنم یہ مٹی یہ سنگ
یہ جھرنوں کے بجتے ہوئے جلترنگ
یہ جھیلوں میں ہنستے ہوئے سے کنول
یہ دھرتی پہ موسم کی لکھی غزل
فبای الاء ربکما تکذبٰن
یہ سردی یہ گرمی یہ بارش یہ دھوپ
یہ چہرہ یہ قد اور یہ رنگ روپ
درندوں و چرندوں پہ قابو دیا
تجھے بھائی دے کر کے بازو دیا
بہن دی تجھے اور شریکِ سفر
یہ رشتے یہ ناطے گھرانہ یہ گھر
کہ اولاد بھی دی دیے والدین
الم ق اور ع غ
یہ عقل و ذہانت شعور و نظر
یہ بستی یہ صحرا یہ خشکی یہ تر
اور اس پر کتابِ ہدایت بھی دی
نبی بھی اُتارے شریعت بھی دی
غرض کہ سبھی کچھ ہے تیرے لیے
بتا کیا کیا تُو نے میرے لیے

○

''احساسِ ذات''

رضیہ اسماعیل
(یوکے)

مجھے ہونے اور نہ ہونے کا
احساس سا ہوتا رہتا ہے
میں جسم کی قید میں نہ ہوتی
تو کیا ہوتی!
کسی من کی مراد میں ہوتی میں
چُوڑی کی کھنک بن جاتی میں
یا۔۔۔
رنگِ حنا میں ڈھل جاتی
ہاتھوں پہ بسیرا کر لیتی
یا۔۔۔
پیار کو حاصل کرنے کی
کسی لب پہ دعا ہو جاتی میں
اب ہوں کہ نہیں، معلوم نہیں
کیا دُکھ ہوں میں یا درد ہوں میں
کسی ویراں آنکھ کا آنسو ہوں
یا جوت ہوں بجھتے دیپک کی
پیاسے ہونٹوں کی سسکی ہوں
یا بپھرے غم کا سمندر ہوں
میں ہوں کہ نہیں یا بے حد ہوں
اب ہونے یا نہ ہونے کا
احساس ہی باقی کوئی نہیں!

○

کتاب اور خلا

الین بوسکی
۔ اردو ترجمہ ۔
نائلہ حبیب
(دوبئی)

آمنے سامنے دو صوفے پڑے ہیں
ایک پر انسان بیٹھا ہے
دوسرے پر خدا براجمان
ان کے درمیان ایک کتاب رکھی ہے
بدن رنگ، لہو رنگ
انسان بڑبڑاتا ہے:
"میں نے ہی تجھے لکھا ہے"
خدا کہتا ہے:
"میں نے ہی تجھے لکھوایا ہے"
ایک لمبے توقف کے بعد
کتاب گویا ہوتی ہے:
"تم دونوں میری ہی صلب سے جنمے ہو"
انسان بن کر، خدا بن کر
برابر سرابر اور نافرمان
کتاب کھلی اور انھیں واپس اپنے اندر سمو لیا
آمنے سامنے دو صوفے پڑے ہیں
انسان سے عاری
اور خدا سے خالی

○

بُزِ اخفش

فیصل عظیم
(کینیڈا)

اخفش!
جس کی حدّت کیا ہوتی ہے
جبرِ کور سماعت کیا ہے
لفظ کی وسعت کیا ہوتی ہے
وحشت کیا ہے؟
اپنی اپنی بولی بولنے والے ریوڑ کے ریوڑ اور گونگا اخفش
کان پڑی آواز سنائی دے تو کس کو!
اس کی آنکھوں میں سب اپنے منظر ڈالتے رہتے ہیں
اس کے کانوں میں سب اپنے منتر ڈالتے رہتے ہیں
اور جب اخفش مر جاتا ہے
تب یہ بزدل، بُز چشم اور بُز گوش
اس کی گردن پر گنبد کو کھول کے دیکھتے ہیں
تو وہ تو پُر ہوتا ہے
اور اس جس کا مارا
جبر کی حدّت سے اپنی دیواروں
تک کو پھونک چکا ہوتا ہے

○

ہمیں چپ رہنا ہوگا

(ایمان زینب مزاری کے لیے)

قمر عباس علوی (کراچی)

ہم نہیں بات کر سکتے
اس لڑکی کے بارے میں
جس کا ریپ اس لیے ہوا
کہ اس کے جسم کے خطوط لباس میں چھپنے سے منکر تھے
ہم نہیں چیلنج کر سکتے
اس فتوے کو
جس کی رو سے زمین میں زلزلے
لڑکیوں کے جینز پہننے سے آتے ہیں
ہم نہیں بول سکتے
ان لوگوں سے متعلق
جنھیں کچل دیا جاتا ہے
محض اقلیت ہونے کی وجہ سے
یا پھر بلاوجہ
ہمیں احتجاج کا حق نہیں
ان جوانوں کے لیے
جن کی مسیں بھیگنے سے پہلے شمالی علاقہ جات جانا پڑا
مبینہ گستاخی کے الزام میں
سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا
یا مار دیا گیا
کسی خاص شناخت پر
ہمیں بھول جانا چاہیے
تباہ ہوتی معیشت کو
مذہب کے سیاسی استعمال کو
یا بڑھتے ہوئے دفاعی بجٹ کو
ہمیں چپ رہنا ہوگا
عہدے میں ترقی کے لیے
راتوں رات امیر ہونے کے لیے
قرعہ اندازی میں ملنے والے پلاٹ کے لیے
اور سب سے پہلے تو
زندہ رہنے کے لیے

بہت ممکن ہے۔۔۔!

کامران غنی صبا

(پٹنہ)

بہت ممکن ہے معصوموں کو قاتل کہہ دیا جائے
بہت ممکن ہے قاتل کو مسیحا چن لیا جائے

بہت ممکن ہے میرا قتل ہو اور میں ہی مجرم ہوں
بہت ممکن ہے میرا گھر جلے اور میں ہی ملزم ہوں

بہت ممکن ہے غداروں کو مسند پر بٹھایا جائے
وفاداروں کو ممکن ہے کہ سولی پر چڑھایا جائے

بہت ممکن ہے آئندہ سے حق گوئی پہ پہرا ہو
بہت ممکن ہے مسند پر جو بیٹھا ہے وہ بہرا ہو

بہت ممکن ہے جو گھر کے محافظ ہیں لٹیرے ہوں
جنہوں نے سانپ پالے ہیں وہ ممکن ہے سپیرے ہوں

بہت ممکن ہے جو خاموش ہیں وہ چیخ اٹھیں اک دن
بہت ممکن ہے وہ جو چیختے ہیں مرمٹیں اک دن

○

ابراج حرم

ساگر ترپاٹھی (ممبئی)

مرکزِ علم و عمل تھا یہی صحرائے بسیط
ہاں یہیں فیضِ نبوت تھا زمانے پر محیط
یہیں باطل پہ ہوا کرتی تھی سچاء کی جیت
تھا ہواؤں میں سدا امن و اماں کا سنگیت
اِک تضاد آہ مگر سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے

وہی ارکان و مناٰسک وہی حج کی تنظیم
چشمِ زم زم و نقشِ قدمِ ابراھیم
اسود و ملتزم و سجدہ گاہِ قوسِ حطیم
سب وہی ہے پہ کہاں سادگیء دورِ قدیم
عہدِ حاضر کی امارت کا بھرم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے

رفعتِ روح کا مظہر تھے یہ روشن مینار
جو ادا کرتے تھے اک لامتناہی کردار
جیسی گھلتے ہوئے ہوں انفس و آفاق کے دوار
آج حائل ہے مگر ایک ستم کی دیوار
دِل میں اک کرب ہے اور صورتِ غم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے

ریت میں اک ذرِ سیّال نکل آیا ہے
اہلِ ستوت پہ تکبر کا گھنا سایہ ہے
تاج اور تخت نے ایمان کو دھندلایا ہے
گنج جذب و عقیدت کا فرومایا ہے
زینتِ ڈالر و دینار و درہم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے

پھر سے اک شعلہ برآمد ہو ضِد و دِرفتہ
وہ افق اپنی گذشتہ وہ عمود و رفتہ
عود کر آئے یہاں خوشبوئے عود رفتہ
پھر نظر آئے وہی شانِ نمودِ رفتہ
ہے یہ حسرت مگر امکان تو کم سامنے ہے
اُٹھیں سجدے سے تو ابراج حرم سامنے ہے

۔ ابیات ۔

بشارت حسین وقار (پاک پتن)

الف

اللہ دا اسمِ اعظم، ساہ ساہ نال پڑھیوے ہو
اس دے رزق نوں کھان توں مگروں، اس دا شکر کریوے ہو
اس دی ذات پسند کر دی اے پورا توں تلیوے ہو
حضرت باہوؒ وانگ بشارت اوسے رنگ رنگیوے ہو

ب

ب ت ث پڑھدے پھردے الفوں سار نہ کائی ہو
اوہ کیہ دیوے نور دلاں نوں جیہڑا آپ شدائی ہو
جیہڑا آپ اے دور خدا توں اوسے نال خدائی ہو
حضرت باہوؒ وانگ بشارت دل دی تار ہلائی ہو

ت

تختی دل پوچ کے بیٹھاں لکھدا اسم الٰہی ہو
کوئی نہیں اس دے باجھ نظر دا، ہر تھاں رب دی شاہی ہو
راہ سدھا اے رب سچے دا رہبر احمدؐ ماہی ہو
حضرت باہوؒ وانگ بشارت، اوسے راہ دی راہی ہو

ث

ثابت ہے دین اسے دا جیہڑا رب دی منے ہو
سچیاں نال عقیدت رکھ لئے حق دے نال نہ کھنے ہو
راہ نہ چھوڑے سچیاں والا جاوے اوسے بنے ہو
حضرت باہوؒ وانگ بشارت، بھول نہ ہرگز بھنے ہو

ج

جدا روح ہو کے تن توں کونج ودی کرلاوے ہو
چھڈ کے سنگت پرانی نوں اوہ کیہڑے پاسے جاوے ہو
جے تن اپنی مرضی کیتی روح کیویں بخشاوے ہو
حضرت باہوؒ وانگ بشارت، روح دے دین سناوے ہو

○

پنجابی گلوکار۔۔۔شبھ دیپ سنگھ سدھو

(سدھو موسے والا)

(داھاڑا جس نوں اتوار ۲۹ مئی ۲۰۲۲ء
اوس دے اپنے پنڈ اچ قتل کر دتا گیا)

نیلما ناہید درانی

(لاہور)

ماں نوں کلیاں چھڈ گیا سدھو
باپو نوں روندا چھڈ گیا سدھو
تیرے ورگا جوان ناں جمیا
آئی جوانی مڑ گیا سدھو
تیرے گیت سنن گے سارے
کاج تو ایسے کر گیا سدھو
ویریاں اوس نوں مار مکایا
ظالماں کولوں مر گیا سدھو
چھوٹی عمرے نام کمایا
نظراں لگیاں مر گیا سدھو

☆

گیت تمہارے بین کریں گے
میرا دل بے چین کریں گے
راگ تڑپ کر باتیں تیری
رو رو کے دِن رین کریں گے

سمیرا سلیم کاجل

(اسلام آباد)

''رومی کے تاعمر شاگرد''

حسن منظر
(کراچی)

عبداللہ جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور آخری کب، ان دوسوالوں کا جواب دینا مجھ پر واجب نہیں۔ زندگی میں اُن سے ملنا تو کجا میں کبھی ان کے پاس تک سے نہیں گزرا۔ نہ کہیں ایسے ادبی جلسے میں شریک تھا جہاں وہ بھی ہوں۔ عبداللہ خاموشی سے میری زندگی کے جھٹ پٹے میں آئے اور چند ہی سالوں میں چلتے بنے۔ خود ان کی زندگی کا سورج بھی ڈھل چکا ہے اس کا احساس مجھے ان کے کسی سے بے کہے سُنے چلے جانے کا سن کر ہوا جو حال ہی کی بات ہے۔ صوفی مزاج تھے۔ ممکن ہے یہ اس کا حصول ہو کہ یہ کام ان سے سوتے میں ہوا ''اُن پے'' کہنا زیادہ درست ہوگا، کسی کو تکلیف نہیں دی۔ ویسے کسی کا ''انتقال کر جانا'' مہمل سہی اب محاورے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

میرا ارادہ ہر باران کے نام کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگانے کا نہیں ہے۔ گو اس سے مراد گستاخی نہیں ہے۔ آخر کہ ادیب، شاعر، محقق اور پروفیسر تھے اور وہ بھی انگلش کے۔ لاکھ ان سے ملاقات خاک کے دو پتلوں کی ملاقات کی حیثیت سے نہ ہوئی ہو دو دوسری دنیا میں انہیں پہچاننے میں مجھے دقّت نہیں ہوگی۔ جہاں بھی نظر آ گئے۔

ایک سرخ سفید، اچھی قامت کا خوبرو دلکش شخصیت کا مالک انسان جس کی باتیں لوگ دلچسپی سے سُن رہے ہیں اسے وہاں کی بھیڑ بھاڑ میں پہچاننا کیا دشوار ہوگا۔

اُن کے بارے میں یہ تفصیل ان کے جونیئر ساتھی پروفیسر مسکین احمد منصور نے مجھے بتا رکھی ہے ان کا ساتھ خیر پور میرس گورنمنٹ کولج میں تین سال رہا۔ وہاں انگلش کے چار اساتذہ میں عبدالرب سے سینئر تھے اور منصور نمبر چار۔ مگر عبداللہ نے گفتگو میں انہیں سب سے اوپر کار بند دے کر ان کا دل ہمیشہ کے لیے جیت لیا۔

عبداللہ طلبا میں بہت مقبول تھے، جیسے اپنے کراچی یونیورسٹی کے طالب علمی کے دور میں جب لیڈری کا شوق بھی رکھتے تھے۔ وہاں ان کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ پروفیسر محمد احسن فاروقی تھے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے جہاں یہ اجزا اکھٹا ہو گئے تھے وہاں کوئی کومیڈی وجود میں نہ آتی۔

عبداللہ کی لیڈری یہ رنگ لائی کہ امتحان کے لیے فورم پُر کرتے وقت ان کی حاضری کم پڑ گئی جسے پورا کرنا ایک طالب علم کے نزدیک ایک شفیق استاد کا فرض ہوتا ہے۔ مگر فاروقی صاحب جیسا کہ سُنا ہے باموقع، بے موقع اڑ جایا کرتے اور اکثر اپنے پاؤں میں کلہاڑی مار بیٹھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ''نہ'' کر دی۔ عبداللہ نے ایک منصوبے کے تحت وائس چانسلر کو درخواست لکھی کہ ''میری حاضری پوری ہے، معاملہ یہ ہے کہ پروفیسر احسن فاروقی اکثر حاضری لینا بھول جاتے ہیں اس لیے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔'' اس میں حاضری لینا بھول جانے والی بات کسی حد تک درست تھی۔

درخواست انہوں نے پروفیسر فاروقی کو دی کہ آگے روانہ کر دیں لیکن درخواست گزار کا منشا وہ نہ بھانپ سکے کہ ڈر کر حاضری پوری کر دیں۔ انہوں نے درخواست کے الفاظ میں تبدیلیاں کر کے انہیں واپس تھمائی اور کہا ''اب اسے وی سی کے سامنے پیش کرو۔'' یعنی اب درست ہے اور درخواست ایسے لکھی جاتی ہے۔ چلیے تھوڑا سا تعارف یہاں پروفیسر احسن فاروقی کا ہو گیا۔

کراچی میں پہلی ملازمت کے بعد عبداللہ جاوید کی عمر کا ایک حصہ اندرون سندھ گزرا تھا اور گورنمنٹ ڈگری کولج خیر پور میرس کی سروس نے جو مکان انہیں بخشا تھا یہ شاید اس کے تنہا باسی تھے اور اس میں بن مانگے جو دولت کے ہاتھ آئی وہ لکڑی کا ایک صندوق تھا۔ کتابوں سے بھرا ہوا۔ سب کی سب دہشت ناک، ہیبت طاری کرنے والی، جاسوسی اور جرائم کی شاہکار، جنہیں یہ وہاں کی دشت کی گرم دوپہروں میں پڑھ کر دن گزارتے تھے۔ پچھلا باسی اپنی ضرورت کو پوری کر کے وہ کتب خانہ ان کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

جن دنوں ہم دونوں نے اپنا تعارف کرایا تھا میں مثنوی مولانا روم کے دو نسخوں میں بیک وقت الجھا ہوا تھا۔ ایک کانپور کا چھپا ہوا میرے دادا سید مہدی حسن کی وراثت، دوسرا مع اردو توضیح (تفسیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا) کے تایا اور خسر سید ہذل الرحمٰن کی عنایت، اور جیسا کہ ہوتا ہے جن افراد کا تعلق ادب سے ہوتا ہے چاہے وہ رتی بھر ہی ہو بات شروع کرنے کے لیے جو موضوع آسانی سے ان کے ہاتھ آتا ہے وہ ہوتا ہے: کہیے کیا پڑھ رہیں آج کل!

اتفاق سے جاوید مولانا رومی کے شیدائی کیا مرید نکلے اور اگلی کتنی ہی ہماری ٹیلی فونک ملاقاتوں پر وہ چھائے رہے۔ مگر میں نے پہلی ہی ملاقات میں بھانپ لیا تھا بات مثنوی کی ستائش تک نہیں رہے گی اس کا رخ تصوف کی طرف ہے۔ انہوں نے مجھے جانچا پھٹکا کہ کس حد تک مذہب کے پانی میں کھڑا ہوں اور بالآخر یہ دیکھ کر کہ یہ شخص اگر شعر نہیں کہتا ہے تو ٹھیک ہی ہے کیوں کہ تصوف کی جگہ پریکٹیکل مذہب کا زیادہ قائل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ موضوع ہماری گفتگو سے غائب ہو گیا۔

دنیا میں آہستہ گو آدمیوں کی کمی نہیں ہے یعنی ایسے جن کے ساتھ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن آہستہ گو اشخاص اگر بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ عبداللہ چال میں جیسے بھی ہوں بولتے سخت سست رفتاری سے تھے۔ ان کے طالبعلموں میں مقبولیت کی ایک وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ ان کا لیکچر پڑھا کر طلبا لفظ بلفظ لکھتے جاتے ہوں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لیکچر کے پورا ہونے سے پہلے پیریڈ پورا ہو جاتا ہوگا مگر ان کی سست گوئی عمر کی دین تھی ورنہ ساری زندگی خوش کلام رہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کھانا کس رفتار سے کھاتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر زور دینے کی طرح ایک ایک نوالے پر زور دیتے ہوئے تو نہیں کہ ساتھ کھانے والا

اپنے کھانے سے نمٹ کران کے نوالے گننے لگے۔لیگوس میں میرے ایک دوست سست گوئی اور سست خوری کا بہترنمونہ تھے لیکن میرے اس گمان سے متفق ہونے نہ ہونے کا حق بھی بیگم جاوید کو ہے وہ ہی انہیں یہ کام کرتا جوانی سے بڑھاپے تک دیکھتی آئی تھیں۔

کینیڈا سے عبداللہ کا فون ہمیشہ خاصے رات گئے آتا تھا۔خود اس اللہ کے بندے نے شاید ہی کبھی یہ کام خود کیا ہو۔اگر میں عرصہ تک ان دونوں کو فون نہ کروں تو اس کا ثواب شہناز خانم عابدی اٹھاتی تھیں اور میرا خیال ہے اپنی باتیں نورمل اسپیڈ (خوش گوئی) سے نمٹا کر وہ ریسیور شوہر کو تھما دیتی تھیں۔جانتی تھیں فون ہاتھ سے گیا تو گیا۔اسے ضعیفی کا عطیہ سمجھا جائے تو درست ہوگا۔

نہ جانے کیوں مجھے ان دونوں سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ہوتا تھا کہ اُس وسیع ملک میں جہاں آبادی کی کمی ہے،خاص طور سے ہماروں کی،اُس ٹھٹھرا دینے والی فضا میں ایک بڑا سا سینٹرلی ہیٹڈ (Centrally Heated) مکان ہے جس میں بات کرنے کو ترسی ہوئی یہ دو ہستیاں ہیں۔۔۔اور مجھے ان کی اس وقت جب میں اونگھ رہا ہوں باتوں سے اکتانا نہیں چاہیے۔ویسے صدیوں سے بسی ہوئی آبادیوں کے تنز بند ہونے سے کتنے ہی گھر ہیں جن میں ماں بیٹی کے فون کا انتظار بیچ رات میں کرتی ہے (اُسے کوئی دوسرا وقت ملتا ہی نہیں ہے) اور بیٹا باپ سے فون پر بات کرنے کی گھڑی کا (کہ ''ابھی سو رہے ہوں گے'') وقت کے کہیں کچھ کہیں کچھ ہونے نے لوگوں کی زندگیوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

تو بات عبداللہ کے بولنے کی رفتار کی ہو رہی تھی۔یہ تو شہناز خانم عابدی ہی بتا سکتی ہیں کہ ضعیفی میں عبداللہ کے الفاظ کے منہ سے باہر آنے اور لقمے اندر جانے کی رفتار میں کوئی مطابقت تھی یا نہیں۔میرا خیال ہے دونوں کاموں کے لیے ان کا مزاج ہمیشہ سے دھیما ہوگا۔جو بڑھاپے میں چوکھا بن گیا۔

ایک موقعے پر ان کا فون اس وقت آیا جب طاہرہ مرحومہ کے ہاتھ کے ہلنے سے اپنا پیٹ بری طرح کھولتی ہوئی کوفی سے جلا بیٹھی تھیں اور ابھی پیالی ان کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھنے اور اونچ پانچ میں مصروف تھا کہ کینیڈا سے فون آ گیا اور حالات کے پیشِ نظر فوراً ہی عبداللہ کی باری میں سُن رہا تھا شہناز مرحوم کے تحیر کو کم کرنے کے لیے ہدایات دے رہی تھیں مگر اس اللہ کے بندے کی حقیقت اور حقیقت سے بڑھ کر اس کی تفصیل جاننے کی جو تحریک تھی وہ کم نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی جلد دوسرے کی پریشانی میں شریک ہو جانا ان کی ہستی کا اہم پہلو تھا۔

پروفیسر منصور کا کہنا ہے جاوید طلباء میں بہت مقبول تھے اور ان کا کہنا ہے دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔تعجب ہے وہ ممبئی میں رہے اور اپنے رنگ، قامت اور جُثے کے باوجود ان حضرات کی نظروں سے چُوکنا گئے جو وہاں اسکرین کے لیے چہرے کیا پورا انسان ڈھونڈا کرتے ہیں اور عبداللہ تو تھے بھی اسی قبیلے اور اسی علاقے کے جہاں کا ان کا ایک اور بھائی تھا۔اتنا ہی سلجھا ہوا، نیک عادات اور صحیح تلفظ کا مالک جو انڈین فلم اسکرین پر نصف صدی سے زیادہ چھایا رہا۔مگر شکر ہے کہ فلم انڈسٹری نے تعلیم کے شعبے کو عبداللہ جاوید سے محروم نہیں کیا۔ معلّمی کی زندگی نے عبداللہ جاوید کو کامل طرح سمیٹ لیا۔طلباء کو تعلیم دینے کے علاوہ وہ اپنی ساری زندگی میں خود کو بھی تعلیم دیتے رہے۔

تمام ادبی اصناف میں اپنی تخلیق سے شامل رہنے کے علاوہ جو قابل رشک کام انہوں نے اردو ادبی دنیا کے لیے کیا وہ ہے ان کا مستند ادیبوں، شاعروں کے کام کا اس طرح جائزہ لینا گویا ان کی اس نوعیت کی تصنیف کو پڑھنے والا اکیلا نہیں پڑھ رہا ہے۔پروفیسر عبداللہ جاوید بھی اس کام میں اس کے شریک ہیں۔آپ بھی پڑھیے، میں بھی پڑھ رہا ہوں۔اب وہ میر تقی میر ہوں، قرۃ العین حیدر یا گارسیا مارکز یا ملن کنڈیرا۔

میرا خیال ہے ان کی ان تصانیف سے کتنوں ہی نے فائدہ اٹھایا ہوگا جن کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ہے ان مشکل نویسوں کو تنقیدی نظر سے کیا، پوری طرح سمجھ کر پڑھ سکیں۔اس کام کے لیے مطالعے، اس کا فہم اور اپنے اوپر اعتماد کی ضرورت تھی اور اردو ادب نے عبداللہ جاوید میں اُسے پورا پورا پایا۔

آخری بات: میرا خیال ہے میر تقی میر سے بھی عبداللہ جاوید بیعت تھے۔ان کا شمار میں اپنے ان تینوں دوستوں میں کرتا ہوں جن سے غالب کو میر سے کم سمجھنے پر ہماری تلواریں کھینچی کھینچی رہ گئیں۔ہر ایک سے میں نے:

غالب کو بُرا کہتے ہوا اچھا نہیں کرتے

کہتے ہوئے تلوار نیام میں ڈال لی۔کیا کرتا، اس معاملے میں خود غالب میرے ہمنوا نہیں ہے۔

دعائے مغفرت کے سوا اور کیا ہے میرے پاس عبداللہ جاوید کے لیے اور شہناز خانم عابدی اور ان کے متعلقین کے لیے تسلی دینے کے چند لفظ۔

لا حول و لا قوۃ

ایک روز داغؔ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور انہیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے، اسی وقت داغؔ نے سلام پھیرا۔ ملازم نے کہا، ''فلاں صاحب آئے تھے واپس چلے گئے۔'' فرمانے لگے۔''دوڑ کر جا، ابھی راستے میں ہوں گے۔'' وہ بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا لایا۔داغؔ نے ان سے پوچھا کہ ''آپ آ کر چلے کیوں گئے؟'' وہ کہنے لگے،''آپ نماز پڑھ رہے تھے، اس لیے میں چلا گیا۔'' داغؔ نے فوراً کہا،''حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا، لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔

○

''ہر تماشے سے دور رہتا ہوں''

فیصل عظیم (کینیڈا)

یہ عبداللہ جاوید صاحب کا وہ مصرع ہے جو اُن کی زبانی میں نے ٹورانٹو کی ایک نشست میں سنا تھا۔ جس زمانے میں، اور جس قدر انھیں دیکھا اور جانا، میں نے انھیں ایک صلح جو، خالص ادب سے کام رکھنے والا، خاموش طبع بزرگ پایا۔ وہ خود کو بھٹکانے اور دھیان بٹانے والی غیر ادبی باتوں سے کوسوں دور رکھتے تھے۔ بلکہ اگر شبہ بھی ہوتا تو ایسے معاملات کو خود سے دور بھگا دیا کرتے تھے۔ ان کے شعر کا یہ مصرع اسی لیے مجھے ان کی شخصیت کے ساتھ ایسا جڑا نظر آتا ہے کہ جب بھی ان کا ذکر کرتا ہوں، یہ مصرع فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔

عبداللہ جاوید صاحب سے میرا ملنا جلنا ادبی محفلوں کی حد تک ہی رہا، لیکن کتابوں، محفلوں، کالموں اور رسالوں کے ذریعے ان کے کالم، افسانے، شاعری اور مضامین سے فیضیاب ہوتا رہا۔ البتہ اس دوران ایک بات ایسی ہوئی جو دل پر نقش ہوگئی۔ اس کا تعلّق ان کے ایک مشورے سے ہے۔ جب میں اپنے والد کے رسالے سہ ماہی ''اقدار'' کے سلسلے کو دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اور اس ارادے کا اظہار مختلف بزرگوں کے سامنے کر کے ان کی رائے جاننا چاہتا تھا، تب کچھ بزرگ ایسے بھی تھے جنھوں نے حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے مجھے اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور عبداللہ جاوید صاحب بھی ان بزرگوں میں سے ایک تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے ایسے براہ راست انداز سے یہ مشورہ دیا تھا کہ اس وقت مجھے کوئی خوشگوار احساس نہیں ہوا مگر وقت گزرنے کے ساتھ، چیزیں سمجھ میں آتی گئیں اور نہ صرف میں ان کا قائل ہوتا گیا بلکہ ان کی عزّت دل میں اور بڑھ گئی کیوں کہ ان کا مشورہ برحق تھا۔ اگر میں اس وقت اپنے وسائل اور وقت کی مناسبت سے وہ کام شروع کر بھی دیتا تو شاید اس کام کا حق ادا نہ کر پاتا اور ان کا بھی یہی خیال تھا کہ میں ابھی یہ کام نہ کروں تو بہتر ہے۔ تو بات یہ ہے کہ کسی کو بے لاگ، بغیر کسی لگی لپٹی کے صحیح مشورہ دینا ہی خلوص کی نشاندہی کرتا ہے اور بے شک یہی خیر خواہی کا تقاضہ بھی ہے۔ مختصراً یہ کہ میں نے انھیں ہمیشہ صاف اور کھری بات کرنے والا پایا۔

عبداللہ جاوید صاحب کی شخصیت کے طرح ان کی گفتگو میں بھی بعض اوقات ایسی بے ساختگی نظر آتی تھی کہ آپ اس سے سرسری گزر نہیں سکتے۔ ہم عموماً کسی نہایت عام لفظ کو عامیانہ سمجھ کر استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن جب کوئی اچانک ایسے لفظ کو برمحل استعمال کر جائے تو احساس ہوتا ہے کہ لفظ کے صحیح استعمال کا ذوق کتنی بڑی نعمت ہے۔ یونہی ایک بار ایک محفل میں گفتگو کے دوران وہ دو ادیبوں کے معاملات پر بات کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ''پھر ان لوگوں کی کٹّی ہوگئی۔۔۔'' اور ہم سب اس پر ہنس پڑے مگر بات پوری طرح واضح ہوگئی۔ یہ تو ایک بات ایسے ہی یاد آگئی مگر ایسے بہت سے واقعات ہوتے رہے جو اب یاد نہیں۔

یہ سادگی اور بے ساختگی کا عنصر گفتگو کی طرح ان کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ فطرت کے مظاہر، پیڑ، پھول، کانٹے اور ان عناصر کا مشاہدہ ان کی نثر میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے اور نظم میں بھی۔ اور ان سب کے ساتھ جو موضوع ان کے افکار پہ چھایا نظر آتا ہے وہ ہے آدمی کی تخلیق، کائنات میں اس کا مقام اور سرگزشت۔ ان کے ہاں ہست و بود کے بارے میں تفکّر بار بار ملتا ہے، اس حوالے سے وہ اپنے نظریے کا کھل کر اظہار بھی کرتے ہیں اور وجود اور عدم سے ماورا ہو کر، کائنات سے انسان کے تعلّق اور ''کل'' کا حصہ ہونے کے زاویہ نظر کو بھی تحریروں میں لاتے ہیں اور اس حوالے سے روایتی تصوّرات سے ہٹ کر بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات ان کا فکری زاویہ، مکانی بندشوں سے آزاد ہو کر ان کے تخلیقی عمل کا جزو بنتا نظر آتا ہے۔

عبداللہ جاوید صاحب کی تحریریں مطالعے کی وسعت اور گہرائی کی شہادت دیتی ہیں۔ ان کی نگارشات میں ''تاریخ کے پھول نما کانٹوں'' (یہ اصطلاح انھوں نے کہاں استعمال کی تھی، اب یاد نہیں) کی نشاندہی استعارات اور تشبیہات کے علاوہ بھی خاصہ کھل کر ہوتی ہے۔ قلوپطرہ، بالخصوص اور ایسے دوسرے کردار بالعموم، ان کے ہاں گہری معنویت لیے ہوئے ہیں۔ عبداللہ جاوید درویش صفت شخصیت کے مالک تھے۔ آنکھوں کی تہذیب سے لے کر قلم کی نوک سے جاری لفظوں کے سلسلے تک، جو کہیں خود کلامی کا احساس دلاتا ہے تو کہیں تاریخ، کائنات اور ذات کے پردوں کی سمت اشارہ کر کے قاری کو ان سمتوں میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے، ان کی شخصیت کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ محض مشاہدہ یا مضمون کا پیٹ بھرنے کے لیے روایتی لفّاظی نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے آپ کو تصوّف سے جڑا گردانتے تھے۔ یعنی یہ ان کا شعوری فیصلہ بھی تھا۔ سو جن ہستیوں سے وہ خود کو متاثر سمجھتے تھے ان میں دیگر کے ساتھ مولانائے روم کا ذکر بھی بطورِ خاص کرتے تھے۔ ان کی رشحاتِ قلم سے تصوّف کا مریضانہ تاثر نہیں ملتا بلکہ جیتی جاگتی دنیا میں سانس لیتا تصوّف ان کی تحریروں کا جزو ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ مولانا رومی کا ذکر کر کے قرونِ وسطیٰ کے اسیر نہیں ہوگئے بلکہ انھوں نے زمانہ حاضر میں چل پھر کر کردار تراشے اور یہی وجہ ہے کہ تصوّف کو اپنا موضوع مان کر بھی مشرقی اور مغربی ادب اور زندگی، دونوں ان کے پیشِ نظر رہے۔

یہاں میں بات کو سمیٹتے ہوئے ان کے افسانے ''دخترِ آب'' کا ذکر کروں گا جو میرے خیال میں ادب اور ادیب کے بارے میں ان کے نظریے کا خلاصہ ہے۔ اس افسانے کا ہیرو، ایک مصوّر ہے جو سمندر سے مسحور ہوتا ہے اور اس میں کسی جل پری جیسی شے کو دیکھتا ہے۔ وہ اس کی تصویر بناتا ہے اور بالآخر اسے پانے کے لیے سمندر کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ شے، خیال، الہام یا تخلیقی تحریک، جو افسانے کے اختتام پر اس کے فنّی شاہکار میں ڈھل جاتی ہے، وہ مرنے کے بعد اس کو پالیتا ہے، اس صورت میں کہ موت کے بعد اسی فن پارے کے حوالے سے اس مصوّر کے فن کی عظمت کا بھرپور اعتراف کیا جاتا ہے۔ عبداللہ جاوید صاحب بھی اپنی تحریروں کی صورت میں شاید اسی مصوّر کی طرح کچھ تصویریں بنا کر چھوڑ جانا چاہتے تھے، اس یقین کے ساتھ کہ کوئی ان تصویروں کے رنگوں، خطوط اور زاویوں کو اس نظر سے ضرور دیکھے گا جس نظر سے وہ دیکھتے اور دکھانا چاہتے تھے۔

'یہ قصہ کیا ہے معنی کا'

جمیل احمد عدیل
(گوجرانوالہ)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی تازہ تصنیف: ''یہ قصہ کیا ہے معنی کا'' ان کے متفرق تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں روایتی تقسیم کے مطابق نظری اور عملی دونوں انواع کی تنقیدات موجود ہیں۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے ان کا ایک مضمون بھی ایسا نہیں جو فکری جہات سے تہی ہو اور رسمی و متداول اظہار کا ترجمان ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا طغرائے امتیاز ہی متن کو مختلف بصارت سے دیکھ کر نئی بصیرت کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے عباراتی متن سے لے کر زیست کے متن تک ہر مظہر کے لیے الگ نظر مختص کرنے کا سدا اہتمام کیا یوں موخر الذکر طرف نے انھیں ایسا فلکشن عطا کیا جس میں مروج افکار کی پرچھائیں بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی اور تنقید میں بھی ان کے وضع کردہ نفی اثبات اپنے جدا سروکار ہمراہ رکھتے ہیں۔ اردو تنقید نے جن چند صاحبان امعان کی وساطت سے نئے مباحث کو موضوع بنایا ہے، ان میں جناب ناصر عباس نیر کا نام غیر معمولی امتیاز کا مالک ہے!

مذکورہ کتاب میں شامل بعض تحاریر کے اقتباسات اور بعض مکمل آرٹیکلز چھوٹی اسکرین یا ادبی جراید کے توسط سے پڑھنے کا موقع ملا۔۔۔ لیکن آپ جانتے ہیں اس نوع کی خواندگی 'کورٹ شپ' جیسی جاذب تو ہوتی ہے مگر یہ ارتباط عارضی ثابت ہوتا ہے، یوں جلد تحلیل ہو جاتا ہے۔ اب سرخ سرورق کی کشش میں لپٹے یہ تمام مشتملات یکجا ہو کر، اپنے پورے وجود کے ساتھ ملکیت میں آئے ہیں تو یکسوئی سے ان کی قرات بے بدل لطف سے ہمکنار کر رہی ہے۔

مصنف کے پہلے مضمون 'مطالعہ کیسے کریں؟' کو اگر کتاب کا باقاعدہ مقدمہ قرار دیا جائے تو بے جواز نہ ہوگا۔ فکری ثروت نے اس تحریر کی یوں تجمیل کی ہے کہ قاری 'اپنی' رضا سے اس منور منہاج پر گام زن ہو جاتا ہے جو دراصل مصنف کی مرضی تھی۔۔۔ البتہ لکھنے والے نے بار بار اس نقطہء مرکزیہ کو باور کرانا چاہا ہے کہ ادبی دنیا میں بھی 'احبار و رہبان' ہوا کرتے ہیں جن کی جملہ شعوری کاوشیں معانی کے تعینات کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھتی ہیں۔ واقعتاً یہ صحیح ہے اس حساس صورت حال پر 'سمجھوتا' نہیں ہو سکتا کہ اگر ہر فرد معنی کی عینی رویت پر اکتفا کرنے لگ گیا تو 'رویت ہلال کمیٹی' کی مرکزیت ایک دم خطرے میں پڑ جائے گی! سماج کی عنان کو مقتدر طبقے کس دانائی کے ساتھ ہاتھ میں رکھتے ہیں؟ یہ جاننا ہو تو متذکرہ قیمتی مضمون سے فاصلہ خسارے کا سودا ثابت ہوگا! یہاں صرف دو ایک جملے نقل کیے جاتے ہیں تا کہ مصنف کے تیور دیکھے جائیں وہ کن اعماق سے کلام کرنے کا خوگر ہے:

''پرانے اور نئے کے تضاد کو حل نہ کر سکنے میں ناکامی کا احساس ہے؛ پرانے متن سے جذباتی وابستگی، نئے متن کا خوف پیدا کرتی ہے۔''

''جب کوئی شخص کسی متن کے استبدادی انداز میں معنی متعین کرتا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی اور متن پر انحصار کر رہا ہوتا ہے۔''

''وصل بھی دو طرفہ کیف کا تجربہ ہے؛ اگر یک طرفہ ہو تو اس میں سادیت یا مساکیت سے ملنے والی منفی سرشاری ہوتی ہے۔ کچھ یہی صورت متن کے مطالعے میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔''

اب یہ ہے وہ جادہ جس میں انفراد اپنی حیران کن توانائی کے ساتھ متکلم ہو رہا ہے کہ قاری 'غیبی رہنمائی' پر قانع ہو کر غنودگی کے عالم میں نہ رہے۔ یہ سچ ہے کہ لمبے روٹس پہ چلنے والے مشاق ٹرک ڈرائیور سوتے ہوئے نہ صرف ڈرائیونگ کرتے ہیں بل کہ ہر حادثے سے بھی مامون رہتے ہیں۔ سالخوردہ قارئین بھی حالت نوم میں مطالعہ کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی خوابیدگی کو بہت ہی مضبوط حصار میسر ہوتا ہے۔ انھیں خوب خبر ہوتی ہے کہ نہ زبان کا کوئی نیا موڑ آئے گا نہ کسی نئے نظریے کی کوئی رکاوٹ درپیش ہوگی، یوں وہ 'یونیفارم ولاسیٹی' کے ساتھ ان گنت کتب پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تحفظ انھیں یوں بھی حاصل ہوتا ہے کہ مصنفین نے بھی ایسے ہی 'حصن حصین' میں بیٹھ کر انھیں قلمبند کیا ہوتا ہے۔ ناصر صاحب نے یہ احساس دلایا ہے کہ: سماجی، ثقافتی، مذہبی، سیاسی، لسانی آموختے سب مل کر خواننده کی رہبری کرتے ہیں۔۔۔۔ بھائی تم کبھی ان پاسبانوں کو ایک طرف رکھ کر خود کو 'تنہا' کرنے کا تجربہ بھی کرو! لیکن یہ مقام مشکل اس لیے ہوگا کہ گھٹی میں پڑے ہوئے سے دستبردار ہو کر نئے سرے سے سیکھنا ہوگا! جس کے خیال میں غیب سے مضامیں آنے کی 'خودکار' سہولت موجود ہو وہ بھلا اکتساب کی مشقت کیوں کر قبول کرنے لگا!!

زیر نظر کتاب میں ایک چونکا دینے والی تحریر اکرام اللہ کے ناول: ''گرگ شب'' کا مطالعہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس ناول کی عام شہرت اس پر لگنے والی وہ پابندی ہے جو ضیا آمریت کے شاخسانوں میں سے ایک ہے۔ اسی شوق میں یہ ناول اسی کی دہائی میں پڑھا اور عین عنفوان شباب ہونے کے باوجود یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے، آخر ان چند سطور میں کون سی 'فحاشی' قیامت بن گئی تھی کہ ارباب بست و کشاد کی نیندیں اڑنے لگی ہیں! اب کوئی چونتیس برس کے بعد اشاعت ثانی کی نوبت آئی تو از سر نو مطالعے نے ان سطور کو اور بھی 'بے ضرر' دکھایا۔ ناصر عباس نیر صاحب نے خاصی گہرائی میں جا کر کے اس ناول کا تجزیہ رقم کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ آمریت محض راست مخالفت یا اپنے جواز پر صاف لفظوں میں اٹھائے گئے سوال پر سیخ پا نہیں ہوتی، وہ ہر اس اظہار سے خوف زدہ ہوتی ہے جس میں انسانی سائیکی کی گہرائیوں اور سماجی ساختوں کے درمیان تصادم کو پیش کیا گیا ہو۔ تجزیہ نگار نے صراحت کے ساتھ یہ نکتہ جزو شعور بنا دیا ہے کہ آمریت سطحیت، وحدانی طرز فکر، فراموشی اور حافظے کی کمشدگی کو پسند کرتی ہے۔۔۔ اور ناول کا مرکزی کردار اپنے خوف ناک ذاتی المیے کی نسبت سے چونکہ 'طے شدہ' جوابات والے سوالات کے Hazardous zone میں قدم دھرتا ہے، اس لیے ماتھوں پہ بل پڑے۔۔۔ ویسے یہ سوچ بھی آئی کہ یہ آمر عام طور پر پر بہائم سے ہوتے ہیں، کیا اتنی باریکی میں وہ معاملات کو دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ تو فی

الاصل ان کا 'تھنک ٹینک' بہت اہم ہوتا ہے جو ان کی رہبری کرتا ہے وگرنہ یہ گیارہ گیارہ سال مسلط نہ رہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کو پارسال صادق وویمن یونیورسٹی بہاولپور میں: 'تانیثیت اور ادبی صورت حال' کے موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ انھوں نے اس پر مغز خطبے کو 'تانیثیت کی چوتھی لہر' کے عنوان سے شامل تصنیف کیا ہے۔

'قضیہء زن' دنیا بھر کے سماجی دانشوروں کا مرغوب موضوع ہے۔ اس پس منظر میں شاید 'کلیہ سازی' کی معصوم تمنا نے دھاگوں کو زیادہ الجھا دیا ہے وگرنہ احوال کا معتدبہ حصہ سرعت کے ساتھ اپنی صورت تبدیل کر لیتا ہے۔ یوں اس پر کوئی حکم لگایا جانا بے حد مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر ایمائیت سے متصف ہے۔ ان کا بلاواسطہ تخاطب چونکہ خواتین کی طرف تھا اس لیے قدرے رمزیہ اسلوب کو وہ ہنرمندی سے بروئے کار لائے ہیں: ''صرف مرد ہی، آفت رسیدہ عورت کو اپنی آفت کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ کئی عورتیں بھی یہ نیک کام کرتی ہیں۔'' اس خطبے میں انھوں نے نسائیت (femininity) اور تانیثیت (feminism) میں حد فاصل قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ مغربی سوسائیٹی میں یہ شعور موجود ہے لیکن ہمارے ہاں اس فرق کو نظر انداز کرنے سے خلط مبحث ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک طرف عورت اپنی نسائیت پر نازاں ہے، دوسری طرف وہ مرد کی برابری کا مطالبہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر نے اردو ادب کو 'عورت تانیثی نقاد' سے خالی پا کر بھی بجا طور پر اچنبھے کا اظہار کیا ہے۔ اس مقالے کی تفہیم بہت سارے concepts کو کلیئر کر سکتی ہے۔

اس مجموعے کا آخری مضمون: ''اردو زبان و ادب پر دوسرے خطوں کے اثرات'' بھی کافی فکر افروز۔۔۔ یہاں مصنف کا تحقیقی ذوق معروضیت کے پیرہن کو بنیادی اہمیت دیے ہوئے ہے۔ اگرچہ اردو کے لسانی ارتقا کے تعلق میں بھی کسی موقف کی 'الہامی' حیثیت نہیں ہے۔ متبائن نظریات محققین کے ہاں متواتر چلے آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں 'معنی کا قصہ' بھلے ہی اضافیت کو رہنما کرے لیکن اس اصول کی نفی بہت دشوار ہے کہ فریقین جب براہین کی اساس پر فیصلے کے طالب ہوں تو وہ 'مشترکہ منطق' پر متفق ہونا ناگزیر جانتے ہیں۔ اس تناظر میں یہ غلط فہمی بھی دور ہونی چاہیے کہ مختلف معنی سب جڑیں کاٹ کر اپنا وجود منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کرتا۔۔۔ اردو زبان کیا صرف دوسری السنہ کے تال میل کا رشحہ و ماحصل ہے؟ یا اس کی نشوونما بھی دیگر زبانوں کی طرح 'فطری' انداز میں ہوئی ہے؟ ناصر عباس صاحب نے ہر جذباتیت کو منہا کر کے اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان 'خالص' نہیں ہے۔ اگر زبان بولنے والے: سماجی، علمی، ادبی اور معاشی مقتضیات کے تحت ایک دوسرے کے قریب آئیں گے تو الفاظ کے تبادلے کو روکا نہیں جا سکتا۔ مذکورہ پہلو سے انھوں نے اس 'آسانی' کے لیے بھی گنجایش پیدا کرنا چاہی ہے کہ جب کوئی لفظ 'قبول' کر لیا جائے تو اس کے 'اصل' نحوی نظام پر مصر ہونا/ رہنا عصبیت کا باعث بنتا ہے۔۔۔ انھوں نے پنڈت کیفی دتاتریہ کو quote کرتے ہوئے 'تاریدْ' کے عمل کو اصولی درجہ دیا ہے۔ یعنی جس لفظ کو اپنا لیا گیا ہے وہ اردو قواعد کے ماتحت ہو گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اس قلادے سے بھی گلوخلاصی کرا دی ہے کہ کس کس زبان کے الفاظ تراکیب کی مناکحت کے پابند ہیں اور کہاں کہاں یہ عمل 'ماورائے نکاح' قرار پاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مرکب سازی میں عربی فارسی کا بندھن تو جائز، ہندی کی شمولیت 'غیر محرم'! کم از کم اس عاجز نے یہ معلوم کر کے ریلیف لیا ہے کہ 'لسانی شریعت' کو اس قدر اشرافیہ کے لیے مخصوص نہ کیا جائے کہ کچھ زبانیں شودر بنا دی جائیں۔۔۔ اور یہ نکتہ بہت قابل غور ہے کہ کسی غیر تہذیب، ثقافت، زبان کی غلامی پر تو فخر کیا جائے اور یہی کچھ مقامی ہو تو اسے کہتر، اچھوت گردانا جائے۔۔۔ ناصر صاحب نے محولہ مبحث میں ادبی زبان اور عوامی زبان کے بیچ نزاکت اور تفاوت پر بہت ہی لطیف گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون جس طرح جانبداری کی نفی کرتا ہے، وہ بہت اپیلنگ ہے، تنقید معنی کا قصہ سناتے ہوئے دردلکشا سے فیض یاب کرے تو اذہان کو بالیدگی ملتی ہے۔

صاحبو! یہ کتاب ایک آدھ دن پہلے ہی ہمیں ملی ہے؛ مطالعہ جاری ہے؛ ایسی نادر کتب کھب کر پڑھنے کی متقاضی ہوا کرتی ہیں؛ سو، اس کے مندرجات پر گفتگو تسلسل مانگتی ہے؛ یوں بات ہوتی رہے گی!

سردست آخر میں یہ کہنا ہے کہ موضوعات میں موثر علمی و فکری ارتفاع کی بابت تو کوئی دوسری رائے ممکن نہیں، ہم تو اسلوب بیان میں بھی برابر اسیر ہوئے جا رہے ہیں۔ مصنف ہی کے 'زیر اثر' کہہ لیتے ہیں کہ یہاں بھی وہب سے زیادہ مشق و مزاولت کا کرشمہ ہے کہ روانی کے جادو کو زک پہنچائے بغیر وہ ہر جملے کی جمالیات کو قائم رکھنے میں بامراد ٹھیرے ہیں! کہیں پڑھا تھا mazurka پولینڈ کا تین تالوں کا رقص ہے جو عموماً چنچل اور تیز ہوتا ہے۔ مصنف نے: موضوعاتی ندرت، فکری جدت اور در و بست کی لطافت کو پیہم قائم رکھتے ہوئے قاری کی نظر شوق کو ان تینوں 'تالوں' پر ہر لحظہ مرکوز رہنے کے لیے پابند کر لیا ہے!!!

اختر شیرانی

پروفیسر صاحب اپنی کلاس میں اختر شیرانی کی ایک نظم پڑھا رہے تھے۔ جس میں شاعر نے کہا تھا کہ اس کی محبوبہ کی بھیگی ہوئی زلفوں سے ٹپکنے والی پانی کی ایک بوند میں اتنا نشہ ہے کہ اگر کوئی اسے پی لے تو زندگی بھر مدہوش رہے۔

ایک شاگرد نے اٹھ کر کہا کہ "سر اگر پانی کی اس بوند کے ساتھ جوئیں بھی آ گئیں تو۔۔۔؟

"پروفیسر صاحب نے کہا۔ "بات آپ کی محبوبہ کی نہیں، اختر شیرانی کی محبوبہ کی ہے۔"

ایک صدی کا قصّہ

شمشاد بیگم

دیپک کنول (ممبئی)

جلیانوالہ کے قتل عام کے ایک دن بعد یعنی 14 اپریل 1919 کو لاہور میں ایک قدامت پسند پنجابی جاٹ مسلم پریوار کے گھر ایک بچی نے جنم لیا۔ یہ اُن کی آٹھویں اولاد تھی۔ باپ حسین بخش مان ایک میکنک تھا اور بڑی مشکل سے اپنے پریوار کی کفالت کر رہا تھا۔ پریوار بھی بھرا پرا تھا۔ یہ سب لوگ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے۔ مرد عورت سب مذہبی تھے۔ سوائے ایک فرد کے جو حسین بخش کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ موسیقی کا دیوانہ تھا۔ جس بچی نے اس گھر میں جنم لیا تھا اُس کا نام اُنہوں نے شمشاد رکھا یعنی ایک لمبا خوبصورت درخت۔

جب وہ اسکول جانے لگی تو ایک دن اُسکی پرنسپل نے اُسکی آواز سنی۔ وہ اُس کی آواز کی کھنک سے اسقدر متاثر ہوئی کہ اُسے کلاس روم کی صبح کی دعا پڑھنے کے لئے ہیڈ سنگر بنایا گیا۔ جب وہ دس سال کی ہوئی تو وہ مذہبی تقریبات میں یا شادی بیاہ کے موقعوں پر گانے لگی۔ اُسنے موسیقی کی کوئی تعلیم نہیں لی۔ اُسے گانے کا جنون تھا۔ اس جنون کا محرک کندن لال سہگل تھا جس کے گانے سن کر وہ اس قدر دیوانی ہوگئی تھی کہ گھر والوں سے چھپ کر وہ کے ایل سہگل کی فلم ''دیوداس'' دیکھا کرتی تھی۔ اُس نے یہ فلم چودہ مرتبہ دیکھی۔ بالم آئے بسو میرے من میں' 'ایسا گانا تھا جسے وہ بار بار سننا چاہتی تھی۔ وہ اُسی کی طرح گانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسکی دادی کو اپنی پوتی کی گائیکی بالکل پسند نہ تھی۔ باپ تو کٹر مخالف تھا۔ اُن دنوں گائیکی کو عزت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ موسیقی کو میراثیوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ کوئی بھی عزت دار خاندان اپنے بچوں کو اس پیشے کو اپنانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ شمشاد کی ضد تھی کہ وہ گلوکارہ بننا چاہتی ہے۔ اُس کے جنون کو اُس کے چاچا نے سمجھا جس کا نام عامر خان تھا جس کا میں پہلے ہی زکر کر چکا ہوں جو خود موسیقی کا دلدادہ تھا۔ وہ بڑے چاؤ سے غزلیں اور قوالیاں سنا کرتا تھا۔ اُسنے اُس کا حوصلہ بڑھایا اور اُسنے اپنے بھائی کو اس بات کے لئے قائل کر لیا کہ وہ اسے گانے سے نہ روکے۔ وہ محرم کے دوراں نعتیہ کلام گانے لگی اور اُسے ہر نعت کے لئے ایک پیسہ ملتا تھا جس سے اُس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ ایک دن اُس کا چاچا چوری چھپے اُسے رینا فون گراما فون کمپنی میں آڈیشن کے لئے لے گیا۔ یہ آڈیشن موسیقار غلام حیدر کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ شمشاد نے بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل ''میرا یار مجھے ملے اگر'' گا کر غلام حیدر کو اس قدر متاثر کر دیا کہ اُس نے بارہ گانوں کے لئے اُس کا معاہدہ تیار کروالیا۔ اب مسلہ یہ تھا کہ اُس کے باپ کو کون منائے۔ یہ کام اُس کے چاچا نے کیا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح اپنے بھائی میاں حسین بخش کو منا لیا۔ بھائی نے یہ شرط رکھی کہ وہ بے شک ریکارڈنگ کے لئے جائے مگر وہ برقعہ پہن کے جائے گی اور کسی کو بھی اپنی تصویر لینے کی اجازت نہیں دے گی۔ شمشاد نے دونوں شرطیں مان لیں اور اس طرح وہ ریکارڈنگ پر چلی گئی۔ اُسے میوزک کمپنی کی طرف سے فی گانا پندرہ روپے ملے اور بارہ گانوں کی ریکارڈنگ پوری ہونے پر اُسے معاوضے کے علاوہ پانچ سو روپے بطور انعام ملے۔ رینا گراما فون کمپنی ایک معتبر اور مقبول میوزک کمپنی تھی جس میں بہت ہی گُنی لوگ کام کرتے تھے۔ چونکہ شمشاد نے موسیقی کی کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی اسلئے ماسٹر غلام حیدر نے اپنے تلمذ میں لے کر اُسے راگ راگنیوں سے آشنا کرا دیا۔

جونہی اُس کے گانے میں بازار میں آئے تو اُسے مقبولیت ملنے لگی۔ اُس کی مقبولیت دیکھ کر آل انڈیا ریڈیو پشاور اور لاہور سے اُسے گانے کی پیشکش ہوئی۔ فلمساز ایم دلسکھ پنچولی جو کہ فلمسازی کے میدان میں ایک معتبر نام تھا۔ یہ وہی دلسکھ پنچولی تھا جس نے نور جہاں اور پران کو پہلا بریک دیا تھا۔ اُس نے جب شمشاد کی آواز سنی تو وہ بھی اس آواز کے سحر میں ڈوب گیا۔ اُس نے شمشاد کو گانے کے علاوہ فلم میں اداکاری کرنے کی پیشکش بھی کی۔ شمشاد کی دلی مراد بر آئی۔ اُس نے فوراً اسکرین ٹیسٹ دیا اور وہ ٹیسٹ میں پاس ہوگئی۔ جب اُس کے گھر والوں کو یہ خبر ملی کہ وہ فلم میں اداکاری کرے گی تو گھر میں طوفان مچ گیا۔ باپ نے اُسے بلا کر تہدیدی انداز میں کہہ دیا کہ اگر اُس نے فلموں میں اداکاری کی تو اُسے گانا گانے کی بھی اجازت نہیں ملے گی۔ شمشاد گائے بنا جی نہیں سکتی تھی اس لئے اُس نے اپنے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ کبھی بھی فلمی کیمرہ کے سامنے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرے گی۔ وہ بدستور ریڈیو کے لئے گاتی رہی۔

آل انڈیا لاہور نے اُسکے گانے بار بار بجا کر اُس کی مقبولیت میں خاصا اضافہ کر دیا۔ سارنگی نواز اُستاد حسین بخشوالے صاحب نے اُس کی آواز میں مزید نکھار لانے کے لئے اُسے اپنی شاگردی میں لیا اور اس طرح اُس کی آواز کو جلا ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نور جہاں، گیتا دت، امیر بائی کرناٹکی، راجکماری، ثریا، مبارک بیگم اور سدھا ملہوترہ کی طوطی بولتی تھی۔

1932 کا سال تھا جب شمشاد کی ملاقات اپنے ہی پڑوس میں رہنے والے ایک نوجوان سے ہوئی جس کا نام گپت لال بٹو تھا جو کہ قانون کی پڑھائی کر رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار کیا ہوئیں کہ دل میں محبت کے پھول کھل گئے۔ گپت لال شمشاد سے عمر میں چند سال بڑا تھا جب کہ شمشاد کی عمر اُس وقت صرف تیرہ سال تھی۔ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچوں کی شادیاں کم عمری میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ شمشاد کے گھر والے بھی لڑکے کی تلاش میں تھے۔ وہ بھی شمشاد کو ٹھکانے لگانا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ بیل منڈھے چڑھ جاتی اُنہیں ایسی دل شکن خبر ملی جس سے اُن کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ گھر میں جیسے بھونچال آ گیا۔ گپت لال ہندو تھا جب کہ شمشاد مسلم تھی۔ دونوں کا

ملن ممکن ہی نہیں تھا۔صرف ایک طرف سے نہیں بلکہ دونوں اطراف سے اس رشتے کے خلاف تلواریں کھینچ گئیں۔شمشاد کے گھر والے ہی نہیں گپت لال کے گھر والے بھی اس رشتے کے خلاف تھے۔گھر والوں کی مخالفت سے ان دو پیار کرنے والوں کے نہ حوصلے پست ہوئے اور نہ ہی سماج کے ڈر سے اُن کے ارادے متزلزل ہوئے۔اُن کے ارادے اٹل تھے۔اُنہوں نے جیسے ٹھان لی تھی کہ دنیا چاہے ادھر سے اُدھر ہو جائے وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گے۔اُن کے پیار میں اس قدر شدت اور جنون تھا کہ لاکھ دھمکیوں کے باوجود اُنہوں نے سماج کے ڈر سے اپنی محبت کا خون ہونے نہیں دیا۔وہ اتنے نڈر ثابت ہوئے کہ وہ کسی بھی مخالفت کی پرواہ کئے بنا 1934 میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔اُن کی ایک بیٹی ہوئی جس کا نام اُنہوں نے اوشا رکھا۔اُسے بڑے نازوں سے پالا گیا۔

ماسٹر غلام حیدر شمشاد کی آواز کا شیدائی تھا۔اُس نے جب اپنی پنجابی فلم ''بیلا جٹ'' کی موسیقی پر کام کرنا شروع کیا تو اُس نے نور جہاں کے ساتھ شمشاد بیگم سے بھی اس فلم کے لئے گانے گوائے۔شمشاد کے لئے یہ پہلی فلم تھی۔کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس فلم کا سنگیت ملک بھر میں دھوم مچا دے گا۔اس فلم کی زبردست کامیابی میں اس فلم کی موسیقی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔جب اُسے دلسکھ پنچولی کی فلم ''خزانچی'' کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع ملا تو وہ شمشاد کو نہیں بھولا۔اُس نے اُس کی آواز میں پہلا گانا ریکارڈ کیا جس کے بول تھے۔ساون کے نظارے ہیں۔یہ ایک دوگانا تھا جس میں ماسٹر غلام حیدر اور شمشاد بیگم نے مل کر یہ گانا گایا تھا۔اس فلم کی بدولت شمشاد بیگم کے لیے دروازے فلم انڈسٹری نے کھول دئے اور وہ ایک کے بعد ایک فلم سائن کرتی چلی گئی۔اس کے بعد آئی فلم ''خاندان''۔یہ فلم بھی پنچولی برادرس کی تھی اور اس کے موسیقار غلام حیدر ہی تھے جس نے شمشاد بیگم کو خاصی شہرت دلائی تھی۔اس فلم میں شمشاد بیگم نے تین گانے گائے جن میں سے ایک گانا اُس نے نسیم اختر کے ساتھ گایا تھا۔یہ فلم اپنی مدھر سنگیت کی وجہ سے بیحد کامیاب رہی اور اس کامیابی میں شمشاد بیگم کا بھی ہاتھ تھا۔

شمشاد بیگم نے ماسٹر غلام حیدر کی ہر فلم میں گانے گائے۔''خزانچی'' اور ''خاندان'' کے بعد اُس نے فلم ''زمیندار'' ''پونجی'' ''شمع'' اور ''تقدیر'' میں شمشاد کی آواز سے استفادہ کیا۔یہ ساری فلمیں ہٹ ثابت ہوئیں۔''تقدیر'' نرگس کی پہلی فلم تھی جس میں وہ موتی لال کے مدمقابل پہلی بار قسمت آزمائی کر رہی تھی۔یہ فلم محبوب خان کی زیر ہدایت بن رہی تھی۔اس میں نرگس کے لئے جس آواز کا استعمال کیا گیا وہ شمشاد بیگم کی آواز تھی۔اُنہیں لاہور سے ریکارڈنگ کے لئے بلایا گیا اور اُس نے نرگس کے لئے نوشاد علی کی موسیقی میں گانے ریکارڈ کئے۔شمشاد بیگم کے گھر میں ہن برسنے لگا تھا۔وہ جب بھی لاہور سے آتی تھی تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتی تھی۔محبوب صاحب کے شمشاد بیگم کے ساتھ بڑے ہی دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے۔محبوب صاحب کا اُس کا ہوٹل میں ٹھہرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ایک دن محبوب صاحب نے شمشاد کو سمجھایا کہ وہ ہوٹل میں رہ کر کیوں اپنے پیسے برباد کرتی ہے۔ایک تو پیسے کا زیاں اور دوسرا وقت کی بربادی۔اُن دنوں زیادہ تر ریکارڈنگ فینس مہالکشمی میں ہوا کرتی تھی۔محبوب خان نے اپنا ایک فلیٹ شمشاد بیگم کے لئے تیار کروالیا جسے بڑے ڈھنگ سے سجایا سنوارا گیا۔جب شمشاد بیگم نے وہ فلیٹ دیکھا تو اُس نے اُسے ناپسند کیا۔اُس نے ہوٹل میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔بعد میں نمی اور اُس کی نانی اُس فلیٹ میں جا کر رہی۔

محبوب خان اپنی فلم ''ہمایوں'' کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔وہ اس فلم کے لئے غلام حیدر کو موسیقی کی ذمہ داری سونپنا چاہتے تھے۔غلام حیدر نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔وہ اپنے ساتھ کئی گلوکاروں کو بھی لے جانا چاہتے تھے جن میں شمشاد بیگم بھی شامل تھی۔دراصل محبوب خان شمشاد بیگم کی آواز کے مداح تھے اور وہ اپنی اس عظیم الشان فلم میں شمشاد سے گانے گوانا چاہتے تھے۔جب اُس کے گھر والوں نے اُسے بمبئی بھیجنا سے انکار کر دیا تب محبوب خان نے اُس کے والد سے بات کی اور اُس سے وعدہ کیا کہ وہ شمشاد بیگم کو بمبئی میں رہنے کے لئے ایک فلیٹ دیں گے۔ایک کار دیں گے اور اُس کی خدمت کے لئے دو تین نوکر بھی فراہم کریں گے۔اُنہوں نے اُس کے باپ کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی وہ جتنے لوگوں کو بھی اُس کے ساتھ بھیجنا چاہتے ہیں وہ اُن لوگوں کا خرچہ اُٹھانے کے لئے تیار ہیں۔شمشاد بھی بضد تھی کہ وہ بمبئی جانا چاہتی ہے۔محبوب خان کی پیشکش اور شمشاد کی ضد نے میاں حسین بخش کو جھکنے پر مجبور کیا اور اس طرح شمشاد بیگم بمبئی آ گئی۔بمبئی میں اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔بمبئی فلم انڈسٹری کے مہان سنگیت کار نوشاد علی، سی رامچند ر، او پی نیر اور ایس ڈی برمن نے شمشاد بیگم کی آواز میں جتنے بھی گانے صدا بند کئے وہ سبھی گانے زبردست ہٹ ہوئے۔سی رامچند رنے مغربی دھن پر ایک گانا تیار کیا جسے اُس نے شمشاد کے ساتھ مل کر گایا۔گانے کے بول تھے۔آنا میری جان، میری جان سنڈے کے سنڈے جس نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا اور دوسرا گانا فلم ''پتنگا'' کا تھا جس کے بول تھے ''میرے پیا گئے ہیں رنگون وہاں سے کیا ہے ٹیلیفون'' نے بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔شمشاد بیگم ہمہ جہت فن کار تھی۔وہ ہر طرح کے گانے گا سکتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ بمبئی کے بڑے موسیقاروں کی ہمیشہ پسند بنی رہی۔

بمبئی آ کر اُس کے گھر کے باہر پروڈیوسروں کی لائن لگ گئی۔ایس ڈی برمن کو پہلی ہندی فلم ''شکاری'' کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع ملا تھا۔اُس نے شمشاد بیگم سے اس فلم کے لئے ایک گانا گوایا تھا۔یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی مگر اسے کامیابی نہیں ملی۔ایس ڈی برمن اتنا دل شکستہ ہو چکا تھا کہ وہ بمبئی چھوڑ کر واپس کلکتہ جانا چاہتا تھا تبھی اُسے فلم ''شبنم'' کا سنگیت سجانے کی پیشکش ہوئی۔اس فلم میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل مرکزی کردار میں تھے۔یہ اُس زمانے کی سب سے مقبول جوڑی تھی۔شمشاد بیگم نے اس فلم کے لئے چھ گانے گائے۔اس فلم کو ایسی بے پناہ کامیابی ملی جس کی مثال نہیں ملتی۔اس فلم نے جہاں ایس ڈی برمن کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا جب کہ شمشاد بیگم کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔اُس نے ایس ڈی برمن کے ساتھ کئی فلمیں کیں جن میں ''بازار''

''مشعل''،''بہار''،''شہنشاہ''،''مس انڈیا'' قابل زکر ہیں۔

اُس کا محسن ماسٹر غلام حیدر بٹوارے کے بعد بمبئی چھوڑ کر پاکستان چلا گیا جب کہ شمشاد بیگم واپس نہیں گئی۔ اُسنے بمبئی کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ وہ اسی شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگی۔

اوپی نیر شمشاد بیگم کو آل انڈیا لاہور سے جانتا تھا جہاں نیر چپراسی تھا اور وہ آرٹسٹوں کو چائے پانی پلاتا تھا۔ جب وہ بمبئی آ گیا اور اُسے فلم ''منگو'' کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع ملا تو وہ سیدھے شمشاد بیگم کے پاس گیا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ اُس کی پہلی فلم کے لئے گانا گائے۔ شمشاد بیگم نے اُسے مایوس نہیں کیا اور اُس کی پہلی فلم کو اپنی آواز بخشی۔ نیئر کا کہنا تھا کہ شمشاد بیگم کی آواز مندر میں بجنے والی گھنٹی کی طرح ہے۔ جو سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے۔ اوپی نیر اور شمشاد بیگم کا بڑا لمبا ساتھ رہا۔ اُس نے نیر کے لئے بہت سارے گانے گائے جو کافی مقبول ہوئے ۔جیسے ''اب تو جی ہونے لگا''،فلم ''مسٹر اینڈ مسز 55 ''میں جان گئی تجھے ۔فلم ''ہوڑہ برج'' سیاں تیری آنکھوں میں۔فلم ''12o clock''۔ تھوڑا سا دل لگانا''،فلم ''مسافر خانہ'' وغیرہ۔ بعد میں جب آشا بھونسلے اوپی نیئر کی زندگی میں داخل ہوئی تو وہ شمشاد بیگم کو بھول گیا۔ شمشاد کیا اُس نے گیتادت کو کنارے کر دیا جس نے اُسے اپنے شوہر سے منت سماجت کر کے کام دلوایا تھا۔ یہ گورودت کی فلمیں تھیں جنہوں نے اُسے شہرت اور عزت بخشی تھی۔ فلم انڈسٹری میں اس طرح کی احسان فراموشی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نوشاد علی نے اپنے محسن این ڈی مدھوک کے ساتھ ایسا ہی کیا جس نے نوشاد علی کو رنجیت اسٹوڈیو کے مالک چندو لال شاہ سے کام دلانے کی خاطر اُن کے سامنے یہ پیشکش رکھی کہ اگر اُنہیں نوشاد کا سنگیت پسند نہیں آئے گا تو وہ ریکارڈنگ کا سارا خرچہ اُس کے معاوضے سے کاٹ لے۔

شمشاد بیگم 1941 سے لے کے 1955 تک اپنے عروج پر تھی۔ کہا جاتا ہے وہ سب سے زیادہ معاوضہ لیتی تھی۔ اُس نے ان چودہ سالوں میں بڑی بڑی فلمیں کیں جیسے ''تقدیر''،''ہمایوں''،''شاہجہاں''،''انوکھی ادا'' ''آگ''،''میلہ''،''پتنگا''،''بابل''،''بہار''،''جادو''،''آن'' وغیرہ وغیرہ۔ اچانک اُس کی کامیابی کا یہ کارواں ایک جھٹکے کے ساتھ تھم گیا۔ شمشاد بیگم کے شوہر گنپت لال بٹو کی ایک کار حادثے میں موت ہوگئی۔ شمشاد بیگم کے لئے یہ صدمہ اتنا جاں گسل تھا کہ وہ مہینوں تک اس صدمے سے اُبھر نہیں پائی۔ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی۔ اُس کا شوہر، شوہر ہی نہیں اُس کا رفیق، اُس کا ہمراز اور رہروتھا۔ وہ اُس کے سارے کاروباری حساب کتاب سنبھالتا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد اُس کا جی اُچاٹ ہوگیا۔ اُس کے جینے کی اُمنگ ہی ختم ہوگئی۔ وہ رات دن اپنے شوہر کو یاد کرتی۔ محبوب خان جو کہ فلم ''مدر انڈیا'' کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اس فلم کے لئے اُنہیں شمشاد بیگم کی اشد ضرورت تھی۔ نوشاد علی اُس سے کئی گانے گوانا چاہتے تھے مگر وہ کام کرنے کے لئے راضی نہیں تھی۔ تبھی محبوب صاحب کو خود شمشاد بیگم کو ملنے جانا پڑا اور اُنہوں نے شمشاد بیگم کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ کب تک سوگ میں ڈوبی رہے گی۔ کیا اُس کے سوگ منانے سے اُس کا شوہر واپس چلا آئے گا۔ وہ اپنے ساتھ ہی نہیں اپنے پریوار کے ساتھ ظلم کر رہی ہے۔ اُس کی وجہ سے اُس کا پورا پریوار دکھی ہے۔ محبوب خان کی ڈانٹ نے کام کیا اور اُس نے فلم ''مدر انڈیا'' کے لئے گانے گانے کے لئے حامی بھر لی۔ اس نے کئی انمول گیت گائے جو پہلا گانا اُس کا ریکارڈ ہوا وہ تھا۔ شکیل بدایونی کا لکھا گانا ''پی کے گھر آج دلہنیا چلی''۔ فلم مدر انڈیا میں اُس نے جتنے بھی گانے گائے وہ آج بھی امر ہیں۔

شمشاد بیگم کی واپسی کی خبر سن کر، ایک بار پھر موسیقاروں کی لائن شمشاد بیگم کے گھر کے باہر لگ گئی۔ اُس نے کئی کامیاب فلموں میں پلے بیک کیا جن میں ''سی آئی ڈی''،''نیا انداز''،''برادری''،''مسٹر اینڈ مسز ۵۵''،''ہوڑہ برج''، ''جعلی نوٹ''،''لو ان شملہ''،''بیوقوف''،''بلف ماسٹر''،''گھرانہ''،''رستم ہند'' اور ''مغل اعظم'' تھیں۔ لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے جو کہ فلم انڈسٹری میں اپنی جگہ پانے کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں، شمشاد بیگم کی بریک لینے سے اُنکی راہیں کھل گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو فلمساز شمشاد بیگم کا معاوضہ دینے کی توفیق نہیں رکھتا تھا وہ ان دونوں بہنوں کی آواز میں گانے ریکارڈ کرتے تھے مگر اُن سے کہا جاتا تھا کہ وہ شمشاد بیگم کی طرح گانے کی کوشش کریں۔ کئی سالوں تک ان دونوں بہنوں پر شمشاد بیگم کا بہت زیادہ اثر رہا۔ فلم ''محل'' کا گانا ''آئے گا آئے گا آنے والا'' شمشاد بیگم کے سٹائل میں لتا منگیشکر نے گایا۔ اسی طرح فلم ''انداز'' کا گانا ڈر نا محبت کر لے، شمشاد بیگم کے انداز کی ہو بہو نقل تھی۔ لتا منگیشکر نے جب اپنا فلمی سفر شروع کیا تب شمشاد بیگم اپنے عروج پر تھی۔ انہوں نے مل کر کئی گانے گائے جن میں 1949 کی فلم ''پتنگا'' کا گانا ''پیار کے جہان کی'' اور 1951 کی فلم ''دیدار'' کا گانا ''بچپن کے دن بھلا نہ دینا۔ آج ہنسے کل رلا نہ دینا''۔ اور ''مغل اعظم'' کا لافانی گانا ''تیری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے''۔

1963 کے بعد لتا منگیشکر شمشاد بیگم پر حاوی ہونے لگی۔ موسیقاروں کی پہلی پسند لتا منگیشکر بنتی جا رہی تھی جب کہ گیتادت اور شمشاد بیگم نمبر دو کی صف میں جا کر کھڑی ہوئیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ایک زمانے میں ہیروئن کے لئے شمشاد بیگم کی آواز کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اب ہیروئنوں کی یہ شرط ہوتی تھی کہ وہ اُن کے لئے لتا منگیشکر کی آواز کا استعمال کریں گے۔ شمشاد بیگم کی آواز کا استعمال فلم میں مرکزی اداکاروں پر نہ کر کے معاون اداکاروں پر کیا جانے لگا۔ وقت کی اس ستم ظریفی نے شمشاد بیگم کا دل توڑ کے رکھ دیا۔ اُس نے 1965 سے ایک طرح سے فلم دنیا سے سنیاس لے لیا تاہم جو اُس کے پرستار تھے وہ اُسے نہیں بھولے اور اُنہوں نے اُس کی آواز میں گانے ریکارڈ کئے۔ اس آدھے ادھورے سنیاس کے بعد اُس نے جن فلموں میں گانے گائے اُن کے نام ہیں ''ڈاکو منگل سنگھ''،''اُپکار''،''قسمت''،''ہیر رانجھا''اور ''جواہر محمود ان ہانگ کانگ''۔

نوشاد علی نے بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی کامیابی کا سہرا شمشاد بیگم کے سر باندھنا چاہتے ہیں۔ وہ نہایت ہی حلیم اور خوش

گفتار خاتون تھی۔ اُسے شہرت کی قطعی بھوک نہیں تھی۔ وہ نام ونمود سے ہمیشہ دور رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی بہت ہی کم تصاویر دستیاب ہیں۔

شمشاد بیگم نے ایک ہزار چھ سو پچاس سے زائد گیت گائے۔ اُس نے ہندی، اُردو۔ پنجابی، بھوجپوری، راجستھانی، تمل، بنگالی، مراٹھی، گجراتی اور دیگر زبانوں میں گیت گائے۔ اُسنے اپنے کیریر کی شروعات ہی فلم ''یملا جٹ'' کے اس گانے ''کنکادیاں فصلاں پکیاں'' سے کیا۔

شمشاد بیگم نے کتنے بھی گیت گائے ہوں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ کس موسیقار نے اُس کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا وہ تھا او پی نیر جسے تقدیر سے گورودت کی تین فلموں میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ پہلی فلم تھی ''سی آئی ڈی'' جس میں اُس نے بڑے ہی شوخ نمبر گائے۔ لے کے پہلا پہلا پیار۔ بوجھ میرا کیا نام رے اور کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ۔ اُس کے بعد فلم ''آر پار'' کا گانا کبھی آر کبھی پار۔ اور مسٹر اینڈ مسز ۵۵ کا گانا اب تو جی ہونے لگا۔

جب اُس نے محسوس کیا کہ فلم انڈسٹری میں سیاست گھس آئی ہے اور اب اُس کے لئے یہاں جگہ نہیں ہے تو اُس نے فلموں سے صدا کے لئے سنیاس لینے کا فیصلہ کیا۔ اُس کی اکلوتی بیٹی اوشا جو موسیقی میں بہت دلچسپی رکھتی تھی اور وہ بھی اپنی امی کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھی مگر شمشاد بیگم نے اپنی بیٹی کو موسیقی سے دور رکھا۔ اُس نے اُسے موسیقی سیکھنے کی اجازت تک نہیں دی۔ بیٹی موسیقی کو پیشہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بس اپنے من کے سکون اور خوشی کے لئے سنگیت سیکھنا چاہتی تھی مگر ماں نے اُسے یہ کہہ کر روکا کہ اگر اُس نے سنگیت سیکھ لیا تو وہ سیدھے فلموں میں پہنچ جائے گی جو وہ نہیں چاہتی ۔ فلمی سیاست سے اُس کا دل بھر گیا تھا۔ یہاں لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ ڈوبتے سورج کی طرف کوئی دیکھنا نہیں چاہتا۔ جن موسیقاروں کو اُس نے اپنی آواز دے کر شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا وہ بھی وقت آنے پر اُس سے کنارہ کرنے لگے جن میں او پی نیر، چترا گپت، نوشاد علی اور ایکٹر راج کپور تھا۔ اُس کی بیٹی اوشا راترا نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ جب راج کپور اپنی پہلی فلم ''آگ'' بنا رہا تھا تو وہ شمشاد بیگم سے ملنے آیا۔ اُس نے اپنا تعارف پرتھوی راج کپور کے بیٹے کے طور پر کیا۔ اُس نے شمشاد سے کہا کہ آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ نئے لوگوں کی کافی مدد کرتی ہیں۔ میں ایک فلم بنا رہا ہوں جس میں مجھے آپ کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کرنا ہے۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لئے پیسے نہیں ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لئے یہ گانا ریکارڈ کر لیجئے۔ شمشاد بیگم نے پرتھوی راج کپور کی خاطر راج کپور کے لئے وہ گانا ریکارڈ کیا۔ ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا۔ یہ گانا ہٹ ہوا۔ اُس کے بعد راج کپور نے پلٹ کے بھی اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ راج کپور کے اس رویے سے اُس کے دل کو کافی ٹھیس پہنچی۔ یہ وہ کسک تھی جسے وہ مرتے دم تک محسوس کرتی رہی۔ یہی کارن ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو فلموں سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اُسے فلموں سے دور ایک خوشحال زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی اس لئے اُس نے اُس کی شادی فلموں سے وابستہ کسی شخص کے ساتھ نہیں کی بلکہ ایک فوجی افسر یوگ راترا کے ساتھ کی اور اُسے فلموں کی ہوا تک لگنے نہ دی۔

شمشاد بیگم کا سوائے بیٹی اور داماد کے اور کوئی نہیں تھا اس لئے وہ اُن کے ساتھ ہی رہنے لگی۔ وہ نواسے نواسیاں کے ساتھ اپنے آپ کو مصروف رکھتی تھی۔ شمشاد اور گنپت لال کے بیچ مذہب کبھی آڑے نہیں آیا۔ اُس نے شمشاد کے مذہب کا احترام کیا جب کہ شمشاد نے اُس کے دھرم کی عزت کی۔ وہ دونوں اپنے اپنے مسلک پر ڈٹے رہے۔ شمشاد پانچ وقت نماز پڑھتی تھی جب کہ گنپت لال سویرے سویرے پوجا پاٹھ کرتا تھا۔ یہ ایک مثالی جوڑا تھا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ شمشاد بیگم کو 2009 میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ چورانوے سال تک زندہ رہی۔ آخری دنوں میں وہ بیمار رہنے لگی۔ لمبی علالت کے بعد اُس نے 23 اپریل 2013 کو اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔

نئی تاریخ

سراج الدولہ اور میر جعفر کی کہانی پھر زوروں پر ہے
اور میں خود سے سوالی ہوں کہ آخر ہمارا ہر سراج الدولہ سازش کا شکار کیوں ہوتا ہے- ہمارے میر جعفر آخر ہمارے ہیرو سے بڑھ کر ذہین کیوں ہوتے ہیں، اور وہ کونسا جبر ہے جو ان ذہین لوگوں کو غدار بنا دیتا ہے؟
آخر کیا سبب تھا کہ انگریز اپنے وطن سے ہزاروں میل دور آ کر بھی اپنے وطن اور اپنے سربراہوں کے وفادار رہے اور ہر بار وفادار رہے، اور ہمارے عظیم ہیرو ہر بار اپنے ہی لوگوں کی غداری سے مارے گئے-
ہمارے بھائی غدار، ہمارے درباری غدار، ہمارے سپاہی غدار، سپاہ سالار غدار، حتیٰ کہ ہماری آدھی سے زیادہ آبادیاں غدار!!!-----
بس ہمارے ہیرو سچے اور ان کے حامی سچے!!
آخر اس بیانیہ کی بنیاد کیا ہے؟
اور پھر جب ہمارے یہ ہیرو مار دیئے جاتے ہیں تو ان کو مارنے والے سرخرو ہو جاتے ہیں جیسے سراج الدولہ اور ٹیپو کے بعد ہوا-
اور پھر جب ہمارے ہیرو اپنے پیچھے انتشار چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں تو جن پر الزام تھا، وہی سازش کرنے والے آ کر ہمارے نظام کو بحال کرتے ہیں-
اور ہم اپنے ہیرو کی تاریخ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں، تا کہ ہماری نئی نسلیں ایک نئے ہیرو کے انتظار میں لگ جائیں-

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

’’چہارسو‘‘ کا ڈاکٹر زبیر فاروق نمبر ملا۔ پرچے کی تزئین دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ میں اس کے لیے آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ آپ نے مجھے عزت بخشی اس کے لیے نہایت مشکور ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے عزت دی۔ مگر اس میں آپ جیسے دوستوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ کسی کی صلاحیتیں کتنی بھی زیادہ ہوں جب تک انہیں پذیرائی نہ ملے، بات نہیں بنتی۔ میں آپ سے کوسوں دُور ہوں ورنہ خود حاضر ہوکر شکریہ ادا کرتا۔ اللہ نے چاہا تو ایسا ضرور کروں گا۔

میں پرچے کے ظاہری حسن کی بات ہی کروں گا اس کے مندرجات کے بارے میں قارئین کی رائے اہم ہے۔ مجھے امید ہے کہ کوئی رائے موصول ہو گی تو مجھے بھی آگاہ کریں گے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کا بہت بہت شکریہ۔

زبیر فاروق العرشی (دوبئی)

محترم گلزار صاحب، آداب و نیاز

چہارسو کا تازہ شمارہ زبیر فاروق نمبر نظر نواز ہوا۔ اگرچہ فاروق صاحب اپنے قومی اور روائتی لباس میں ہیں مگر مجھے ان سے میرے اپنے وطن کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ کیوں نہ ہو تو وہ اردو کی زلف کے اسیر ہیں اور کراچی پاکستان کی قابل فخر طبی درسگاہ یعنی ڈاؤ میڈیکل کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ سلام ہے ان کو کہ انہوں دو مخالف شعبوں یعنی ڈاکٹری اور شاعری و ادب میں اعلی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ ان پر دیگر مشاہیر نے ان کی ادبی صلاحیتوں پر مضامین لکھے ہیں۔ صفحہ پانچ پر انکے کلام کا انتخاب منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک نمونہ حاضر ہے۔

ہر حرف زخم کی صورت کھلا ہوا
فرصت ملے تو تم میرا دیوان دیکھنا

ڈر ہے ڈوب نہ جاؤں
اسکی آنکھ سمندر ہے

آج کے دور میں جب سائنس دانوں سے لیکر سیاست دانوں تک عوام و خواص کو زائچہ بنوانے اور ستاروں کے اعداد شمار سے مستقبل جاننے سے دلچسپی ہوگئی ہے اس پس منظر میں شموئل احمد کی کتاب کشف اعداد کا تذکرہ برقت ہے۔

جاوید انور اور شفیق سلیمی کے مضامین پر مغز ہیں اور بڑی حد تک فاروق زبیر صاحب کے کلام کا قابل تعریف احاطہ کرتے ہیں۔ موجودہ شمارے میں ڈاکٹر کوشل سونی کا حمدیہ کلام ’’نصاب ہستی قرآن‘‘ بیحد پرکشش ہے اور مسلمانوں کے لئے لمحہ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ اسی صفحے پر تلک راج پارس کا بخشش بھی قابل تعریف ہے۔ بشرٰی رحمان کا گھر میں نے بنایا ہے۔ دل کو چھو لیتا ہے۔ اسی طرح رینو بہل کا کانٹے ببول کے کمال کی چیز ہے۔ میں حیران ہوں کہ میری دوست اور بہن رینو کے تخلیقی سوتے نہ صرف زور و شور سے جاری ہیں بلکہ اب بھی کسی آبشار کی طرح رواں دواں ہیں کہ تقریبا ہر دوسرے شمارے میں ان کے افسانے چونکا دیتے ہیں، اللہ رے زور قلم اور زیادہ۔ تابش حسب سابق اپنے مضامین میں کوئی نہ کوئی سبق یا پیغام لئے ہوتے ہیں۔

موتی لال اپنے دور کا (جو دلیپ کمار، راجکپور اور دیو آنند سے پہلے کا دور تھا) سب سے زیادہ کامیاب اور مہنگا ہیرو تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اسکے پاس بمبئی میں قائداعظم کے علاوہ رولس رائیس کار ہوا کرتی تھی۔

اب اس شمارے بلکہ چہارسو کے ہر شمارے کا حاصل مقصد وہ ناول ہے جو آل انوار صاحب تحریر کررہے ہیں میں حیران ہوتا ہوں کہ اس قسم کی ٹکسالی زبان، چٹ پٹے جملے اور کہانی کی روانی کوئی انوار صاحب میامی میں بیٹھے لکھ رہے ہی۔ کچھ الفاظ تو ایسے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں مگر دلی، یوپی میں استعمال ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ ’’یعنی سامنے والا چھجا۔ کاٹ دار جملے جیسے۔۔۔تین بہنیں امیرن، تمیزن اور گوہر۔۔ان پر شباب ٹوٹ کر برسا تھا۔۔۔اس کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی قاری کے ذہن میں ان کے شباب کی تصویر گھوم گئی۔ پھر جو منظر ہے یعنی نواب صاحب کا تیش میں آنا اور گولی چل جانا۔ اس موقعہ پر مجھے لوہارو کے نواب شمس الدین کے ہاتھوں انگریز ولیم فریزر کا قتل جس کی پاداش میں نواب مرزا داغ دہلوی کے والد کا پھانسی پانا دراصل ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس قصے کو شمس الرحمان فاروقی نے اپنے ناول کئی چاند تھے سر آسمان میں بیان کیا ہے۔

آخر میں عبداللہ جاوید صاحب اور انہیں کے ساتھ میرے بھائی اور مجھے ڈھیروں محبت دینے والے یوگندر بہل بہت یاد آئے اللہ دونوں کے مرتبے بلند کرے آمین۔

فیروز عالم (لاس اینجلس)

محترم جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کی پی ڈی ایف موصول ہورہی ہے۔ اس عنایت کا شکریہ۔
میں نالائق ہوں کہ جواب نہیں دیتا۔ زبیر فاروقی کا گوشہ بھی لائق تحسین ہے۔
کشف الاعداد پر سرور حسین کا تبصرہ پڑھ کر حیران ہوا۔ میں نے انہیں کتاب نہیں بھیجی۔ پتہ نہیں کہاں سے دستیاب ہوئی۔ اس کتاب میں آپ کا اور فیض صاحب کے نام کا زائچہ بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ کتاب آپ تک پہنچا نہیں سکتا ورنہ آپ دیکھتے کہ آپ کے بارے میں کیا کیا علم غللم لکھا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے جو فلم چپکے چپکے بنائی تھی وو بھی نمبر کی زد میں آ گئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری تحریک پر آپ نے ناول لکھنا شروع کردیا۔ ساری قسطیں شوق سے پڑھ رہا

ہوں۔ مجھے رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد یاد آتا ہے اسلوبیاتی سطح پر آپ ان سے قریب نظر آئے۔ ناول جس دور کی کہانی بیان کرتا ہے وہ پس منظر ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ کرداروں کی زبان اور انداز گفتگو میں بھی وہ دور جھلکتا ہے۔ آپ کی تحریر میں طنز کی باریک لہر ہوتی ہے جسے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ اصل میں یہ آپ کے اسلوب کا حصّہ ہے۔

افسانے سبھی اچھے لگے۔ رومانہ تبسّم کا افسانہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے ۔براہ راست میں آپ نے زبیر صاحب کو گھیرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بچ کر نکل گئے۔ باقی مشمولات زیر مطالعہ ہے۔

شموئل احمد (پٹنہ)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا تو اپنے مطالعے میں شامل تمام تحاریر کو ایک طرف کر کے چہارسو کا مطالعہ شروع کر دیا۔ شمارے میں شامل تخلیقات پر رائے دینے سے قبل میں ادب کے ساتھ آپ کی دیانت داری اور تسلسل کے ساتھ وابستگی کی داد دینا چاہوں گی۔ کتنے گرم سرد موسم آئے لیکن چہارسو ہر موسم میں جگ جگ کی کہانی لیے ہمارے پاس پہنچتا رہا۔ اللہ آپ کو اور آپ کے جذبے کو یوں ہی قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

قرطاس اعزاز، ڈاکٹر زبیر کا نام بہت سن رکھا تھا لیکن ان کی ملاقات کا وسیلہ آپ بنے۔ ان کے بارے میں جان کر اور ان کا کلام پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اردو زبان سے ان کی محبت اور لگاؤ مثالی ہے۔ افسانوں میں بشریٰ رحمٰن کے افسانے نے متاثر کیا۔ اس میں زندگی کی سچائی بیان کی گئی ہے۔ اختتام پر جو رخ دکھایا گیا وہ ہمارے سماج میں شاذ و بادر ہی نظر آتا ہے لیکن یہ ایک اچھا پیغام ہے۔ کچھ ایسا ہی خیال ڈاکٹر شہاب افسر خان کے افسانے میں ملتا ہے۔ ہم لاکھ اسے معاشرے میں نقص سمجھیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ قسط وار ناول۔ خاک شفا" نے باندھ کر رکھا ہے۔ کہانی جس ماحول کی ہے، اسی کی مناسبت سے زبان کا استعمال بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

شاعری میں بھی آپ کا انتخاب لاجواب ہے۔ عہد رفتگاں کے معروف شعراء خاطر غزنوی اور اشرف سلیم کے کلام کا لطف آیا۔ ان کے علاوہ جن کے کلام نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ان میں واصف حسین واصف، پروین شیر، نسیم سحر اور جنید آذر شامل ہیں

فرح کامران (نیویارک)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

زبیر فاروق والا تازہ شمارہ طے شدہ وقت سے پہلے ہی موصول ہو گیا۔ عرب کے شعراء میں اردو ادب کا جو گلدستہ زبیر صاحب نے کھلا رکھا ہے اُسے پڑھ کر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ایم بی بی ایس ڈرما ٹالوجسٹ کے لیے ادبی تخلیق اور مشاعروں میں شرکت کے لیے وقت نکالنا اتنا آسان تو نہ ہوگا؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ جس چیز سے انسان شدت سے محبت کرتا ہے اس کے لیے وقت بھی نکل ہی جاتا ہے۔ آپ کے سوالات انفرادی ہیں زبیر صاحب نے جواب بھی اچھے دیئے مگر کچھ جوابات ادھورے سے لگے۔ اردو اور عربی شاعری کا فرق بھی خوب بیان کیا ہے۔ عرب مشاعرے کے بارے سنا تو بہت کچھ ہے مگر اُن کی زبانی بھی سن لیتے تو اور ہی مزہ ہوتا۔ بہر حال آپ کو اور زبیر صاحب کو بہت بہت مبارک۔

ڈاکٹر کوشل کا ''قرآن پاک'' اور تلک راج کا'' بخشش کا سامان '' پڑھ کر اچھا لگا۔ یہ اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو زبان کو مذہب کے دائروں میں قید کرنا چاہتے ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کا افسانہ شامل کر کے اور عبداللہ جاوید صاحب کی غزل بیک ٹائٹل پر تصویر کے ساتھ لگا کر آپ نے اُنہیں اچھی خراجِ عقیدت پیش کی ہے۔ پرماتما اُن کی آتما کو شانتی دے۔

اس بار تو آپ نے افسانوں کی خوب محفل سجائی ۔ ہر افسانے پر بات کرنا ممکن نہیں۔ شموئل صاحب کے افسانے ''کٹوا'' کے بارے ضرور کہوں گی کہ ہمیشہ کی طرح اُن کا افسانہ معاشرے کو آئینہ دکھاتا نظر آیا۔ افسانہ دلچسپ ہے بولڈ ہے مگر حیرت ہوئی کہ بارہ سال کی کمسن بچی کی زبان سے کٹوا سن کر۔ فرح کامران، خورشید حیات، شہاب افسر خان، افشاں ملک، تابش خانزادہ، عمران عاکف خان، افتخار بلوچ، سہیل ارشد، ولا جمال اور رومانہ تبسم کے مختلف رنگ اور مختلف انداز میں لکھے افسانے اچھے لگے۔

''خاکِ شفا'' جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے اس میں دلچسپی میں ویسے ویسے اضافہ ہو رہا ہے۔ نوحہ میں تمیزاً کی پوری کہانی اس طرح بیان کی ہے کہ پورا واقعہ آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ اس قسط میں میرٹھ کی باتیں، وہاں کے قصے مثلاً حکیم صاحب کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ مصنف کی میرٹھ کے متعلق اور میواتی زبان کی جانکاری اچھی ہے۔ زبان اور اندازِ بیان بھی چٹخارے والا ہے۔ جملے چست ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہانی کیا موڑ لیتی ہے۔

فیروز عالم صاحب کی ترجمہ کی ہوئی کہانی کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ کہانی اچھی ہے۔

شاعری کا حصہ بھی معیاری ہے۔ نظم ''بے حیا'' زندگی کی تلخ حقیقت کا اچھا بیان ہے۔ سمیرا کاجل کی نظم بھی دل کو چھو گئی۔ پروین شیر، رضیہ اسماعیل اور شبہ کوثر کی ''جنگ''، نوید سروش کی ''تلاش''، خالد محمود کا قطعہ قابلِ ستائش ہے۔

مشتاق اعظمی پر محبوب انور کا لکھا مضمون اُن کی ادبی خدمات اور شخصیات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ہر بار کی طرح فلر اور خطوط کے مزے سب سے پہلے لیے گئے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے دلچسپ اور معلوماتی فلر تلاش کر کے لاتے ہیں۔ دیپک کنول بھی ہر بار کوئی ایسی شخصیت تلاش کر لیتے ہیں جو بھولے بسرے زمانے کی ہوتے ہوئی بھی اپنے ہُنر کا لوہا منوا چکے ہیں۔

یہ چہارسو کے مدیر کی صلاحیت ہے کہ کام کا شوق ہے جو ہر بار مجھ جیسے قاری کو پورا رسالہ پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاداب رہو آباد رہو۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۳۱، شمارہ جولائی اگست ۲۰۲۲ء) اپنی اعلیٰ روایات اور اہم خصوصی گوشے کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر زبیر فاروق صاحب سے ''براہِ راست'' کے ذریعے ملاقات کے بعد آپ کے لیے بے شمار دعائیں اور تحسینی کلمات کے سوا کچھ نہیں نکلا۔۔۔ایک اہم اور منفرد تخلیق کار اور دانش ور سے تعارف ہوا اور میری علمی و ادبی معلومات میں قیمتی اضافہ ہوا۔ آپ کے سوالات، تفصیلی جوابات کے متقاضی ہوتے ہیں۔ آپ کے سوال (عربی اور اردو شاعری کا موازنہ۔۔۔ نتائج برآمد ہوں گے) جواب انتہائی دلچسپ کہ (دونوں میں وہی فرق ہے جو سبزی کھانے والوں اور گوشت کھانے والوں میں ہے۔۔۔) شاعری، افسانہ نگاری، موسیقی اور رقص سے عملاً تعلق، دوستیاں ادبی تقریبات میں شرکت اور انعقاد، بیرونِ ممالک کے سفر اور چار بیویاں ایک متحرک، فعال اور کسی حد تک زندہ دل کی شخصیت کے مالک ہیں۔ محمد انعام الحق نے ''خموش آشنا'' میں بڑے سلیقے سے تعارف، مصروفیت اور ادبی کارگزاری پیش کی ہے۔ محترم فاری شانے غزلیہ انتخاب بھی خوب کیا ہے۔

کس خوف سے ہیں شہر کے سارے مکاں

جب سے ہوئی ہاتھ میں میرے کمان چپ

احمد ندیم قاسمی مرحوم، پروفیسر وہاب اشرفی، شفیق سلیمی اور احتشام اختر کے مضامین پڑھے جو اردو کے عرب نژاد اور شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق کے فکر وفن کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یادگار گوشہ۔ بہت خوب۔

شموئل احمد کا افسانہ ''کوّا'' موجودہ ہندوستان کے سیاسی و سماجی افراتفری کا ترجمان ہے۔ افسانے میں گنگا جمنی تہذیب کی اس زمین پر دلت لڑکیوں کے ساتھ مندروں میں ریپ، اقلیتوں کے ظلم و ناانصافی، حقوق کی پائمالی، افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ سب سرکاری سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ افسانے میں روندرشا کی کا کردار انسان سے بے غرض محبت کا نمائندہ ہے جس میں اس صورت حال سے مقابلے کا حوصلہ اور بدلنے کا جذبہ ہے۔ شموئل احمد صاحب کی جرأت کو سلام۔ افسانہ ''کانٹے ببول کے'' محترمہ رینو بہل نے ایک پیچیدہ کہانی کو فنی مہارت سے آسان بنا کر پیش کیا ہے جس رشتوں (نند بھاوج) کی پائیداری دولت سے جڑی ہوتی ہے۔ راج چوہدری کا وصیت کو خفیہ رکھنا اہم نکتہ ہے۔ آخر سطر:

''دیکھو بے چاری کا کیا حال ہو گیا بدنصیب پھر سے بیوہ ہو گئی۔''

یہ مکالمہ افسانے کو ''ہم جنسی'' کی طرف لے جاتا ہے۔ اچھا افسانہ ہے۔ فیصل عظیم نے ''لمبی ناک والے'' میں اپنے مطالعے سے خود کلامی کے انداز، دلچسپ مکالماتی کہانی تخلیق کی جس میں محبتوں، رشتوں اور تعلقات میں ''انا'' آڑے آتی ہے اور ہم اپنی زندگی کے بہترین لمحے اور لوگ گنوا بیٹھتے ہیں۔ فرح کامران کا افسانہ ''شطرنج کی بازی'' دلچسپ ہے پیش کش بھی مناسب ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم معروف صاحبِ مطالعہ لکھاری ہیں ''دینا مولوک'' سے ماخوذ کہانی ''محبت زندہ رہتی ہے'' دلچسپ، پُرتجسس اور پُراثر ہے۔ اسلوب رواں ہے۔

دادی، مگی اور ڈولی کے یاد رہ جانے والے کردار ہیں۔

عرفان اسلم نے ظفر قریشی کے ناول ''بوم بسیرا'' کا جائزہ پاکستان اور امریکا کے سماجی اور سیاسی پس منظر میں کیا ہے۔ ''نور کے تصور میں'' تصور اقبال کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ نسیم سحر صاحب نے کتاب کا تجزیہ نعت کے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔

محترمہ پروین شیر کی نظم ''مکافات'' علامتی بامعنیٰ نظم ہے جس میں انسان کی تحقیر اور انسانیت کی تذلیل کا نوحہ ہے۔ نظم سوچنے کی دعوت دیتی ہے کچھ مصرع دیکھئے

کاشت گھرے اندھیروں کی

سب اجالے سیاہی کی خندق

جو تھا دارالاماں اب ہے دارالفنا

محترمہ رضیہ اسماعیل کی نظم ''ہمیں اب تیز چلنا ہے'' اُمید، عزم و جرأت کے چراغ روشن کر رہی ہے اور اس جستجو میں ہے کہ دنیا کو نمونۂ جنت اور انسان کو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مقام ''اشرف'' دینا ہے۔ شعیب کیانی کی نظم ''بے حیا'' طنزیہ ہے صنفِ نازک کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ شبہ کوثر کی نظم ''جنگ'' امن کی متلاشی ہے۔

''خاکِ شفا'' ناول کا اسلوب، مکالمے اور کردار مسلسل اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے کہانی آگے بڑھ رہی ہے اور تجسس میں بھی اضافہ ہے۔ چھٹی قسط میں میرٹھ کے بندو میاں کا کردار نے متاثر کیا کیسے کیسے لوگ، کیا سے کیا ہو گئے۔ ملا نصیر کے سیخ کباب والے کے مکالمے زبردست ہیں۔

''دلی میں ہوتے۔۔۔تم۔۔۔تو۔۔۔دلی والے سونے میں تول دیتے''

''میاں ہم بھر پائے دلی کے سونے سے۔۔۔ہم سے تو میرٹھ کی چاندی نہ سنبھالی جائے۔'' (ص۔۹۶)

نواب صاحب کا میرٹھ کی تمیزاً سے عشق، بے وفائی پر قتل پھر سزا۔ موت اور بوم میرٹھی کی طویل نظم ''نوحہ'' اس قسط میں اشعار اور دوہے، استاد ابراہیم ذوق کا شعر کیسا چسپاں کیا ہے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

(شیخ ابراہیم ذوق)

میواتی دوہے:

کھٹ رس، مٹھ رس، پریم رس، کن رس لیجو بول

سب رس بھائی زبان میں چاہے جیو بول

ات دلی اُت آگرہ، متھرا سو بیراٹھ

کالا ہاڑ کی شاٹھ میں بسے میرا میوات

حکیم صاحب کی حکمت کے واقعات دلچسپ اور حیران کن ہیں۔ یہ ناول ابھی بہت آگے جائے گا۔ اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے۔

''ڈیڑھ پاؤ سے کچھ اوپر ہے، آپ بارہ آنے دے دو''

غزلوں کا انتخاب بھی آپ کے ذوقِ جمال کا آئینہ ہے طوالت کے سبب اشعار کا انتخاب دینے سے قاصر ہوں۔ نسیمِ سحر، رعنا کوثر، ڈاکٹر ریاض احمد کے خط تنقیدی اشاریہ ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ محنت اور جانفشانی سے اپنا چہارسو اپنے مخصوص انداز میں چلاتے رہیں۔ کامیابی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دفعہ بے شمار اچھے افسانے نظر آئے۔ کچھ پڑھ سکی اور کچھ پڑھ رہی ہوں۔ دوسرے مضامین اور غزلیں نظمیں بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ شروع کرتے ہیں ڈاکٹر زبیر فاروق سے جو اس دفعہ کے قرطاسِ اعزاز کی زینت بنے۔ ہمت افزا بات ہے کہ عرب تہذیب کا ایک عربی اور اردو کو اس ذوق وشوق سے اپنائے کہ شعر وشاعری کرے۔ یہ بہت متاثر کرنے والی بات ہے اس لیے بہت شوق سے براہِ راست پڑھا کہ ان کی شخصیت کو پہنچانیں اور بہت مزہ آیا اسے پڑھ کر۔ پھر ان کے استاد شفیق سلیمی کا مضمون پیغامِ محبت پڑھا۔ جاوید انور کا مضمون ''شور مچاتا ایک سمندر'' پڑھا۔ یوں ان کی غزلوں سے تعارف ہوا۔ بہت بامعنی اور اچھے اشعار ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا مضمون اس کی آنکھ سمندر ہے ڈاکٹر زبیر فاروق کے بارے میں بہت پُر اثر اور اچھا مضمون ہے۔

اب آتے ہیں افسانوں کی طرف۔ بشریٰ رحمٰن کو ہمیشہ رسالوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ ایک عام سے موضوع کو بہت منجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے افسانہ پسند آیا اور نام بھی ''یہ گھر میں نے بنایا ہے۔'' رینو بہل بھی بہت اچھی اور مشہور افسانہ نگار ہیں ''کانٹے ببول کے'' بھی بہت مہارت سے پیش کیا ہے۔ فرح کامران کا افسانہ ''خوابوں کے شہری'' امریکہ میں بسنے والے ان نوجوان جوڑوں کی کہانی جو یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں مگر کبھی کوئی خواب ادھورا رہ جاتا ہے جب دونوں میں سے کوئی ایک جدا ہو جائے۔ ڈاکٹر افشاں ملک کا ''دیوی کا دیوتا'' بھی اچھا تھا فیصل عظیم کا ''لمبی ناک والے'' اچھا اشاراتی افسانہ تھا۔ خاکِ شفا ناول بہت روانی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں اس قدر دلچسپ طریقے سے شہروں کے قصے بیان ہوتے ہیں کہ اس شہر کو دیکھنے کا دل چاہتا ہے۔ جیسے میرٹھ شہر کی سیر اور تہذیب ماضی کی کہانی لوک گیت، نوحے، میواتی زبان یہ تاریخ ہے جو ہم پڑھتے ہیں۔ پھر مٹھائیوں کی اقسام، میرٹھ والوں کے مزاج کا پتہ دیتی ہیں۔ بہت مبارکباد کے مستحق ہیں ناول نگار۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں بہت دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ موتی لال کی داستانِ حیات پڑھی اور کچھ باتوں نے حیرت میں ڈال دیا۔

''محبت زندہ رہتی ہے'' فیروز عالم نے وینا ملوک کی کہانی کا خوبصورت ترجمہ کیا۔ فلرز بھی بہت کام کے ہوتے ہیں۔ جیسے ''جگاڑ''۔ ''رو میں ہے رخشِ سفر جاری رکھیں۔ بہت پسند آیا۔ غزلیں سب نہیں پڑھ سکی۔ پروین شیر کا ''مکافات''، رضیہ اسماعیل کا ''ہمیں اب تیز چلنا ہے''، شعیب کیانی کا ''بے حیا''۔ مگر میرا نیٹ سلو تھا، ماہی گیر یا تیراک یہ سب پڑھ چکی ہوں اور بہت پسند آئی ہیں۔

ڈاکٹر کوشل کا نصاب ہستی قرآن پاک اور تلک راج پارس ''بخشش کا سامان'' بہت پسند آیا۔

رعنا کوثر (نیویارک)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ماہنامہ ''چہارسُو'' کا پی ڈی ایف بذریعہ ڈاکٹر زبیر فاروق موصول ہوا۔ ڈاکٹر زبیر فاروق اُردو ادبی دنیا کے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ مشرق ومغرب میں سیکڑوں مشاعرے پڑھ اور لوٹ چکے ہیں۔ لاتعداد ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ چہارسو کے ڈاکٹر زبیر فاروق نمبر جہاں ڈاکٹر زبیر فاروق کے لیے اعزاز ہے وہاں یہ ''چہارسو'' کے لیے بذاتِ خود ایک اعزاز ہے۔

2004ء میں ڈاکٹر زبیر فاروق کی پہلی کلیات ''سرد موسم کی دھوپ چھپی تو اس میں جناب احمد ندیم قاسمی اور اسلام عظمی کے مضامین تھے۔ شاید وہ راولپنڈی میں کسی نے نہیں دیکھی۔ دیکھی ہے تو کھولی نہیں۔ بارہ سو صفحے کی کتاب کو کیوں کھولنا' گلے پڑ جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ میرا ایک شعر سن لیجیے:

آج مجھے وہ پچھلی صف میں دیکھ ملول ہوا
روک دیا تھا جس نے مجھ کو آگے بڑھنے سے

چہارسو میں ڈاکٹر زبیر فاروق پر لکھے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے بندہ یہ جانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چہارسو کے مدیر جناب گلزار جاوید کو کتنی محنت کرنا پڑی ہے۔ لیکن یہ محنت رائیگاں نہیں گئی کہ ڈاکٹر زبیر فاروق اس کا مستحق تھا۔ اُردو زبان سے محبت کرنے والے کم ہی ہوں گے۔ ایک عرب نژاد کا اُردو شاعری کی طرف مائل ہو جانا ہی بڑی بات ہے۔ شاعری کی سو کتابوں کا شاعر ہونا ہی انوکھا اعزاز ہے۔ آج کے دور میں زود گوئی اگرچہ پسند نہیں کی جاتی مگر شاعری اگر عموم اور خصوص کے مزاج پر پوری اُترتی ہو تو سبحان اللہ۔

دیدہ زیب مجلّہ اپنی جگہ اہم ہے۔ میری دعا ہے کہ اس کے لیے محنت کرنے والے ذوق وشوق سے اسے شائع کرتے رہیں۔

اسلام اعظمی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم!۔

ماہنامہ ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ کا پی.ڈی ایف موصول ہوا۔ اس رسالے کا ادبی اور علمی معیار نہایت عمدہ ہی نہیں اپنی جگہ منفرد بھی ہے۔ تمام مشمولات اعلیٰ معیاری اور قابل ستائش ہیں۔ اس شمارہ میں ناچیز کا افسانہ ''شطرنج کی بازی'' کی اشاعت کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ اس بات سے مجھے مسرت ہوئی کہ آپ تخلیقات کے انتخاب میں نئے پرانے قلم کاروں میں امتیاز نہیں برتتے بلکہ صرف تخلیق کو فوقیت دیتے ہیں۔ نئی نسل کے ساتھ اسی طرح فوقیت برتتے رہے تو ان شاء اللہ اردو ادب میں نئے ادباء وشعرا ابھر کر سامنے آئیں گے۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ قابل مطالعہ اور لائق تحسین ہے اس کی

پیش کش میں مدیر مسؤل اور مدیران معاون اور ''چہارسُو'' کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔اللہ کرے آپ کی ادارت میں یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کے مراحل طے کرے۔آمین ثم آمین

رمّانہ تبسم (پٹنہ بہار)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ ایک ایسی منفرد شخصیت سے موسوم ہے جو اپنی مثال آپ ہے جس کا ثبوت ان کے سوانحی بیانیہ اور ادبی خدمات و اعزازات کی تفصیل میں موجود ہے۔ مادری زبان عربی ہونے کے باوجود ڈاکٹر زبیر فاروق خوبصورت انداز اور سلیس اردو میں شاعری کے حوالہ سے معروف شخصیت کی حیثیت میں اردو ادب کی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔حکومت پاکستان نے انہیں ''تمغہ پاکستان'' سے نوازا اور انڈیا میں سرکاری اور دیگر اردو تنظیموں کی طرف سے انہیں بہت سے ایوارڈ عطا کیے گئے ہیں۔ انہوں نے اردو کے علاوہ عربی اور انگریزی میں بھی شاعری کی ہے۔ وہ گذشتہ تقریباً پینتیس برسوں سے متحدہ عرب امارات میں بطور ماہر امراض جلد (Skin Specialist) کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں جہاں وہ پیشہ ورانہ امور کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں بہت سرگرم، فعال اور مہمان نواز ادبی شخصیت گردانے جاتے ہیں اور اکثر اپنے گھر میں بھی ادبی محفلوں کا انتظام کرتے رہتے ہیں۔ایسے نابغۂ روزگار ادبی شخصیت کی تلاش، تفصیلی تعارف اور چہارسو میں گوشہ شائع کرنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمارہ میں اچھے افسانے اور شاعری بھی شامل ہے۔ بشریٰ رحمٰن معروف افسانہ نگار ہیں۔ان کا افسانہ ''یہ گھر میں نے بنایا ہے'' مشرقی عورت کے جذبات، احساسات اور بدلتے حالات میں اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کے حوالہ سے ایک بہترین تحریر ہے جو قاری کو بہت متاثر کرتی ہے۔

''لڈو'' تابش خانزادہ نے ایک صفحہ پر مشتمل تو کہانی تحریر کی ہے اُس میں بہت کچھ سمو دیا گیا ہے جو پڑھ کر یاد رکھنے اور عمل کرنے کے قابل ہے بلکہ سکول اور کالج کے نصاب میں ایک صفحہ پر مشتمل یہ نکات شامل ہونے چاہئیں جن پر عمل کرنے سے سو فیصد شادی شدہ لوگ کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔کہانی میں ۸۰ سال سے زیادہ ایک معمر جوڑے کا ذکر ہے کہ کس طرح انہوں نے شادی کے پہلے دن سے ہی سات سنہری اصولوں کا باہم معاہدہ کیا اور ان پر ہمیشہ قائم رہتے ہوئے بہترین ازدواجی زندگی بسر کی۔ بے مقصد اور طویل تحریر لکھنے کے بجائے مختصر اور بامقصد کہانی تحریر کرنے پر تابش خانزادہ صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔شموئل احمد کے افسانے ''کٹوا'' میں ہندو انتہا پسند اور متعصب حلقوں کی جانب سے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ان کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔انڈیا میں برسرِ اقتدار سیاسی جماعت کو اس ظالمانہ رویہ سے روکنے والا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت بھی دم توڑ گئی ہے۔اس کے برعکس پاکستان میں تمام اقلیتیں بشمول ہندو، سکھ اور عیسائی وغیرہ بھرپور طریقہ سے مساوی حقوق کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں متحرک ہیں۔''کانٹے ببول کے'' رینو بہل نے نئے انداز میں ایک دلچسپ کہانی تحریر کی ہے جو قاری کو آخر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔''خوابوں کے شہری'' فرح کامران کا افسانہ ایسی صورتِ حال کا منظر نامہ ہے جب اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کر لوگ بہت دور دیارِ غیر مثلاً امریکہ میں روزگار یا آبادکار کے طور پر ہجرت کر جاتے ہیں اور اپنے بڑے خاندان، ملک اور قوم سے یکسر کٹ جاتے ہیں۔ کہانی میں ایسے حالات سے دو چار لوگوں کے ذاتی، خاندانی معاملات اور نفسیاتی کشمکش پر بحث کی گئی ہے اور ان مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔اگر اپنے وطن میں تعلیم اور روزگار ممکن ہو تو خاندان، قوم اور وطن کے مقابلہ میں دیارِ غیر کو کبھی بھی ترجیح نہیں دینی چاہیے۔اس لیے بھی کہ ان کی اگلی نسل عموماً ان کے کنٹرول سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتی ہے۔''داستان من و سلویٰ'' سہیل ارشد نے بہت عمدہ اور دلچسپ کہانی تحریر کی ہے جو شروع سے آخر تک پڑھے بغیر چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔''عظمیٰ'' ڈاکٹر ولا جمال العسیلی نے افسانہ تحریر کیا ہے جس پر حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔انہوں نے مادری زبان عربی ہونے کے باوجود سلیس اردو زبان میں دلچسپ افسانہ تحریر کیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آل انوار کی تازہ قسط حسب سابق وہی مخصوص دلچسپ بیان و زبان کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے جس میں بہت سے معلوماتی پہلو بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ دلی کی خاص زبان بھی اسے ایک نیا اسلوب دے رہی ہے اور پھر اگلی قسط کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے بہت اچھے اور دلچسپ افسانے ''محبت زندہ رہتی ہے'' کا انتخاب کیا ہے جو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

شاعری میں پروین شیر اور رضیہ اسماعیل نے بہترین کلام تحریر کیا ہے جو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔اس کے علاوہ مرحوم خاطر غزنوی، اشرف سلیم، قیصر نجفی، رؤف خیر، ڈاکٹر کوشل سونی فرحت، تلک راج پارس کا کلام نہایت متاثر کن ہے۔

شمارہ ترتیب دے کر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے میں آپ کی لگن اور محنت قابلِ ستائش ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

''حُسنِ خُلق''

خود پسندی، کبر و نخوت ناپسندیدہ صفات
کبریائی جس کو زیبا ہے وہ ہے بس ایک ذات
نا پسند اُس کو ہے بندے کا غرور و افتخار
حُسنِ خُلق و انکساری میں ہے بندے کی نجات

(القرآن، لقمان، آیت ۱۸، الجاثیہ ۳۷)

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

..... سنّاٹے کی پرچھائیں .....

سناٹے کی پرچھائیں عادل رضا منصوری کی سولہ سالہ ریاضت کا پہلا مجموعی اظہار ہے۔جس کے شعروں میں سلیقے سے سمٹا ہوا انتشار ہے،خواب و خلا سے پیدا خلفشار ہے تو عصری وخود آگہی اور احتجاج پر ان کی نظموں کا انحصار ہے جن کے مطالعے سے ایسا شاعر ابھرتا ہے جو اردو کی شعری روایت سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے اکابرین کیعلاوہ عالمی ادب کے مفکرین اور اساطیر سے بھی برابر کا رشتہ قائم رکھتا ہے۔

عادل کا مرکزی حوالہ دانشورانہ فکر و احساس ہے۔احساس و باریک بینی کے ساتھ فکرِ مسلسل ان کا تخلیقی مزاج ہے۔عادل نے لفظوں کے انتخاب میں آزادانہ روش اور لفظوں کے استعمال میں چابکدستی سے کام لیا ہے۔عادل کے شعر پڑھتے ہوئے ان کے معاصرین اور متقدمین کے کئی شعر یاد آئے لیکن جو بھی اشعار یاد آئے ان میں اور عادل کے شعروں میں دو چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ایک انھوں نے برتے ہو؟ مضمون کو بھی الگ طریقے سے کہا اور دوسرے یہ کہ اس میں اپنی فکر و نظر کو غالب رکھا ہے یعنی ''کیسے کہنا ہے'' اور ''ذاتی سوچ'' یہ دونوں وہ ش؟ ہیں جو ایک شاعر کا اسلوب بناتے ہیں،جو ایک شاعر کی شناخت بناتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کی سطح پر تازگی اور زبان کی سطح پر تازہ کاری محسوس ہوتی ہے اس کے علاوہ اس ضمن میں ایک اور بات اہم ہے کہ وہ خود پال ویلیری (Paul Valery) کے حوالے اس بات کے قائل ہیں کہ

اے پوئم از نیور فنشڈ ;اونلی ابنڈنڈ

یعنی ایک نظم کبھی ختم نہیں ہوتی بس چھوڑ دی جاتی ہے

اس لیے انھوں نے اپنے معاصرین و متقدمین کے متون سے تخلیقی رشتے اور روایت کو برقرار رکھا ہے۔

پال ویلیری نے اپنے قول میں اپنی بات کو نظم تک محدود رکھا ورنہ ہمارے یہاں یہی بات ''بات'' کے لیے کہی جاتی رہی ہے محترم شین کاف نظام کی نظم *بات مگر باقی رہے* وسیع معنوں میں اسی طرف اشارہ کرتی ہے پال ویلیری نے نظم کے لیے ایک ''بات'' کہی ہے محترم شین کاف نظام نے ''بات'' پر نظم کہی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ عادل کی غزلوں میں لفظوں کے انسلاک اور نظموں کے آہنگ سے محترم شین کاف نظام کی خاموشیاں بھی جھانکتی ہیں۔ملاحظہ(125)

کسی پہ کھلنے لگی ہے ہماری خاموشی کسی صدا کا بھنور ہم پہ بھی کھلا تو ہے

..... اشراق الاسلام ماہر

..... دریائے ظرافت .....

سید آفتاب عالم نے قریباً چار صدیوں کی خاک چھانی ہے۔لائبریریوں میں جانا ہوا ہوگا۔بعض شعراء کے تذکرے ان کے لواحقین سے حاصل کیے گئے۔چار صدیوں کی تحقیق کا سفر قابل داد ہے۔(محمود شام)

میں سید آفتاب عالم صاحب کو ان کی اس کاوش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں،یقیناً آج ان کے والد مرحوم گستاخ گیاوی صاحب کی روح اپنے بیٹے کے اس ادبی کاوش پر خوش ہوگی اور یہ تذکرہ ارباب علم وفن میں پذیرائی حاصل کرے گا۔(سید معراج جامی)

آفتاب عالم نے ہر شاعری کے باب میں ابتدا میں اس شاعر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔پھر یہ بتایا ہے کہ ان کا کلام کہاں کہاں چھپتا رہا اور اگر مجموعے وغیرہ شائع ہو چکے ہیں تو اس کی تفصیل دینے کے بعد نمونہ کلام پیش کیا ہے۔(ڈاکٹر تنظیم الفردوس)

ہر شاعر کے بارے میں تفصیلی معلومات اور انتخاب کلام سے بھی مصنف کی علمی و ادبی بصیرت اور عرق ریزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔تمام مزاح نگاروں کو ایک جگہ جمع کر دینا بھی سید آفتاب عالم کا ایک اہم کارنامہ ہے۔(اختر سعیدی)

اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۔/۶۵۰ روپے، دستیابی:بزم تخلیق ادب پاکستان،کراچی۔

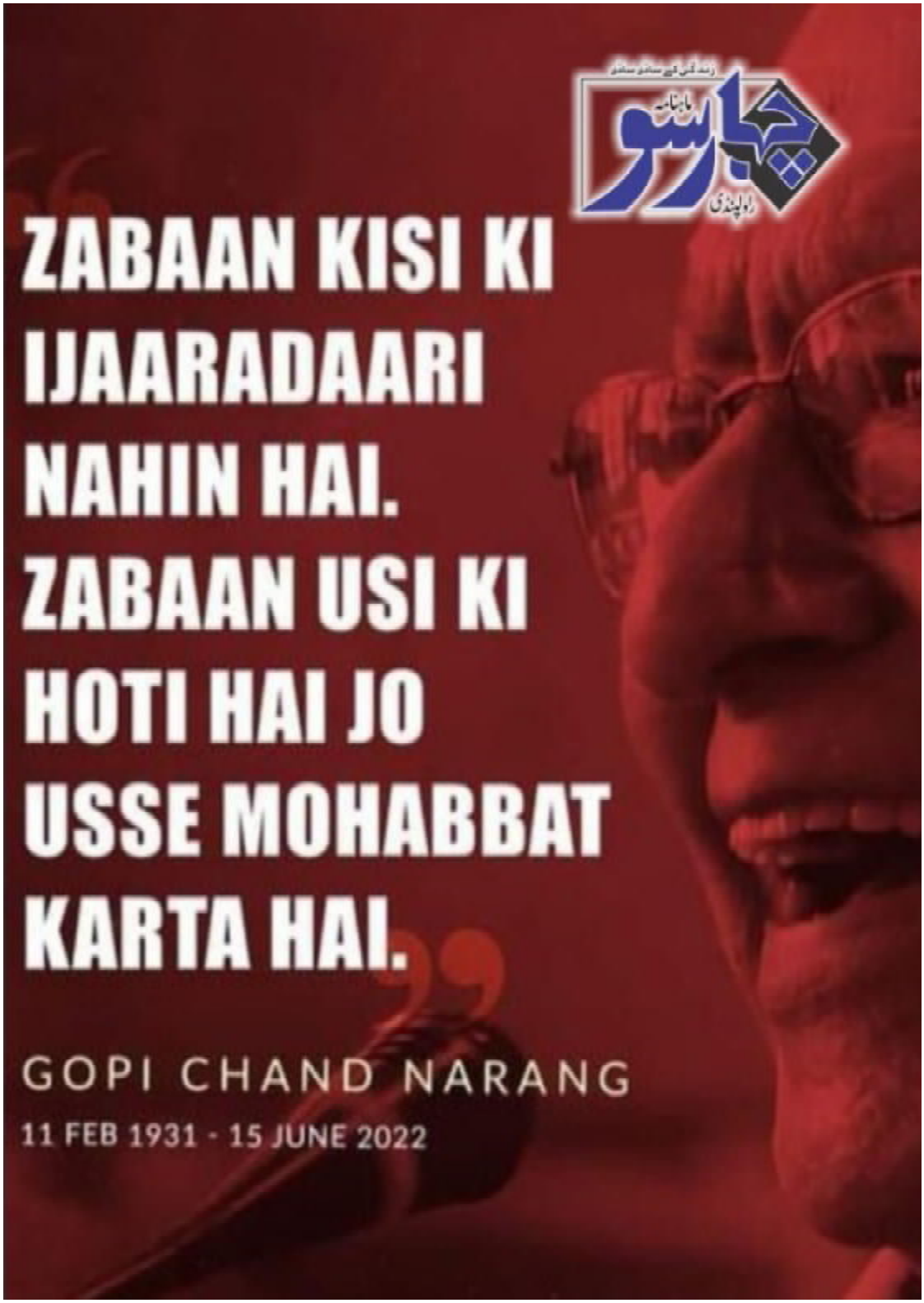
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
ZABAAN KISI KI
IJAARADAARI
NAHIN HAI.
ZABAAN USI KI
HOTI HAI JO
USSE MOHABBAT
KARTA HAI.
GOPI CHAND NARANG
11 FEB 1931 - 15 JUNE 2022